1

انگریز کے خلاف مسلح لڑائی

انتساب

اولاد کو تربیت دینے والی اُس حسین بلوچ روایت کے نام،
جس کے تحت ہر معمر شخص جس بھی نوعمر بچے کو دیکھتا ہے تو اُس سے اُس کا نام پوچھتا ہے، پھر باپ کا نام ،باپ کے باپ کا نام، اُس کے باپ کا نام.....اور، یوں بچے کو اپنا سارا شجرہ زبانی بتانا ہوتا ہے۔

فہرست

پیش لفظ 4

چیپٹر یک: یورپ میں کپٹلزم

1۔رے نے ساں 6
2۔پرتگالی سامراج کی یلغار
3۔یورپ میں رے نے ساں کا تسلسل 16
4۔برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

چیپٹر دو: بلوچ، انگریز سے لڑتا ہے

1-عالمی تجارتی سرمائے کا فروغ
2۔انگریز کے وقت کا بلوچستان
3۔سماجی تقسیم
4۔ انگریز بڑھتا گیا
5۔انگریز، بلوچ مزاحمت کا خالق
6۔بجار خان ڈومبکی
7۔لعل شہید
8۔ساڑتافہ جنگ
9۔نفُسکہ جنگ
10۔کلات کی اجڑتی حکمرانی
11۔تصحیح
12۔خان گڑھ
13۔بلوچ بدن ٹکڑے ٹکڑے
14۔انگریز کے اپنے گھر میں آگ

چیپٹر سہ: خان ھذاداث خان

1- تخت نشینی
2-1857 کی جنگ
3۔اُدھر کمپنی، حکومتِ برطانیہ میں ضم
4-جنگِ میامی
5۔فرسٹ ماوندوار
6- سیکنڈ ماوندوار
7- کلات میں خانہ جنگی
8-غلام حسین بگٹی کی یلغار
9- گولڈسمتھ لائن
10-فارورڈ پالیسی
11-اینگلومری وارز، سیکنڈ راؤنڈ
12۔ھذاداث خان کی چھٹی

13۔جنگِ گوخ پروش
14۔جنگِ نودز
15۔شاہِ بلوچستان

چیپٹر چہار: بلوچ سماج میں تبدیلیاں

1- جرگہ سسٹم
2۔سردار کو مضبوط کیا
3-ایک تضاد پیدا ہوا
4۔ریلوے لائن کا آغاز
5۔نئے شہر قائم کیے
6۔زمین کی سٹیلمنٹ
7۔معدنی دولت کی لوٹ
8۔سڑکیں
9۔کوئٹہ کا جدید شہر
10۔فوج اور ملیشیا بنالی
11۔ٹیکس
12۔مردم شماری
13۔اوزان و پیمائش
14۔کیلنڈر
15۔انگلش زبان
16۔ایڈمنسٹریشن
17۔سب سے بڑی تبدیلی۔۔۔غلامی کا خاتمہ
18۔ادب میں تبدیلیاں

چیپٹر پنج.....:انقلاب روس اور بلوچ

1۔سرحد (نوشکی، زاہدان) اور جہلاوان کا محاذ
2۔مشرقی بلوچستان کا محاذ
3۔پہلی عالمی سامراجی جنگ پہ انگریز سے دوبارہ جھگڑا
4۔سُتکغیں شہر
5۔فاتح انگریز کی مسلط کردہ سزائیں
6۔بلوچ سامراج دشمنی کی وجوہات
7۔باکو کانفرنس

ضمیمہ

پیش لفظ

کب کسی سنجیدہ بلوچ نے یہ دعویٰ کیا کہ بلوچ کبھی کسی کے غلام نہ رہے۔ یا یہ کہ بلوچ قوم کبھی بھی کسی بیرونی طاقت سے تسخیر نہ ہوئی؟۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم دنیا کی دیگر قوموں کی طرح زندہ لوگ رہے ہیں۔ ہم پہ حملے بھی ہوتے رہے ہیں، ہم پہ قبضے بھی ہوتے رہے ہیں، ہم ٹکڑوں میں کبھی ایک سلطنت سے نتھی رہے ہیں، کبھی دوسری سے۔۔۔ اور ایسا بغیر مزاحمت پر نہ ہوا۔

اسی طرح ہم بھی کبھی غربت میں، اور کبھی کبھی مستی میں کسی کی فصل میں اپنے مویشی چھوڑتے رہے ہیں.....اور یہ فخر کی باتیں نہیں ہیں۔

جس بات پہ فخر کرنا چاہیے وہ یہ ہے، کہ زورآوروں سے ہماری زبردستی والی یہ نتھی گیری ہمیشہ بہت ہی کمزور اور بہت ڈھیلی ڈھالی تھی۔ وجہ یہ رہی کہ ہم نے کبھی قابض کو امن سے رہنے نہ دیا۔ فخر کی بات یہ ہے کہ ہم جنون کی حد تک اپنی آزادی سے محبت میں، قبضہ گیروں سے مستقل لڑتے رہے ہیں۔ استقلال و آزادی کا شعلہ بلوچستان میں کبھی بجھا ہی نہیں۔ یہ شعلہ حسبِ ضرورت اِس پہاڑ سے اُس پہاڑ اور اِس موسم سے اُس موسم میں منتقل ہوتا رہا۔ فخر کی ایک اور بات یہ ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب کو سمجھ آ چکا کہ ہم احترام، برادری اور برابری کے ساتھ رہ سکتے ہیں، طاقت کے زور پہ نہیں۔۔۔۔۔

بلوچ تاریخ لکھتے، بیان کرتے اور پڑھتے ہوئے یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اپنے قصہ گوؤں کا خیال رکھا جائے، اُن کی تکریم کی جائے۔ کیونکہ جو لوگ ماضی سے اندھے ہوں، وہ مستقبل میں نابینائی ہی میں داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ حتمی بات ہے کہ بلوچ مطالعہ اور شعور کی دنیا میں نابینا لوگوں کو اپنا مستقبل کبھی نہ دیں گے۔(.....اور سیاسی قیادت میں بھی!!)۔

مگر یہ بھی سخت ضروری ہے کہ ماضی کو کھلی آنکھوں سے، بصیر آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس لیے کہ ماضی پرستی کا کنواں بہت گہرا اور بہت تاریک ہوتا ہے۔ ایک بار جو اُس میں گرا وہ پھر باہر نہ نکلا۔

بات جب انگریز کی ہو رہی ہے تو ہم اکثر بلوچوں کے ہاں اُس کے بارے میں تعریفی تاثرات کو بیان کیا جاتا ہے۔ انگریز کو عقل مند، منصوبہ بند، زیرک، کامیاب عوامی نباض، دوراندیش، اور کبھی کبھی تو ولی اللہ تک مشہور کر دیا گیا ہے۔ مگر یہ پورا سچ نہیں ہے۔ بلوچ کے ہاں تو اُن سب کے بارے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''انہیں یہ تک پتہ نہ تھا کہ گیدڑ، جو شام کو آبادی کے قریب باجماعت آوازیں نکالتے ہیں، یہ اُن کی خصلت و عادت ہے، یا انھیں بھوک لگی ہوئی ہے۔؟.....اور پھر صاحب کے حکم پہ اُن کے لیے جا کر غلہ رکھ دیا گیا تھا''۔

***

جس وقت بلوچوں کا یورپ سے مزاحمت کار کے بطور تعلق بنا تو یورپ کے اندر سائنس و چرچ کی چپقلش میں (سینکڑوں سائنس دانوں کو اذیتیں دے دے کر مار دینے کے بعد) بالآخر چرچ کو شکست ہو چکی تھی۔ اور حتمی طور پر وہاں عقل و خرد، تحقیق و ریسرچ اور سائنس و ٹکنالوجی کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سائنس کی آزادی نے روشن فکری کو تو زبردست ترقی دی، مگر وہاں بہ یک وقت ٹکنالوجی شیطان صفتوں کے ہاتھ لگی۔ یوں یورپ باؤلے سفاک لٹیرے کے بطور ''بحری سواری'' اور ''بندوق و بارود'' کی اپنی برتر ٹکنالوجی کے کندھوں پہ سوار ہمارے ساحلوں پہ لُوٹ اور آتش زنی میں مصروف ہو گیا۔ یہیں ہم نے دیکھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی اگر ایک طرف

پوری انسانیت کے لیے نعمت ہیں، تو دوسری طرف یہ عوام الناس پر استحصالی شکنجوں کو ناقابلِ تسخیر بنانے میں ظالم کے کام بھی آتی ہیں۔

19 ویں صدی میں انگریز سامراج وہ ڈائن تھا جس نے اس جنگی اور استحصالی ٹکنالوجی سے خود کو لادرکھا تھا۔ ایسا باکمال کہ جب چاہا ڈائر کا روپ دھارا، جب چاہا لوڈے جیسا قہار بن کے سامنے آیا اور جب ضرورت پڑی سنڈیمن بن کر بلوچ مجمعے میں آن موجود ہوا۔ ہر سامراج کی طرح اسے بھی حلال حرام اور جائز ناجائز کی تمیز نہ تھی۔ سب لُوٹو، سب انگلینڈ بھیج دو۔ اور کوئی پوچھے کہ مغرب کی صنعتی، تعلیمی اور سائنسی ترقی کیا ہے، تو جواب ہے: مشرق کی آہیں کراہیں اور شکستیں!!۔ یورپی (انگریز) آبادی کا بڑھتا ہوا سارا معیارِ زندگی نوآبادیوں کے محنت کشوں کے استحصال کے کندھوں پہ استوار ہوا۔

چنانچہ لٹیرا، انسانی آبادیوں کے ریوڑوں میں گھس چکا تھا۔ وہ بے دردی سے لوٹتا گیا اور غنیمت کا مال مغرب منتقل کرتا گیا۔ ہمارا مشرق کا سماج اتھل پتھل ہوتا گیا..... بلوچ نے صرف ایک انسانی خصلت برقرار رکھی: سامراجی حملہ آور کی مزاحمت۔ اس کام میں ہم برباد بھی بہت ہوئے مگر تفاخر کا ایک ٹھنڈا جھونکا دائمی طور پر ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں کو مسرت سے بھرتا رہے گا: ''ہم انسان ہیں''۔

بلاشبہ، سامراج دشمنی انسانی وصف ہے۔

ہاں، انگریز کے آنے سے ریلوے آئی، انگلش زبان آئی اور تار، ٹیلی گراف، سڑکیں، ہسپتال، سکول، جدید عدالت اور ڈاک خانہ آیا۔ جدید ریاست کا نمونہ آیا۔ انگریز نے ہماری کلاسیکل شاعری اکٹھی کر کے چھاپ دی۔ اس نے بارہ جلدوں پر مبنی بلوچستان گزٹیئر لکھے اور چھاپے۔ بے شمار مواد دیا جس سے ہم اپنی تاریخ کی گم کڑیاں ملاتے رہے..... ہم صدیوں سے یکساں طور پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم کھاتے تھے، پیتے تھے، بچے پیدا کرتے تھے اور پوتا اسی طرح زمین پر کام کرتا تھا جس طرح دادا کر چکا تھا۔ انقلابات بے شک بہت آئے مگر وہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھے۔ مگر جب انگریزوں نے قدم جمائے اور اپنی مصنوعات کو پھیلایا تو ہمارا ذریعہ معاش بھی ہم

سے چھن گیا اور ہماری پائیدار زندگی ہل کر رہ گئی..... انگریزوں اور مشینوں نے ہمیں (جدید) تمدن کے دائرے میں گھسیٹ لیا۔ ہم اچھے انسانوں کے بطور ان معاملات میں ہمیشہ اُن کے شکر گزار رہیں گے۔۔۔ مگر کس قیمت پہ، یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا مہربان خدا جانتا ہے۔

سامراج سے مزاحمت کبھی بھی لاولد لا نہیں رہتی۔ انگریز کے خلاف ہماری مزاحمت مستقبل کے لیے ایک ایسا سنگِ میل تھی جو ہمیشہ بیرونی حملہ آور کے جبڑے میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت عطا کرتی رہی۔ خواہ غنیم ہمیں ''منہ دھونا سکھانے'' کے بہانے آیا، خواہ ہماری ''آخرت سنوارنے'' کے سرٹیفکیٹ اپنی گردن پہ لٹکائے آیا، یا خواہ ہمیں ''سڑکیں سکول'' عطا فرمانے آیا۔

ماضی بعید سے تسلسل میں چلتی بلوچ کی حالیہ تین صدیوں پر مشتمل مزاحمتی تاریخ اگر ایک طرف خون، لاشوں، آہوں اور تباہیوں، سے لتھڑی ہوئی ہے تو دوسری طرف وطن دوستی، مزاحمت، اور ظالم کے خلاف ڈٹ جانے کی خصوصیات سے مزین ہے۔ بلوچستان اپنی جغرافیائی دولت کے دفاع میں خود بھی برباد ہوا، اور اُس کے بیٹے بھی غاروں کے سماج سے آگے نہ بڑھے۔ مستقبل بھی شاید اُسی تاریک راہوں کا ہو۔ حملہ آور شکل، زبان اور مذہب بدل بدل کر آئیں گے مگر بلوچستان کی سرزمین اور اُس کے باسی یہیں اُن سے لڑتے رہیں گے۔ ہمارے اوپر سامراجی جنگ کا دیوتا پنجے اور جبڑے پھیلائے منڈلاتا ہی رہے گا، مگر حتمی بات ہے کہ وہ زخمی اور نڈھال ہو کر بھاگ جائے گا۔۔۔ اُس کی جگہ سونے کی تلاش میں کوئی اور آئے گا۔۔۔ بہت عرصے تک.....

کون جانے انجام کیا ہو۔ ہماری معدنی اور سمندری دولت اور ہمارا محل وقوع ہم سے کب تک، اور کیا کیا خراج مانگتے رہیں گے۔ لیکن حتمی ہے کہ بلوچ، آباواجداد کی راہ پر ہی چلے گا۔ ہم بہت دیر تک بے آرام، مگر باوقار رہیں گے۔۔۔ اور وکٹری لائن پہ بہرحال ہم ہی پہنچیں گے۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2022

6

چیپٹر یک

یورپ میں کپٹلزم

1- رے نے ساں (Rainissance)

سال 1453 میں انسانی آنکھ نے دیکھا کہ ارتقا اور ہلچل سے جھنجھوڑے گئے۔ رومن ایمپائر کا دارالحکومت قسطنطنیہ، دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ چین کے تجارتی قافلے بخارا اور سمرقند سے ہوتے ہوئے وہیں پڑاؤ ڈالتے تھے۔ اور دوسرے خطوں کے قافلے ہرات' اصفہان اور تبریز سے ہوکر وہیں پہنچتے تھے۔ سندھ و ہند اور ہمارے تجارتی جہاز قسطنطنیہ کے لیے اپنا مال اُرمز اور بصرہ کی بندرگاہوں میں اتارتے تھے۔ بین الاقوامی تجارت کے مرکزِ اتصال قسطنطنیہ کی منڈی پر وینس، جنیوا اور اطالوی شہروں کے بیوپاریوں کا قبضہ تھا۔ یہ تاجر یہاں سے مال اپنے جہازوں میں لاد کر فرانس، سپین، پرتگال، ہالینڈ، بلجیم، برطانیہ اور جرمنی کی بندرگاہوں تک لے جاتے تھے اور مالا مال ہوتے تھے۔

اٹلی کے سوداگروں کی یہی خوش حالی اٹلی میں ''رے نے ساں'' کا سبب بنی۔علم وادب، مصوری، موسیقی، عمارت سازی اور دوسرے فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا اور اٹلی کے تقریباً ہر بڑے شہروں (مثلاً پاڈوآ، روم، وینس، پیسا اور نیپلز) میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ اٹلی، فرانس اور جرمنی میں بالکل ایک نیا ادب ابھرا۔

ترقی کی طرف یہ زبردست انقلاب عالم انسانیت نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ایسا دور جس نے خود اپنی ضرورت کے مطابق دیو قامت لوگ پیدا کیے۔ وہ لوگ جنھوں نے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے سیاسی اقتدار کی بنیاد رکھی۔ یورپ کو سونا چاندی کی ضرورت تھی۔گردش میں موجود سرمایہ دگنا تگنا ہوتا رہا اور زچگی والی پیدائش کی اِس گھڑی میں کپٹلزم کی حرکت کو تیز کرنے کی ضرورت تھی۔ بورژوازی نے شہروں کا کنٹرول سنبھال لیا۔اس نے بنک قائم کیے، مالِ تجارت پیدا کیا اور نئی مارکیٹیں فتح کیں۔نوآبادیاتی معیشت یعنی سونا، چاندی، اور چینی کو خرچ کرنے کے بجائے سپلائی کو یورپی مارکیٹ کی خدمت پہ تعمیر کیا گیا.....اُس زمانے کے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا اہم آدمی گزرا ہو جس نے ملکوں ملکوں کی جادہ پیمائی نہ کی ہو، جسے چار پانچ زبانوں کی مہارت نہ رہی ہو.....،اور جس نے کسی نئی سائنس کی طرف داری نہ کی ہو۔

بعد میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہوا۔تب یہ تجارتی منڈی اٹلی کے بیوپاریوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔لہٰذا اُن کو ایک ایسے متبادل راستے کی تلاش ہوئی جو ترکوں کی دست بُرد سے محفوظ ہو۔ نصف صدی کی مسلسل کوششوں کے بعد کہیں جا کر یہ مقصد پورا ہوگیا۔1492 میں کولمبس نے، جو کہ نکلا تو ہندوستان کو ڈھونڈنے مگر دریافت امریکہ کو کر ڈالا۔سال 1497 میں واسکوڈے گاما ،لزبن سے روانہ ہوا۔اور بحری نقشے بناتا ہوا زنجیبار اور پھر ہندوستان میں کالی کٹ کے مقام پر لنگر انداز ہوا۔اس طرح اُس نے دو منقسم دنیاؤں کو سمیٹ کر باہم منسلک کر دیا اور سمندروں پر پرتگالیوں کی اجارہ داری قائم کی۔1515 میں جاوا اور مالوکاس میں بھی پرتگیزی جہاز جا پہنچے۔ پرتگیزی بحرِ ہند کی مختلف بندرگاہوں پر تجارتی مراکز قائم کر رہے تھے۔اب موزمبیق، گوآ اور

ہندوستان میں مزید دو مختصر علاقے، چین میں مکاؤ اور تیمور کا ایک حصہ، ان کی ملکیت میں تھے۔چنانچہ پرتگالی ہمارے ساحلوں کو اپنی ٹھوکروں میں روندنے لگے۔مغرب کے لیے مشرق کے استحصال کی راہیں، شاہراہیں ہوگئیں۔اور یورپ میں کپٹلزم کی بنیاد تیزی اور مضبوطی سے پڑنے لگی۔اور اس طرح مشینی ایجادات اور سائنسی انکشافات اور جدید علوم وفنون کا تیز رفتار کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

خشکی سے ہمت کر کے بالآخر سمندر میں کود جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ تو بنی نوعِ انسان کے لیے نئے پر مسرت، حیات بخش اور پروگریسو عہد کا آغاز ثابت ہوا۔زندگی کا جمود ٹوٹا۔ پانی میں کود جانے سے انسان نے سائنس کے بے شمار راز دریافت کر لیے۔ پہلے پہل راستے اور سمتیں متعین کرنے کے لیے آسمان کے تاروں سے مدد لی گئی۔اور پھر اس شعبے میں ہزاروں ایجادات ہوئیں۔''کیوں'' اور ''کیسے'' جیسے الفاظ کی تشفی کے لیے قصہ کہانیوں اور اساطیر سے نکل کر فلسفہ کے ممنوعہ علاقوں پہ دھاوے بولے جانے لگے۔معلوم ہوا کہ روایت تو سکوت کا نام ہے، سڑانڈ کا نام ہے۔

سمندر کو آلات کی مدد سے (آلات کے بغیر سمندر میں سفر ناممکن ہے) تیر کر اپنی مرضی سے آنے جانے کے کمال نے دو باتیں ثابت کیں: ایک یہ کہ روایتیں شک کی ثبات بھری بادشاہی میں اچھوت ہوتی ہیں۔دوسری یہ کہ شہزادے اور پیشوا میں کوئی بڑائی بزرگی نہیں ہے، وہ ہر لحاظ سے ہم عام انسانوں جیسے ہیں۔ بلکہ سہل پرستی اور سست الوجودی کی بنا پر دراصل ہم سے بھی ادنیٰ ہیں۔

انسان نے جب سمندر میں چھلانگ لگائی تو بات بہت دور تک چلی گئی۔سائنسی ایجادات تو انسانی اور اشرف کام تھے۔مگر اس کے ساتھ ساتھ بشر دشمن دھندے بھی بڑے پیمانے پر پھیلا دیے گئے۔کارل مارکس نے ''کپٹل'' کی جلد اول کے تیسرے باب میں لکھا، ''امریکہ میں سونا چاندی کی دریافت، معدنی کانوں کے اندر دیسی آبادی کو بیخ سے اکھاڑ پھینکنے، غلام

بنانے، ایسٹ انڈیز کو فتح اور لوٹنے کا آغاز، افریقہ کا سیاہ فاموں کے کمرشل شکار کے لیے ایک شکارگاہ میں بدل جانا، سرمایہ دارانہ پیداوار کے عہد کی گلابی صبح کی علامت تھے۔ یہ دیہاتی جیسی کاروائیاں ابتدائی (فرسودہ) ارتکاز کی اہم یادگاریں ہیں''۔

انھی دو باتوں نے انسان کی تاریخ بدل ڈالی۔ انھی باتوں سے تو سرحدیں ملیا میٹ ہوگئیں، وسعتیں سکڑ گئیں۔

بلاشبہ سونا اور چاندی فتح میں اہم ترین قوت متحرکہ تھے، مگر اپنے دوسرے سمندری سفر میں کولمبس کینڈی آئرلینڈز سے گنے کی اولین جڑیں لے گیا اور آج کی ڈومینکین ریپبلک میں انھیں کاشت کیا۔ وہ فوراً ہی سبز ہوگئے۔ پھر سسلی، میڈیرا، اور کیپ ورڈے جزائر میں چھوٹے پیمانے پر اِس کی کاشت کاری ہوئی۔ شکر، یورپی لوگوں کے لیے اس قدر قیمتی تھی کہ یہ ملکاؤں کے جہیزوں میں قیمتی چیز کے بطور نظر آنے لگی۔ یہ نسخوں کے بطور دوائیوں کی دکانوں میں بکتی تھی۔ امریکہ کی دریافت کے تقریباً تین صدیوں بعد یورپی تجارت کے لیے امریکی براعظم کے شکر سے زیادہ کسی اور زرعی پیداوار کی اہمیت نہ تھی۔ گنے کے کھیت برازیل کے گرم اور مرطوب شمال مشرق میں لگائے گئے، پھر کیریبین، آئرلینڈ، باربی ڈوس، جمائیکا، ہیٹی، سانٹو ڈومنگو، گاڈی لوپ، کیوبا، پورٹو ریکو اور وینزویلا میں اس کی کاشت کی گئی جو کہ اِس ''سفید سونا'' کے لیے زبردست موزوں علاقے تھے۔ غلاموں کی رجمنٹیں افریقہ سے اِس فضول خرچ بادشاہ ''شکر'' کو اپنی خدمات مہیا کرنے آئیں، اُسے بن معاوضہ کی لیبر فورس جو چاہیے تھی۔ اس پیداوار میں بڑھوتری کے لیے انسانی ایندھن چاہیے تھا۔ زمین اس خودغرض پودے کے لیے برباد کی گئی جس نے ''نئی دنیا'' پر حملہ کردیا۔ اس نے قدرتی زرخیزی کو پھونک ڈالا اور جنگلات کو برباد کردیا۔ شکر کے بانس جیسے لمبے پودے نے خوشحالی پیدا کی۔ بہ یک وقت اُس نے بالواسطہ یا بلاواسطہ لیکن فیصلہ کن طور پر ڈچ، فرانسیسی، برطانوی اور امریکی صنعت کے فروغ کو ایڑ لگادی۔(1)۔

یہ بات تو طے ہے کہ کولمبس اور واسکوڈی گاما نے جان پر کھیل کر نئی دنیائیں دریافت کی تھیں۔ اور بحر اٹلانٹک اور بحرِ ہند سے خطرناک سمندروں کو بادبانی جہازوں کے ذریعے عبور کرنا

ہرگس وناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ جہاز رانی کے ایسے آلات اور اوزار ایجاد کیے جائیں جن سے بحری سفر کی دشواریاں کم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں سولہویں صدی کی بیشتر سائنسی ایجادوں کا تعلق علمِ فلکیات سے وابستہ نظر آتا ہے' کہ جہازوں کی صحیح رہنمائی ستاروں ہی کی مدد سے ہوسکتی تھی یا جہازوں میں استعمال ہونے والے آلات کی مدد سے۔

ریڑھ کی ہڈی پہ لہر دوڑتی ہے جب ہم آقاؤں کی طرف سے غلاموں پہ ظلم کی باتیں پڑھتے ہیں۔ سولہویں صدی کی صبحِ صادق سے لے کر انیسویں صدی کی گہری شام تک مزید کئی ملین غلام افریقہ اٹلانٹک عبور کر گئے۔(2)۔ سترھویں صدی میں ڈیوک آف یارک (DY) اپنے اِس نشان کے الفاظ والے لوہے کو آگ میں سُرخ کر دیتا تھا۔ اور ''چینی جزیرہ'' لے جائے گئے سالانہ 3000 سیاہ فاموں کی بائیں چوتڑ یا پستان پر DY کا نشان داغ کر بناتا تھا۔(3)۔ (جیسے آج کل اونٹوں کے بڑے بڑے رموں کے مالک اپنے نام کے محفف سے اونٹوں کا جسم جلا کر اُن پر اپنا شناختی نشان بناتے ہیں)۔

جوں جوں پیسے کی معیشت وسیع ہوتی گئی، اُسی رفتار سے دنیا کی زیادہ سے زیادہ سماجی پرتیں اور علاقے غیر مساوی ایکسچینج میں شامل ہوتی گئیں۔.....ارنسٹ منڈل نے ایک کمال تحقیق کی۔ اِس نے سال 1660 تک لاطینی امریکہ کو چیر پھاڑ کر کے وہاں سے لے جانے والے سونے چاندی کو لکھا، پھر 1650 سے 1780 تک ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے انڈونیشیا سے نچوڑے گئے لوٹ اور ڈاکے کے مال کا ٹوٹل کیا۔ اسی طرح اُس نے فرانس کی طرف سے اٹھارویں صدی کی غلام تجارت سے حاصل کردہ فصل کو لکھا، اور ہندوستان میں نصف صدی تک برطانوی لوٹ سے حاصل کردہ منافعے کو لیا۔ اس سب کو جمع کیا۔

اس نے نتیجہ نکالا کہ اس سارے کا ٹوٹل اُس سارے سرمایہ سے زیادہ ہے جو سال 1800 میں بھاپ سے چلنے والی ساری یورپی صنعت میں لگادیا گیا۔ سرمایہ کے اس

سارے بہت بڑے حجم نے یورپ میں سرمایہ کاری کے لیے ایک موزوں فضا پیدا کی، صنعت کے رجحان کو ابھارا، اور مینوفیکچر کے قیام میں براہِ راست سرمایہ کاری کرائی۔ جس نے پھر جواباً ''صنعتی انقلاب'' کو آگے کی جانب مضبوط دھکا دے دیا۔ مگر دوسری طرف یورپی فائدے کے لیے دولت کے بین الاقوامی ارتکاز نے، لوٹے ہوئے علاقوں میں صنعتی سرمایہ کے ارتکاز کے اندر چھلانگ کو روکا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ افریقہ اور کیریبین کے غلاموں کی قربانیوں سے جیمز واٹ کا بھاپ انجن اور جارج واشنگٹن کا آئین پیدا ہوئے۔

غلاموں، اور خام مال نے برطانوی، فرانسیسی، ڈچ، اور امریکی صنعتی ترقی کے لیے سرمایہ کے ارتکاز کو بہت مضبوط بڑھاوا دیا، جب کہ بہ یک وقت کریبین جزائر کی معیشت کو برباد کیا اور افریقہ کی تاریخی بربادی کو مکمل کیا۔ یورپ، افریقہ اور امریکہ کے بیچ تکونی تجارت (مینوفیکچرز، غلام اور چینی) کا نصاب گنے کے کھیتوں کے لیے غلاموں کی ٹریفک تھا۔ کبھی کوئی قلم والا پیدا ہو تو اُسے معلوم ہوگا کہ پولیٹیکل اکانومی، سیاست اور اخلاقیات میں لاطینی امریکہ کی چینی کے ایک دانے، اور بلوچستان میں کوئلے کی ایک ڈلی کی کہانی ایک پوری کہانی ہے۔ آپ ہمارے کوئلہ کے ایک ٹکڑے کا سفرنامہ تو لکھ کر دیکھیں۔ ہماری ساری بدقسمتی آپ کی سمجھ میں آئے گی۔

پوری دنیا سے جب اتنا مال ایک خطے میں جائے گا تو اُس کا اپنا ڈھانچہ بھی تو کراہنے چیخنے کی آوازیں نکالے گا۔ یورپ کی اِس تبدیلی نے ایسی قیامت برپا کی کہ خود اُس کے اپنے سماج کا پورا تار و پود تبدیلی کے تھپیڑوں کی زد میں آ گیا۔ اُس کے اپنے پیٹ کے اندر ایک زبردست ہلچل مچل رہی تھی۔ اب وہاں عقیدے بدل رہے تھے، رسم و رواج کپاس کے گالے کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور جو کچھ کل بہت مستحکم لگتا تھا آج اُس کی چولیں ہل رہی تھیں۔ اور جو بات لایعنی اور ہوائی لگتی تھی وہ زندہ سائنس کا کلیہ قانون بن رہی تھی۔

اس سارے دور کو نشاطِ ثانیہ، یا 'رے نے ساں (Renaissance) کہتے ہیں۔ تاریخ کا ایسا حسین موڑ جس نے محض یورپ کی سرحدوں ہی کو اپنی دستار نہیں بنایا بلکہ پوری دنیا اس کی کشیدہ کاری کی ہوئی چادر بن گئی۔ ہم سب کے خطے اُس تبدیلی کی لپیٹ میں تھے۔

یورپ کے جدید انسان نے جنم تو پندرہویں صدی میں لیا تھا البتہ اس کا شعور 16 ویں اور 17 ویں صدی میں جوان ہوا۔ اس نئے انسان کا پہلا اور سب سے بڑا تاریخی کارنامہ جوہان گُوٹن برگ نامی ایک جرمن کا بنایا ہوا پریس تھا، جب اُس نے اُس میں 1456 میں متحرک ٹائپوں کی مدد سے پہلی کتاب چھاپی۔ (چین اور تبت میں لکڑی کے چھاپوں سے کتابیں چھاپنے کا رواج صدیوں پیشتر سے تھا مگر کسی کو اس میں اصلاح کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی)۔ تھوڑے ہی عرصے میں یورپ کے ہر بڑے شہر میں پریس قائم ہو گئے اور کتابیں چھپنے لگیں۔ پریس کے رواج پانے سے علم پر سے کلیسا کے بے علم پادری کی صدیوں پہ محیط اجارہ داری ختم ہو گئی۔ چنانچہ، اب روشن خیال فلسفیوں اور سائنس دانوں کو بھی اپنے خیالات اور تجربات لوگوں تک پہنچانے کا موقع ملنے لگا۔ اور ذہنی انقلاب کی راہیں کھل گئیں۔

ڈچ اور شمالی اٹلانٹک کے (یورپی) لوگوں کی اولین آبادکاری وہاں کالونیاں بنانے کی غرض سے نہیں تھی بلکہ تجارت اور کان کنی کے مقصد سے ہوئی تھی۔ اِس میدان میں سپین والوں نے ابتدا کی۔ انھوں نے براعظم امریکہ کی ساری نئی دنیا پر اپنا تسلط جما لیا۔

مگر جلد ہی پرتگیزی اپنے بھتے کے لیے وہاں جا پہنچے۔ روم تو دنیا کی داشتہ تھی۔ اُس کی آخری کارروائیوں میں سے ایک یہ تھی کہ پوپ نے اس نئے براعظم کو ان دو نو واردوں میں تقسیم کر دیا۔ اُس نے برازیل اور کیپ وردے جزیروں کے مغرب کا علاقہ پرتگال کو تفویض کیا، جب کہ باقی سارا علاقہ 1494 میں سپین کے حوالے کر دیا۔

زور آور ویسے ہی تو زور آور نہیں ہوتا۔ بہت ساری قوتیں، مظاہر اور واقعات اُس کی زور آوری کو تقویت بخشنے کے لیے اُس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ مثلاً اُسی زمانے میں روم یونیورسٹی کے سائنس دان کوپرنیکس (1473-1543) نے ایک ایسا انکشاف کیا کہ دُنیا زیروزبر ہو گئی۔ اُس ستاروں کے علم کے سائنس دان نے ''اجرامِ فلکی کی حرکت و گردش'' کے عنوان سے ایک کتاب

لکھی۔اور یہ ثابت کیا کہ انسانی شاونزم کے برعکس، کائنات کا مرکز زمین نہیں ہے۔ بلکہ عالی شان سورج، دنیا کا مرکز ہے۔اور یہ چھوٹی بات نہ تھی۔آج تک دنیا اسے دل سے تسلیم نہیں کر پارہی۔بنیادیں ہلا ڈالنے والا انکشاف تھا یہ۔

کوپرنیکس نے دوسرا دھماکہ اس انکشاف کے ساتھ کیا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ذرا غور تو کریں کہ یہ کیا واہی تباہی پھیرنے والا انکشاف تھا۔روایات، عقائد اور ہزاروں برسوں سے تسلیم شدہ چپٹی زمین کو گول بنا دیا۔

اُس نے ہم عصر انسانوں کے اذہان پہ تیسرا ہتھوڑا یہ مارا کہ زمین خود اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک گردش کرتی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ چرچ کے خوف سے وہ اس کتاب کو اپنی زندگی میں شائع نہ کرسکا تھا۔چھ سو برس گزرنے کے بعد آج تک نہ کوپرنیکس ہمارے خطے کی نام نہاد بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا، نہ وہ نصاب میں پڑھایا جاتا ہے۔دلچسپ دیکھیے کہ مطبوعہ کتاب کا چھپا ہوا نُسخہ کوپرنیکس تک اُس وقت پہنچا جب وہ دَم توڑ رہا تھا۔

عالمی پادری گیری کو چھیڑ ڈالنے والی اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ چرچ کے پورے نظام میں کھلبلی مچ گئی۔کوپرنیکس نے بقول اینگلز'' دبے لفظوں میں اور مرتے دم ہی سہی، تاہم فطرت کے معاملات ومسائل میں چرچ کے اختیار کو چیلنج کیا۔سائنس اُسی دن سے پادری کے بوجھ سے آزاد ہونا شروع ہوئی''۔(4)

پادری اِس بہت بڑی انقلابی دریافت کو ہضم نہ کرسکے۔اور کوپرنیکس کو پادریوں نے کافر قرار دیا۔دلیل کیا تھی؟۔دلیل یہ تھی کہ اِس طرح تو کائنات میں انسان اور زمین کی مرکزیت ختم ہوجائے گی۔واضح رہے کہ اُس وقت تک دوربین ایجاد نہ ہوئی تھی اور کوپرنیکس کے عظیم دماغ نے یہ بڑا انقلابی نظریہ ریاضی کے پیچیدہ حساب کتاب اور صرف آنکھ سے آسمان کے مشاہدے کی بنیاد پر پیش کیا۔

چنانچہ اِس کافر سائنس دان کو کوئی مقبرہ نصیب نہ ہوا۔فرش کھود کر اس کی میت دفنا دی گئی، تاکہ وہ ابد تک گم نام اور بے توقیر رہے۔

مارٹن لُوتھر اور جان کالِون جیسے مسیحی ''مصلحین'' نے کوپرنیکس کی شدّت سے مخالفت کی اور اُس کو احمق، جاہل، اور انجیل کی تعلیمات کا دشمن، کہہ ڈالا۔کالِون نے سروانتے کو اُس وقت زندہ جلوایا جب وہ ''دورانِ خون'' کی دریافت کرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

کوپرنیکس کے نظریات کو پھیلانے پر برونو کو اِسی نیک بخت چرچ نے زندہ جلانے کا حکم دیا (8 فروری 1600)۔برونو نے فیصلہ دینے والے پوپ سے یہ تاریخی فقرہ کہا ''میں یہ فیصلہ سنتے ہوئے اتنا خوفزدہ نہیں ہوں جتنا تم یہ فیصلہ سناتے ہوئے خوفزدہ ہو''۔برونو کی زبان کاٹ دی گئی اور اُسے زندہ جلا دیا گیا۔(ذرا غور کریں سائنس دانوں نے کیا کیا قربانیاں دے کر معمولی معمولی باتیں ہمارے لیے دریافت کی تھیں)۔

اب 5 سو سال برس بعد سال 2010 میں چرچ کو مجبوراً ماننا پڑا کہ کوپرنیکس حق پہ تھا اور چرچ باطل پہ۔اس لیے مرحوم کوپرنیکس سے ایک عدد معافی مانگی گئی۔اُس کی قبر دوبارہ کھودی گئی۔اس کی باقیات کو گارڈ آف آنر نصیب ہوا، اور اُسے پولینڈ کے سب سے بڑے مذہبی اہلکاروں کے ہاتھوں مقدس پانی نصیب ہوا۔ایک ہیرو کی طرح اُس کی تدفین کی گئی۔اُسے پولینڈ کے اُسی کیتھیڈرل میں ایک مقبرہ بنا کر دفنا دیا گیا جہاں پر وہ چرچ کے خدمت گار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔اب اُس کے مقبرے پر لکھا گیا: ''سورج مرکزیت'' کے نظریہ کا بانی۔

کوپرنیکس کے ان نظریات کی سچائی اور افادیت کا اندازہ ممکن ہے کہ زمین پر چلتے پھرتے وقت نہ ہوسکے لیکن آج بھی کوئی ہوائی جہاز یا بحری جہاز اِن نظریوں کی خلاف ورزی کرکے تو دکھائے، فطرت کے قوانین اُس کے وجود کی آنتڑیاں نکال پھینکیں گی۔

دوسرا سائنس دان جس نے کوپرنیکس کے کام کو آگے بڑھایا وہ پیسا (اٹلی) کا رہنے والا گلیلیو (1564-1642) تھا۔گلیلیو نے حرکیات (Dynamics) کے قوانین وضع کیے

۔دوربین کا موجد گلیلیو ہے یا نہیں اِس بحث میں پڑے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عظیم دریافت بھی اُسی کے زمانے میں ہوئی تھی۔

گلیلیو کی ایجادوں پر بھی پادریوں کو بہت غصہ آیا۔اُن کی روزی کو لاتیں لگنے کی رفتار تیز ہونے لگی تھی۔چنانچہ 1616 میں گلیلیو پر بدعت کے جُرم میں چرچ کی مذہبی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔اُس پہ کفر کا فتوی لگا۔طویل قید میں ہی اس کی موت ہوگئی۔گلیلیو نے یہ تو کہا کہ ''میں اس خیال سے باز آتا ہوں کہ سورج کائنات کا مرکز ہے اور ساکت ہے'' مگر پھر دھیرے سے بولا کہ ''مَیں خواہ کچھ بھی کہوں زمین تو سورج کے گرد ہی گھومتی رہے گی''۔

چرچ کی سائنس دشمنی کے باعث اٹلی میں سائنسی تجربات کا سلسلہ رُک گیا۔لیکن مغربی یورپ بالخصوص برطانیہ اور ہالینڈ وغیرہ میں سائنس کی رفتار برابر ترقی کرتی رہی۔جرمن سائنس داں کپلر (1571-1630) نے اجرامِ فلکی کی حرکت کے تین قانون دریافت کیے۔ولیم ہاروے (1578-1657) نے دل کی حرکت اور خون کی گردش کا راز معلوم کیا۔فلسفیوں میں فرانسس بیکن، ڈیکارٹ، اور سپینوزا کے نام سرِفہرست ہیں۔برطانیہ کا بیکن (1561.....1626) علم کو طاقت خیال کرتا تھا۔اور اُس کے نزدیک فلسفہ کا منصب یہ تھا کہ سائنسی دریافتوں اور ایجادوں کے ذریعے انسان کو عناصرِ قدرت پر قابو پانے میں مدد دے۔اسی وجہ سے وہ تجربے پر بڑا زور دیتا تھا۔

بیکن کہتا تھا کہ ہم کو مکڑی نہیں ہونا چاہیے جو اپنے اندر کی چیزوں سے جالے بُنتی ہے۔اور نہ چیونٹی جو صرف چیزیں جمع کرتی ہے بلکہ شہد کی مکھی ہونا چاہیے جو رس جمع بھی کرتی ہے اور پھر اس کو ترتیب دے کر نئی چیز پیدا کرتی ہے''۔(5)

یورپی بورژوازی نے فیوڈلزم کی سیاہی کو ایک جھٹکے سے ختم نہیں کیا۔اُسے چرچ کو قابو کرنے کے لیے صدیاں لگیں۔دوسرے لفظوں میں یورپی بورژوازی تاریخ کے قولنجی دردوں سے اپنی بلوغت کو پہنچی۔کپٹلزم، کسان بغاوتوں، اور طبقاتی جنگوں کی سیڑھیوں ہی سے بام پہ پہنچ سکا ہے۔انڈسٹریلائزیشن نے چرچ کو سیکولر بنانے کے ناممکن ترین بات کو ممکن بنا کر ہی اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔سرمایہ داری نظام دردناک انداز میں پروان چڑھتی ہوئی ایک اربنائزیشن کے بعد ہی بالغ ہوسکا۔بورژوازی ایک ایسا طبقہ تھا جو کسی سامراج وامراج کی کوکھ سے نہیں ابھرا۔بلکہ یہ وہ طبقہ تھا جو اپنی بڑھوتری میں بہت بعد کے ایک مرحلے میں سامراج بنا۔(6)

آیئے رے نیساں کے عہد میں عورتوں کی بات بھی کریں۔عورتوں میں بھی زبردست فکری تبدیلی آرہی تھی۔1660 سے لے کر 1666 تک کے برطانوی انقلاب میں عورتوں نے زبردست انداز میں حصہ لیا۔اسی انقلاب کے نتیجے میں انگلینڈ سے فیوڈل ازم کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ کپٹل ازم نے لے لی۔اس انقلاب نے فیوڈل نظام کے مقابلے میں تو عورتوں کی حالت بہت بہتر کردی۔مگر، ظاہر ہے ان حالتوں کے اندر کوئی بہت بڑی صفتی تبدیلی برپا نہ ہوئی۔جب وہاں مشہورِ زمانہ چارٹسٹ موومنٹ شروع ہوئی تو عورتوں نے اس میں زور شور سے حصہ لیا، حالانکہ اس تحریک نے مطالبات کی اپنی لسٹ میں صرف ووٹ کا مطالبہ شامل کیا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد برطانوی سرمایہ دار کو محنت مزدوری کے لیے عورتوں اور بچوں کی سخت ضروری پڑی۔تب بے شمار عورتیں کارخانوں اور معدنی کانوں میں کام کرنے لگیں۔گوکہ ان جگہوں پر حالاتِ کار بہت خراب تھے، اوقات کار بہت طویل تھے اور معاوضہ بہت قلیل تھا۔

1642 سے 1648 تک انگلش شہری بورژوازی نے، اپنے لیے اتحادی تلاش کر لیے۔اُس کی پہلی نظر تجارت کے اندر موجود ارسٹوکریسی کے زیادہ ترقی پسند حصے پر پڑی۔اُس نے فوری طور اُسے ساتھ ملایا۔پھر اُس نے کسانوں اور شہروں کے Plebeian (عام لوگوں) کی مدد لی۔یوں اس بہت بڑے یونائٹڈ فرنٹ کے ذریعے اُس نے فیوڈلزم کے ساتھ آخری حساب چکانے کا اقدام کیا۔بورژوا انقلاب اور کروم ویل کی ڈکٹیٹرشپ نے کپٹلزم کی آزادانہ ترقی کی راہیں صاف کیں۔اور یوں انگلینڈ کو اس کے مخالفین پر زبردست برتری دلادی۔یورپ بھر میں

محض ہالینڈ کے پاس اس طرح کی ترقی یافتہ بورژوازی تھی۔ مگر ڈچ پیسہ دار نے اپنا پیسہ پیداوار کے بجائے تجارت پر لگانے کو ترجیح دی اور یوں اپنے پڑوسی انگلینڈ سے کمزور ثابت ہوا۔ کروموئیل نے بحری جنگوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو بالآخر ہالینڈ کی آخری شکست پر منتج ہوا۔(7)

اپنے اندرونی دشمن فیوڈلزم کو کامیابی سے شکست دینے کے بعد انگلش بورژوازی حریصانہ طور پر نئی منڈیوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ایسے علاقوں کو فتح کرنے کی طرف روانہ ہوئی جو انہیں قابلِ قدر لگژری اور فوڈ پراڈکٹس دے دیں۔ انگریز امریکہ سے فوڈ، کھالیں اور فَر تما کو، اور چاول درآمد کرتے تھے، ویسٹ انڈیز اُسے چینی فراہم کرتا تھا، افریکہ سے امریکی اور ویسٹ انڈیز کے کھیتوں پر کام کرنے کیلئے کالے غلام آتے تھے۔ انگریزوں نے آئیر لینڈ کو بڑی جاگیروں میں تقسیم کیا، جو کہ انگریز لینڈ لارڈز کو دیے گئے۔ بربادشدہ بے زمین کسانوں کو بھوک سے مرنے کو چھوڑا گیا۔ کروموئیل نے اپنی فوج کا بھی زبردست خیال رکھا۔ اس کے کئی سپاہی آئرش کسانوں کی چوری کردہ زمینوں پر ''Colonists'' کے بطور آباد ہوئے۔ سخت قصبوں کے غریبوں یعنی Levellers اور Diggers کو غلاموں کے بطور ویسٹ انڈیز اور امریکہ بھیج دیا گیا(8)۔

آیئے، مضمون میں سارے تسلسل کو توڑتے ہوئے ذرا سا منہ کا ذائقہ یورپ سے ہندوستان کی طرف موڑ دیں اور دیکھیں کہ یہاں کی اپنی نشاطِ ثانیہ کیا تھی۔

ایک بار داراشکوہ نے ایک مشہور ہندو عابد و زاہد، بابا لال داس سے چاند کے رازوں سے متعلق پوچھا۔ یہ مذہبی عالم، کبیر کے حلقے سے تعلق رکھتا تھا۔ شہزادہ لاہور میں اس ملاقات کو خود اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اُس کا پہلا سوال تھا: ''چاند میں روشنی کیا ہے، کالا داغ کیا ہے اور اس کی سفیدی کیا ہے؟''

دانا شخص نے جواب دیا: ''چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے۔ یہ مکمل طور پر ایک صاف چیز ہے جس پر سورج کی شعاعیں گرتی ہیں۔ اس کی سفیدی اس کے سمندروں کا عکس ہے اور کالا دھبہ براعظموں کا عکس'۔

دارا نے پھر پوچھا: ''اگر یہ عکس ہے تو یہ سورج پر کیوں دکھائی نہیں دیتا؟''۔ اس پر دانا نے جواب دیا: ''سورج آگ کے ایک گولے کی طرح ہے جب کہ چاند پانی کے ایک گلوب کی طرح ہے۔ عکس پانی پر بنتا ہے، آگ پر نہیں'۔(9)

2- پرتگالی سامراج کی یلغار

کیپٹلزم ہو اور حرص نہ ہو، ناممکن۔ سولھویں صدی کے شروع میں حرص ولالچ کے باؤلے پن کا وائرس یورپ کے ایک کے بعد دوسرے ملک کے بوسے لیتا ہوا اپنی بلند ترین سطح کو پہنچا تھا۔ تب دوسرے ممالک پہ قبضہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا برطانیہ، سپین، ہالینڈ، پرتگال اور فرانس سب پاگل کتوں کی طرح' کمزور ممالک پہ چڑھ دوڑ رہے تھے............رے نے ساں والے یورپ نے منڈیوں کی تلاش میں سمندر پار جھپٹے مارنے شروع کر دیے اور یوں یورپ نے براعظم سے باہر موجود ہر انسانی تہذیب کے گلے میں دانت گاڑ دیے۔ نوآبادیوں کی تلاش میں، مالِ غنیمت کی تلاش میں۔ آج تک یورپ کی امارت کا راز یہی ہے کہ وہ ایک زمانے میں سمندری قزاق رہا تھا۔

یورپ میں ہر طاقت ور ملک کے اندر قزاقی کی کمپنیاں بنیں۔ جن کا نام پڑا: ایسٹ انڈیا کمپنی۔ اِن ایسٹ انڈیا کمپنیوں کو اُن کی حکومتوں نے رجسٹرڈ کر لیا۔ اور یہ سمندری قزاقی معزز پیشہ بنی۔ کشتیوں پر قبضہ، بحری جہازوں پر قبضہ، لنگراندازی کے علاقوں پر قبضہ اور پھر ممالک پر قبضہ............ واضح رہے کہ کولمبس وغیرہ کی فتوحات کی مہم میں پیسہ ریاست نے نہیں لگایا تھا بلکہ خود اُن تاجروں نے لگایا جنھوں نے اپنے کاروبار کو بڑھانا تھا، دوسرے لفظوں

میں قزاقوں نے۔ازمنہ وسطیٰ میں کالی مرچ کی ایک چھوٹی تھیلی ایک انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی تھی۔مگر رے نے ساں کی طرف سے سونا اور چاندی تو آسمان پر جنت،اور زمین پر سرمایہ دارانہ تجارت کے دروازے کھولنے کی چابی کے بطور استعمال ہونے لگے۔

اپنے اسی باؤلے پن میں سولہویں صدی کے اوائل میں پرتگال نے بلوچ وطن کا رخ کیا اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں پر''امن،سلامتی،تمدن،جمہوریت اور پرامن بقائے باہمی'' پھیلانے کے لیے حملے کیے۔(پتہ نہیں تاریخ میں ہمیشہ ڈاکو قومیں،اپنی ڈاکہ زنی کو''تہذیب سکھانا'' کیوں کہتی رہیں!!)۔واسکو ڈی گاما نے جب ہمارے منطقے تک کا سمندری راستہ دریافت کیا تو اُس کے چھ سال بعد یعنی 1505 میں پرتگالیوں نے فرانسسکو ڈی المیدا کو (1505-09)اس علاقے کے لیے پہلا وائسرائے اور انفانسو ڈی البقرق کو پہلا گورنر جنرل بنا یا۔(10)

پرتگالیوں نے 1510 میں ہندوستان کے مغربی ساحل''گوا'' پر قبضہ کرلیا،1511 میں ملاکا پر،اور اسی سال یعنی 1511 میں کولمبو پر۔مسقط کے قریب ہرمز پر 1515 میں اُن کا قبضہ ہوگیا۔بحری جہازوں پر توپ خانہ فٹ کیے ہوئے وہ ساری تجارتی شاہرہ پر قابض ہوکر دندناتے پھرتے تھے۔دولت کے واسطے ناترس شدہ لوگ،جنون کی حد تک ہیرو اِسٹ بن گئے،ازمنہ وسطیٰ کی ظالمانہ ذہنی بربریت کے ساتھ۔دلچسپ بات یہ ہے کہ پرتگالی لٹیرے حضرت مریم کے لیے زبردست محبت رکھتے تھے۔مگر حیرت ہے کہ یسوع مسیح کے لیے اُن کی یہ محبت،انھیں یسوع کی بے کراں عالم گیر محبت والی تعلیمات کو برباد کرنے کیسے لے گئی؟۔پرتگالی مسیحی،یورپ کے سب سے پرتشدد یلغار گر رہے ہیں۔عجیب بات ہے کہ تاریخ میں عقیدہ اور حرص کے گراف ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

پرتگالی راہزنوں نے مکران کے بشمول بحر ہند اور مغرب کے درمیان سمندر کی تجارت کے روایتی حصہ داروں کے پورے نیٹ ورک کو متاثر کیا۔مغربی یورپ اب بلا واسطہ اپنی درآمدات کے منابع کی تلاش کرنے لگا۔

اُن دنوں بلوچستان کی جن بندرگاہوں میں سمندر پار تجارتی سرگرمیاں ہوتی تھیں،ان میں ابنِ ماجد''لسنی'' (پسنی) کا ذکر کرتا ہے۔''سیاہ کوہ'' کا ذکر بھی ہے،جس کی طرف اب بھی مقامی لوگ اُس پرانے شہر کے کھنڈرات کو''پرتگالی شہر'' کہہ کر دکھاتے ہیں۔یہ ایک بہت ہی آباد علاقہ تھا اور وہاں کئی گاؤں تھے۔جہاں ہر نسل،رنگ اور مذہب کے تاجر ملتے تھے۔دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے درمیان لین دین ہوتا تھا۔

البقرق نے خلیج میں ایک بحری بیڑا چھوڑا،تاکہ وہ حملے کرتے رہیں اور ہرمز کی تجارت کو منظّم انداز میں گڑبڑ کرتے رہیں۔بہ یک وقت بیڑے کو حکم تھا کہ وہ ایک طرف قشم اور لارک جزیروں کے معاملے میں،اور،دوسری طرف ہرمزی عرب اور ایرانیوں کے قلعے پر پے در پے حملے جاری رکھیں۔ایسا ہی کیا گیا۔

پرتگالی قزاقوں نے سُھر،رُستاق،اور سُوکوترہ کو قبضہ کر کے تباہ کر دیا گیا۔ہمارا پسنی جو کہ خوش حال اور ترقی یافتہ بندرگاہ تھا،اسی جتنے اہم بندرگاہ گوادر،تیز پہ بھی پرتگیزیوں نے یلغار کردی۔(11)۔اور یہ ہنستا کھیلتا شہر اُن کے غضب کے سامنے ہموار ہوگیا۔(12)۔درندوں نے سون میانی،اور ماڑہ،اور چاہ بہار سب کا یہی حشر کیا۔مغرب کے ان مہذب لوگوں نے 1581 میں پسنی اور گوادر کو باقاعدہ جلا ڈالا۔(13)(بڑے آئے امن کے پیامبر!سولائزیشن والے!!)۔

مگر،مکران تو ہمّل کا تھا۔ہمّل ابنِ جیئند کا،ہمّل کلمتی کا،ہمّل کلمتی ہوت کا،سردار ہمّل کا۔ اِن سارے ناموں کا ذکر اِس لیے ضروری ہے کہ تاریخ میں ہمل نامی بہت سے نامور بلوچ گزرے ہیں۔اور خود سامراج دشمن ہمل کا مختلف کتابوں میں مندرجہ بالا اِن ناموں سے میں سے کبھی ایک،اور کبھی دوسرے نام سے ذکر ہوتا رہا ہے۔

ان بیرونی قبضہ گیروں کی راہ میں بلوچوں نے مزاحمت کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔اس مزاحمت اور اس کے ایک ہیرو ہمّل کے بارے میں بلوچی کلاسیکل شاعری میں مواد کا ایک انبار

موجود ہے۔ اس شان دار انسان ہمّل کے قلعے اور کنوئیں ابھی تک ''گزدان بل'' میں موجود ہیں۔ اس نے پسماندہ ٹیکنالوجی اور فرسودہ اسلحہ کے باوجود کھلے سمندر میں جا کر بلوچستان کے دشمنوں کو للکارا۔

اس بہادر، شاعر اور قبیلے کے سردار نے پرتگالی سامراجیوں کو بلوچ ساحل پہ گھسنے نہ دیا، اور بار بار انھیں مار بھگایا۔ مگر سامراجی تو مارچ اپریل کی مکھیاں ہوتے ہیں' جتنا بھگاؤ پھر آ جاتے ہیں۔

پرتگیزی سامراجیوں نے ہمّل کو خریدنے لبھانے کی وہی کوششیں کیں جو بہت بعد میں بھٹو، ضیا اور مشرف نے ساحلی سرداروں سے کامیابی کے ساتھ کیں۔ مگر ہمّل تو ہمّل تھا' ٹرینڈ بنانے والا ہمّل۔ وہ زر اور زن کی لالچ میں ماں وطن کا سودا کہاں کرتا تھا۔

چنانچہ ہمّل پرتگیزیوں سے پے در پے جنگیں کرتا ہے۔ بلوچ عوام کی پرتگیزیوں کے خلاف مزاحمتی جنگوں کی نشانیاں وہ دو توپیں ہیں جو انھوں نے پرتگیزیوں سے چھین لی تھیں۔ ایک توپ گوادر میں اور دوسری پسنی میں رکھی ہوئی ملی۔(14)۔

وحشی سامراج کی ایک ایک یلغار کو شکست میں، شکستوں کو ملال میں، ملال کو تکلیف میں، تکلیف کو ناراضی میں، ناراضی کو غصے میں اور غصے کو وحشت میں ڈھالنے والا ہمّل بالآخر نرغے میں آ جاتا ہے۔

بلوچ نوجوانوں کی قیادت کرتے ہوئے وہ پرتگیزی سامراجی قزاقوں سے جنگ لڑتے ہوئے گرفتار ہو جاتا ہے اور سات سمندر پار تنہائی کی جیل میں صفحۂ زندگانی سے معدوم ہو جاتا ہے۔

ہمّل کے ہزار نام ہو سکتے ہیں۔ یہی اعلیٰ انسانی اقدار نہ رہیں تو خود انسان ہی نہ رہے' بس آلو اور شفتالو ہی رہ جائیں۔ آیئے ایک چھوٹی سے حکایت پڑھتے ہیں اور انسانیت کو زندہ رکھنے کی سبیل کرتے ہیں:

''میرا دوست میدانِ جنگ سے واپس نہیں آیا، سر۔ میں باہر جا کر اُسے لے آنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔

''اجازت نہیں ہے''۔ آفیسر نے کہا، ''میں تمھیں ایک ایسے شخص کے لیے جان خطرے میں ڈالنے نہیں دوں گا جو شاید مر چکا ہے''۔

سپاہی اِس کے باوجود چلا گیا، ایک گھنٹہ بعد مہلک طور پر زخمی حالت میں لوٹ آیا۔ اپنے دوست کی لاش اٹھائے۔

آفیسر طیش میں تھا: ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ مر چکا۔ اب میں تم دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ مجھے بتاؤ ایک لاش کو اندر لانے کی اتنی بڑی قیمت جائز تھی؟''۔

آخری سانس لیتے ہوئے شخص نے جواب دیا''ہاں سر، بالکل۔ جب میں اس تک پہنچا تو وہ ابھی تک زندہ تھا اور اس نے کہا، ''جیک، مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے''............

اور بلوچستان ضرورت کے وقت ایک نہیں، ہزار جیک دیکھتا رہا ہے۔

اور یہ ہزاروں جیک اپنی بہادری اور وطن دوستی کے تمغے کے بطور اُس شاعری کو جنم دیتے ہیں جو ہم آپ آج پانچ سو سال بعد بھی بڑے انہماک اور یک جہتی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔

میر گل خان نصیر نے ''ہمّل وجیئند'' کے نام سے اُس داستان کو منظوم کیا جو کہ پرتگیزیوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے والے بہادر ہمّل کی لڑائیوں اور پھر گرفتار ہونے پہ مشتمل ہے۔ ابھی بھی آپ گوادر میں باتیل پہاڑ پر جائیں تو دیکھیں گے کہ وہاں قدیم زمانے کی زمینداری کے زبردست آثار ہیں۔ وہاں بہت ہی قدیم زمانے کا بنا ہوا ایک تالاب ہے جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ ایک کنواں ہے، زمینیں اور بندات ہیں۔ پتھر کے بڑے بڑے بلاک خوب صورت ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں۔ گوادر کے بلوچ ان آثار کو پرتگیزیوں کے حملے (سے قبل؟) کے دور کا قرار دیتے ہیں۔

ہمارے منطقے میں چنگیز اور ہلاکو کی تہذیب دشمنی کے بعد بربریت اور وحشی پن میں پرتگیزی نوآبادکاروں ہی کا نمبر آتا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ان ناترس لوگوں نے 1518 میں پسنی اور گوادر کے خوبصورت اور امیر شہر جلا ڈالے تھے۔

گوادر کو پرتگالی ''گوادل'' کے نام سے جانتے ہیں اور اس کا ذکر Menuel de Faria Y.souza کی کتاب History of the portuguese doings in the East میں ملتا ہے۔ پڑھیے اور سوچیے کہ باتیل پہاڑ کن کن ویریوں کی آنکھیں پھوڑتا رہا ہے!۔

ذرا آگے آئیں۔ اسی سولہویں صدی کے آخری نصف میں ایران میں دو قابل اور طاقت ور صفوی بادشاہ تخت نشین ہوئے: شاہ طہماسپ (1576) اور شاہ عباس اعظم (1587 تا1629)۔ پرتگالی اور بحری بندرگاہیں ان کے لیے خصوصی توجہ کا باعث بنیں..... پارس کے پاس ایک تربیت یافتہ اور خوب مسلح فوج تو موجود تھی مگر بحری بیڑا نہ تھا۔ انھوں نے انگریز والی ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک معاہدہ کرلیا۔ دسمبر 1621 میں انگریزی بیڑہ پہنچا۔ 1622 میں قشم میں واقع پرتگیزی محل کو فتح کر کے تباہ کر دیا گیا۔ اسی طرح ہرمز کو بھی زمین بوس کر دیا گیا۔

مگر تجارت کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ مکران کی مرکنٹائل خوش حالی بھی ختم نہ ہوئی۔ جس کی زندگی ہمیشہ سے یورپی ایشیائی تاجروں کی تقدیروں کو سنوارتی بگاڑتی رہی۔

3۔ یورپ میں رے نے ساں کا تسلسل

اس پورے عرصے میں یورپ کا سماج سائنس اور ایجادات کرنے کے لیے بپھرا ہی رہا ۔ اِس حد تک کہ رے نے ساں کی زمانی سرحد متعین کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

پاسکل (1623-1626) نے حساب کرنے کی مشین ایجاد کی، اور ہائیڈرالک پریس اور ہائیڈرالک جیک کی بنیاد رکھی۔ رابرٹ بوائل نے (1621-1691) گیس کے دباؤ کا قانون معلوم کیا جو سٹیم انجن اور ڈیزل انجن کی اساس بنا۔ ہوا اور گیس سے چلنے والی تمام مشینیں بوائل ہی کے دریافت کردہ قانون کے مطابق بنتی ہیں۔ اور پھر سترہویں صدی کے سب سے بڑے سائنس دان آئزک نیوٹن (1642-1727) کے کارناموں سے کون واقف نہیں، جس نے کششِ ثقل کا قانون دریافت کیا۔

یہ تو اُن مشہور سائنس دانوں کا ذکر ہے جن کے نام اور کام سے ہر طالب علم واقف ہے ورنہ 16ویں اور 17ویں صدی کی سائنسی دریافتوں اور ایجادوں کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ جہاں تک سائنسی اور میکانکی ایجادوں کا تعلق ہے پہلی خُوردبین 1590 میں، دُوربین 1608 میں، تھرمامیٹر 1613 میں، بیرومیٹر 1643 میں، ہوائی پمپ 1654 میں اور پنڈولم سے چلنے والی دیواری گھڑی 1657 میں وضع ہوئی۔ ان کے علاوہ بحری جہازوں میں کام آنے والے درجنوں آلات اور اوزار بھی اسی زمانے میں ایجاد ہوئے۔ اور انھی بحری جہازوں کی وجہ سے جن علوم نے خاص طور پر فروغ پایا اُن میں فلکیات، میکانکس، فزکس (روشنی، حرارت، آواز، مقناطیسیت اور برقیات)، کیمسٹری، میڈسن، جیالوجی، اور باٹنی قابلِ ذکر ہیں۔

یورپ کے سائنس دانوں نے اپنی دریافتوں اور ایجادوں کو راز میں نہیں رکھا۔ بلکہ ان کے بارے میں کتابیں شائع کیں تا کہ دوسرے اُن سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ انھوں نے آپس میں تبادلۂ خیال کے لیے جگہ جگہ سائنسی کلب بنائے جو آگے چل کر شہرہ آفاق سوسائٹیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس قسم کی پہلی سوسائٹی 1560 کے لگ بھگ نیپلز (اٹلی) میں قائم ہوئی۔ لیکن چرچ نے جلد ہی اس پر جادُوگری کا الزام لگا کر اُسے بند کروایا۔ دوسری سوسائٹی روم میں 1601 میں بنی اور تیس برس تک زندہ رہی۔ اس کے اراکین میں گلیلیو بھی شامل تھا۔ تیسری سوسائٹی 1657 میں فلورنس میں بنی اور دس سال تک کام کرتی رہی۔

برطانیہ میں پہلا سائنسی ادارہ 1644 میں لندن میں قائم ہوا۔ مگر پادریوں کے خوف سے کلب کے بانیوں نے اس کا نام ''فلاسوفیکل کالج'' رکھا۔ کلب کے ارکان کی تعداد پندرہ سے

زیادہ نہ تھی لیکن وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اکٹھا ہو کر سائنسی مسائل پر بحث ومباحثہ کرتے تھے۔ایسا ہی ایک کلب آکسفورڈ میں ''فلاسوفیکل سوسائٹی'' کے نام سے کھُلا۔1660 میں اِنھی کلبوں کی اساس پر ایک شاہی فرمان کے ذریعے برطانوی ''رائل سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔یہ سوسائٹی اب تک قائم ہے۔

واضح رہے کہ انگلینڈ میں سرَف ڈم 14ویں صدی کے اواخر میں ختم کیا گیا تھا۔یعنی دوسرے یورپی ملکوں سے بہت پہلے (15)۔

اسی اثنا میں فرانس میں بے شمار سائنسی سوسائیٹیاں وجود میں آئیں اور پھر 1666 میں پیرس اکیڈمی قائم ہوئی۔

برلن اکیڈمی 1700 میں بنی اور سینٹ پیٹرس برگ اکیڈمی 1724 میں۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں اہلِ یورپ نے سائنسی دریافتوں اور ایجادوں کے ذریعہ اپنی فکری اور مادی توانائی میں بہت اضافہ کرلیا تھا۔اُن کی تجارتی سرگرمیاں برابر بڑھتی جارہی تھیں۔ان کی صنعتوں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہورہی تھی۔ان کے شوقِ جستجو اور ذوقِ سفر کے آگے سمندر کی موجیں اور دشت وصحرا کی صعوبتیں کوئی حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ایشیا کی بے پناہ دولت پر للچائی نظریں اُن کے لعاب کو خشک ہونے نہ دیتی تھیں۔اپنے علم و ہنر کی برتری کے باعث اُن میں مشکل سے مشکل مہم کو سر کرنے کا حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔

4۔برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

نوجوان ہمیشہ اِس حیرت میں رہتے ہیں کہ ہمارے خطے میں پرتگالی، فرنچ ڈچ اور سپینش بالادستی کے وقت انگریز کا ذکر کہیں ملتا ہی نہیں۔مگر پھر ایسا کیا ہوا کہ فرانس سمیت باقی ساری یورپی بحری طاقتیں پس منظر میں چلی گئیں اور اچانک انگریز سامنے آئے؟۔اور امریکہ، مشرق وسطیٰ، بلوچستان اور ہندوستان میں دو تین صدیوں تک اپنی معاشی سیاسی سامراجیت مسلط رکھی؟۔

ہوا یوں کہ سمندروں پہ پہلی بالادستی تو پرتگالیوں اور سپین والوں کی تھی۔اُن کی ان تیز رفتار فتوحات میں، بعدازاں ڈچ اور فرنچ بھی شامل ہوگئے۔انگریز تو سب سے بعد میں باہر نکلا۔ اس کا مطمع نظر صرف اور صرف تجارت تھا، ملک گیری تو اُسے بائی پراڈکٹ کے بطور ملی۔اس کے شاہی اجازت نامے (Charter) میں صرف تجارت کی اجازت درج تھی۔انگریز کے پاس دوسری یورپی قوتوں کی طرح کوئی بہت بڑی فوجی قوت نہیں تھی۔وہ یورپ کی پسماندہ اور مفلس قوم تھی اور صرف تجارت پر اکتفا کررہی تھی۔

لیکن ایک واضح فرق ضرور تھا۔یورپ کی اِن بڑی اور بظاہر اعلیٰ فوجی قوتوں کی حامل سلطنتوں کے پاس کوئی مربوط سیاسی نظام نہیں تھا بلکہ وہاں بادشاہتیں تھیں جس کے نتیجے میں

اقتدار کی چھینا جھپٹی اور طوائف الملو کی کا دور دورہ تھا۔ اِس کے برعکس برطانیہ میں ایک مربوط سیاسی نظام کی بنیاد پڑ چکی تھی جس نے اس قوم کو نظم وضبط اور سیاسی استحکام بخشا۔ اور وہاں قانون کی بالادستی اور حکمرانی قائم ہوتی گئی۔ یہی وہ عظیم قوت ثابت ہوئی جس نے انگریز قوم کو متحرک کر کے اس کی پوشیدہ قوت کو مہمیز دی اور پوری دنیا کو انگریز کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

1201 میں جان نامی شخص انگلینڈ کا سازشی اور طالع آزما بادشاہ تھا۔ وہ چرچ کی بالادستی سے نجات پانا چاہتا تھا۔ واضح رہے کہ اُس دور میں تمام مسیحی ممالک میں چرچ کو بالادستی حاصل تھی۔ بادشاہوں کو تاج پوپ کی مرضی ومنشا سے پہنائے جاتے تھے۔ یہ بات جان کو پسند نہیں تھی۔ اُس نے چرچ سے بغاوت کی جس کے سبب چرچ نے اُسے مسیحیت کا باغی قرار دے کر مسیحیت ہی سے خارج کر دیا اور طاقت ور نوابوں اور فیوڈل لارڈز کو بادشاہ کے خلاف بھڑکا دیا۔ اور وہ بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جان نے تمام نوابوں اور جاگیرداروں کو دعوت دے کر یکجا کیا اور بڑی حیل وحجت کے بعد یہ طے پایا کہ بادشاہ، نوابوں اور جاگیرداروں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا اور وہ بادشاہ سے جھگڑا نہیں کریں گے اور بوقتِ ضرورت دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ اس معاہدے کی ایک دستاویز مرتب کی گئی جس کا نام ''میگنا کارٹا'' (عظیم چارٹر) رکھا گیا۔ اس دستاویز کی روح اور سب سے حسین شق وہ تھی جس میں ''بادشاہ کے آفاقی حق'' کے باطل نظریے کو مٹا دیا گیا۔ یہی شق، درحقیقت وقت کی اُس کروٹ کی روح بن گئی۔ اُس دور میں بادشاہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون ہوا کرتے تھے، بس۔ لیکن اب میگنا کارٹا میں بادشاہ کے تقدس کے درجے کے چھن جانے کے بعد اس کی حیثیت عام آدمی کے برابر ہوگئی تھی اور اب ملک چرچ کی دست برد سے بھی آزاد ہو گیا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ قانون سازی کے لیے ہر بڑی ریاست سے دو اور چھوٹی ریاست سے ایک نمائندہ اس دستاویز پر عمل درآمد اور قانون سازی کے لیے مقرر کیا جائے گا۔ اس ادارے کا نام ''پارلیمنٹ'' رکھا گیا۔ وہاں اولین منتخب پارلیمنٹ 1265 میں قائم ہوئی۔ پارلیمنٹ کو قانون سازی کی ذمے داری سونپی گئی اور بادشاہ کے لیے لازم قرار پایا کہ پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کی توثیق کرے۔ یہی دستاویز انگریزی قانون اور اس جدید جمہوری سیاسی نظام کی بنیاد بھی بنی جس پر انگریز قوم آج بھی فخر کرتی ہے۔

صدیوں کی کھینچا تانی کے بعد بالآخر پارلیمنٹ کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے بادشاہ کے ہاتھ پیر باندھ کر اُسے تخت پر بٹھایا اور اس کے سر پر برائے نام تاج رکھ دیا۔ اب بادشاہ سر پر تاج رکھ کر رعب سے چل پھر تو سکتا تھا لیکن اُسے کھا نہیں سکتا تھا۔ روٹی کے لیے اُسے پارلیمنٹ کا محتاج ہونا پڑا۔ اب بادشاہت صرف نمائشی اور شاہِ شطرنج کی طرح باقی رہ گئی۔ پارلیمنٹ پر اب وڈیروں جاگیرداروں کا قبضہ نہیں تھا، بلکہ اِس میں متوسط طبقے، تاجروں اور ہنرمند عوام کو بھی نمائندگی حاصل تھی۔ قانون سازی کا اختیار اب صرف پارلیمنٹ کو حاصل تھا۔ شخصیت پرستی کا سحر ٹوٹ چکا تھا اور بادشاہ کے فرسودہ تقدس کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت صرف روایت تک محدود تھی۔ (یہ تو بہت بعد میں ہوا کہ اِسی پارلیمنٹ نے انسان کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دیں۔ کیپٹلزم کی مضبوط زنجیریں۔ آج ظلم واستبداد اور معاشی استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ یہی پارلیمنٹ ہے)۔

بہرحال، انگلینڈ وہ پہلا ملک تھا جس نے پادری کی اجارہ داری کو توڑا، اور سب سے پہلے غیرملکی اور غیرمانوس لاطینی زبان کا جوا سر سے اتار پھینکا۔ واضح رہے کہ جس طرح بلوچستان میں غیرمانوس فارسی، سرکاری زبان تھی اور عوام اپنی مادری قومی زبان بولتے تھے، اسی طرح انگلینڈ میں دربار کی زبان لاطینی تھی اور عوام میں انگریزی رائج تھی۔ اب انگریز نے بدیسی لاطینی کی جگہ اپنی انگریزی کو قومی زبان قرار دیا جس کے نتیجے میں علم، آگہی اور فکر ودانش کے سوتے پھوٹنے لگے اور آکسفورڈ اور کیمبرج جیسے علم ودانش کے عظیم الشان ادارے وجود میں آئے۔ اس طرح معاشرے میں فرد کو اپنی تمام تر فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع میسر آیا اور جمود وجہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے معاشرے نے دنیا کو اپنی ٹھوکروں میں روند ڈالا۔

زرعی وسائل بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ناکافی تھے جس سے تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور تاجروں کو معاشرے میں شرف وعزت کا مقام حاصل ہونے لگا۔ اس سے علم و ہنر فروغ پذیر ہوا۔ گھریلو صنعتیں پھل پھول کر تجارتی صنعتوں میں تبدیل ہونے لگیں جس کے نتیجے میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ اس انقلاب نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس وقت دوسری یورپی قومیں سمندر پار دنیا فتح کر رہی تھیں لیکن انگریز کی توجہ ابتدا میں صرف تجارت پر ہی مرکوز رہی جو سمندر پار تجارت سے خاصے فوائد پا رہی تھی۔

روس جسے Duchy of Moscovy کہا جاتا تھا، وہاں انگریز کی مصنوعات کی خاصی بڑی منڈی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی ایک تاجر کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی بڑی منڈی میں تنہا داخل ہوتا کیونکہ اس کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت تھی۔ لہٰذا چند بڑے تاجروں نے مل کر اجتماعی تجارت (Corporate Business) کی بنیاد ڈالی جو بہت سودمند ثابت ہوئی۔ اس طرح یہاں دنیا کا سب سے پہلا مشترکہ وسائل کا ادارہ (جوائنٹ سٹاک کمپنی) قائم ہوا اور اسے پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے آئینی تحفظ فراہم کر کے چارٹرڈ کمپنی کا نام دیا گیا۔ 1552 میں یہ ''ماسکووی کمپنی'' اس وقت قائم ہوئی جب ہندوستان میں مغل شہنشاہ ہمایوں افیون کے نشہ میں دُھت عیش کر رہا تھا۔ جلد ہی ایک اور تجارتی کمپنی ''لیونٹ کمپنی'' کے نام سے قائم ہوئی جسے لبنان، مشرق وسطیٰ اور ترکی کے زیر اثر علاقوں میں تجارت کا چارٹر دیا گیا۔

سود (جو کہ مسیحیت کے مذہب میں حرام ہے) کو مشہور مسیحی اصلاح پسند کالوِن نے 1564 میں جائز قرار دلوایا۔(16)۔ (سرمایہ داری نظام کا اجتہاد!!۔ سرمایہ داری نہ چرچ کو جانتی ہے نہ مندر مسجد اور گردوارے کو)۔

سولہویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے اوائل نے تجارت کی ایک نئی ''لائن'' میں ایک زبردست منافع ہوا..... یہ کالے غلاموں کی تجارت تھی جو افریقہ اور ویسٹ انڈیز کے درمیان ہوتی تھی۔ پورے نیگرو قبائل اغواء کیے جاتے تھے اور امریکہ اور ویسٹ انڈیز میں گنے اور کپاس کی زراعت میں کام کرنے کے لیے فروخت کیے جاتے تھے۔ ایک سو سے زیادہ سالوں تک انگلینڈ غلاموں کی تجارت پر اجارہ کے لیے اپنے ہم پیشہ مدِ مقابلوں سے لڑتا رہا۔ اس پورے عرصے کے دوران سپین اور ہالینڈ کے ساتھ جنگ نما جھگڑے کبھی ختم نہ ہوئے۔ سپین پر کامیاب فوجی اور بحری حملوں کے نتیجے میں، انگلینڈ 1713 میں سپینی نوآبادیات کے ساتھ غلاموں کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ انگلینڈ کے برسٹل اور لورپول جیسے عظیم اور امیر شہروں کی خوشحالی کی بنیاد اس غلام تجارت کے بہت بڑے منافعوں پر رکھی گئی۔ غلام تجارت حتیٰ کہ انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک جاری رہی، یعنی انگلینڈ میں صنعتی کیپٹلزم کی ترقی کے ساتھ، غلام تجارت کم منافع بخش ہوئی اور افریقہ سے غلاموں کی برآمد کم منافع بخش ہوگئی۔(17)۔

دو صدیوں تک یعنی سولہویں کے اواخر سے انیسویں صدی تک انگلش بورژوازی نے افریقی قبائل کی بے مثال مصیبتوں کی قیمت پر بے تحاشا دولت جمع کر لی(18)۔

لیکن، انگلستان کے تاجروں کے سرمایہ میں اُس وقت بہت اضافہ ہوا جب انھوں نے اون کی تجارت پہ اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ کیونکہ اون کی صنعت، تجارتی کمپنیاں قائم کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کی واحد صنعت تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں سال 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔

اُس وقت دستور یہ تھا کہ تجارتی کمپنیوں کو حکومت کی طرف سے اختیار دیا جاتا تھا جس کے تحت وہ خاص خاص ملکوں میں تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتی تھیں۔ اُن ملکوں میں دوسری کمپنیوں کو تجارت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس اختیار کے ذریعے انہیں یہ بھی آزادی تھی کہ وہ اُس علاقے میں نظم ونسق قائم کریں، قوانین بنائیں اور فوجی طاقت کو استعمال کریں۔ ہندوستان میں یہ اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا ہوگیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے سے عام آدمی کو نکال باہر کر دیا..... یہ گویا بورژوازی کی فیوڈل اشرافیہ پر فیصلہ کن فتح تھی۔

برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام مرکنٹائل کیپٹل ازم کے نظام کے اندر عمل میں آیا۔ اُس

زمانے میں برطانیہ کے علاوہ پرتگالی، ڈچ اور فرانسیسی قومی کمپنیاں مشہور تھیں۔ اور دنیا میں تجارتی منڈیوں کے حصول کے لیے ان یورپی ملکوں کی قومی کمپنیوں کے مابین زبردست جھگڑے شروع ہوئے۔ وہ سمندروں کے اندر ایک دوسرے کے جہاز لوٹنے لگے اور ایک دوسرے کا قتلِ عام کرنے لگے۔ چنانچہ تجارت اور قزاقی میں بہت کم فرق رہ گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں مرکنٹائل کیپٹل ازم کی بنیاد جغرافیائی راستوں کی تلاش، تجارت کی اجارہ داری، غلاموں کی خرید و فروخت اور سمندری قزاقی پر تھی۔

یہ یورپی تجارتی کمپنیاں ساحلی علاقوں میں اپنی تجارتی ''کوٹھیاں'' قائم کرتی تھیں جنھیں ''فیکٹری'' کہا جاتا تھا۔ متعلقہ ملک کے اندر سے جو مال خرید کر لایا جاتا تھا، وہ یہاں سٹور کیا جاتا اور جہازوں کی آمد پہ اُسے یورپ بھیجا جاتا۔ اگر اس علاقے کا گورنر یا حاکم ان کے خلاف کارروائی کرتا تو وہ بھاگ کر ساحل پر کھڑے اپنے بحری جہازوں پہ پناہ لیتے۔ جہاں سمندر میں اُنھی کی اجارہ داری تھی۔ جب حالات ٹھیک ہوتے تو وہ پھر سمندری جہازوں سے اتر کر اپنی فیکٹری میں واپس آ جاتے۔ یہی تجارتی کوٹھی پھر رفتہ رفتہ مال کے گودام کے ساتھ ساتھ فوجی قلعہ میں بدلتی گئی۔

جس وقت برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی اِس منطقے میں آئی تو اُس وقت یہاں پرتگال اور ہالینڈ کے سوداگر پہلے سے موجود تھے۔ بالخصوص پرتگالیوں نے تو ہندوستانی ساحلی علاقوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ پرتگالیوں نے پہلے 1502 میں کلکتہ اور بمبئی میں اپنی Settelements قائم کیں، اور پھر 1515 میں گوا پر قبضہ کر لیا تھا۔

1612ء سے لے کر 1615ء تک ہندوستان کے اوپر برطانیہ اور پرتگال کے درمیان تجارت کی اجارہ داری پر جھگڑے ہوئے۔ اسی عرصے میں 1613ء میں سر رابرٹ شیرلے جو سفیر کی حیثیت سے اصفہان جاتے ہوئے گوادر ٹھہرا تو بلوچوں نے اُس کے جہاز پر اچانک حملہ کر دیا۔ مگر وہ مرنے سے بال بال بچ گیا۔ یہیں اُس نے گوادر کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو لکھا کہ وہ گوادر میں ایک فیکٹری قائم کرے، اس لیے کہ یہ علاقہ خود مختار ہے، پرتگیزیوں سے محفوظ ہے اور ''دنیا میں ایک امیر ترین ٹریفک'' کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (جی ہاں، گوادر 1613 میں بھی اہم تھا)۔

سفارتی اور تجارتی قافلہ روانہ کرنے سے قبل انگریز کو ہندوستان کے بارے میں تمام تر ضروری معلومات حاصل تھیں جن سے اکثر ہندوستانی تک بے خبر تھے۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں وہاں کی زبانوں، پیداوار، ضروریات اور درآمدات و برآمدات کا کو اچھی طرح علم تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ مغل شاہی خاندان کے افراد آپس میں ترکی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس قافلے کی قیادت ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تجربہ کار ماہر سفارت کار کو دی گئی جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا اور وہ خاص طور پر ترکی زبان پر بھی عبور رکھتا تھا اور کئی تجارتی و سفارتی قافلوں کی قیادت کر چکا تھا۔ اس کا نام سر تھامس رو تھا۔

جہانگیر کے بیٹے شاہجہان کا بظاہر لاعلاج مرض میں مبتلا ہونا، شاہی طبیبوں کی ناکامی، اور بالآخر تھامس رو کے ہاتھوں شفا پانا دراصل وہ حادثات تھے کہ جہانگیر نے خوش ہو کر اُسے سونے میں تول دینے کا حکم دیا (جہانگیر بھی ہمارا احمد یار خان نکلا)۔ اچانک اس قدر دولت کا مل جانا ڈاکٹر کی سات پشتوں کے لیے بھی کافی تھا۔ وہ خوشی خوشی سونا لے کر اپنے وطن لوٹ سکتا تھا۔ لیکن دور اندیش انگریز کی نگاہ میں ذاتی دولت اور سونے سے کہیں زیادہ وقعت اُس مقصد کی تھی جس کے لیے وہ ہزار ہا میل کے صعوبت ناک سفر کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ سونے سے زیادہ عزیز اُسے اپنے ملک و ملت کے سرمایہ داروں کے لیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی جس کا نام ہندوستان تھا۔ ذاتی غرض کو اس نے اپنے سامراجی بڑے مفاد پر قربان کر دیا۔ اس نے سونے کے بجائے دونوں ملکوں کے مابین تجارت کی اجازت مانگی، جو خوشی خوشی قبول کر لی گئی۔

انگریز ہندوستان کی منڈیوں سے تجارتی اشیا خریدتا اور وہاں اپنی اشیا فروخت کرتا۔ ہندوستان سے خاص طور پر ململ، سوتی کپڑے اور کپڑے رنگنے کے رنگ (Indigo) کی یورپ

میں بہت مانگ تھی۔سوتی کپڑا عوام میں اور ململ امرا میں بہت مقبول تھا۔اس کے لیے انگریز کے پاس کوئی قابلِ ذکر اشیا نہ تھیں۔بس، طوائفوں کے اڈے پر پڑے بدمست امرا کی عیاشی کو دو آتشہ کرنے کے لیے انگریزی شراب تھی۔

ابتدا میں انگریز کی مصروفیات تجارت تک ہی محدود تھیں جبکہ سپین اور پرتگالی استعمار گر تجارت سے زیادہ لوٹ مار اور ہوسِ ملک گیری میں مشغول تھے۔ان بحری قزاقوں کے ہاتھوں انگلینڈ کے تجارتی قافلے جب بار بار لٹنے لگے تو اُس نے بھی اپنی بحری قوت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔برطانیہ علم و ہنر میں نہایت تیزی سے ترقی کر کے دنیا کی تمام قوموں سے کہیں آگے نکل چکا تھا۔وہ بیرونی تجارت اور نت نئی جدتوں و ایجادات سے خوش حالی بھی پا رہا تھا۔لہٰذا اُس نے بہت جلد اپنی بحری قوت میں اضافہ کر دیا۔اور جلد ہی تمام دوسری یورپی قوتوں کو شکستیں دے دے کر سمندروں پر اپنی حکمرانی قائم کر لی۔

ارفع سیاسی نظام، علم کی قوت، اور عالمی تجارت سے حاصل کردہ خوش حالی نے انگریز قوم کو حیرت انگیز طور پر متحرک کیا جس کے نتیجے میں وہاں صنعتی انقلاب برپا ہو گیا۔اور ساتھ ہی سب سے بڑی عسکری قوت بن جانے سے ہوسِ ملک گیری کو مہمیز ملی۔چنانچہ وہ دنیا کو فتح کرنے لگا۔یورپ کی ہر قوت کو اِس نے پاش پاش کر دیا۔پرتگال و اسپین کی عظیم بحری قوتوں کو بار بار شکستیں دیں۔ڈچ اور فرنچ بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکے۔اس نے شمالی و جنوبی امریکہ کے دونوں براعظموں کو روند ڈالا۔افریقہ کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں تھی، ایشیا کی عظیم تہذیبیں بھی اس کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔

برطانوی سوداگر ہاکنز اگست 1608 میں سورت کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔جہانگیر پرتگالیوں کی اجازت کے بغیر انگلستان کو سفارتی اور تجارتی مراعات دینے سے ہچکچا رہا تھا۔ہاکنز نے جہانگیر کو یقین دلایا کہ اس کا ملک سمندروں میں پرتگالیوں کی اجارہ داری اور قزاقی کے خلاف مدافعت کر سکتا ہے۔غیر یقینی کے باوجود جہانگیر نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ہاکنز کو

مراعات تو نہیں دیں لیکن اسے اپنے دربار سے منسلک کر لیا۔اس نے ہاکنز کو چار سو سپاہیوں کی سالاری دی اور تیس ہزار کا وظیفہ مقرر کیا اور ایک آرمینیائی مسیحی سردار کی بیٹی اُسے دے دی۔

گوا میں پرتگالی وائسرائے مینڈوسا کو جب معلوم ہوا کہ انگریزوں کا ایک وفد جہانگیر کے دربار میں پہنچ چکا ہے اور اس نے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے بعد کچھ مراعات بھی حاصل کر لی ہیں اور اُسے اور اس کے انگریز ساتھیوں کو اعزازات سے نوازا بھی گیا ہے تو اُس نے مشتعل ہو کر جہانگیر کے اس عمل کو پرتگال کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا۔

پرتگالیوں نے ہندوستانی تاجروں کے جہازوں کو پھر سے لوٹنا اور غرق کرنا شروع کر دیا۔ساحلوں کے قریب جہاں کہیں بھی تجارتی قافلے نظر آتے، لوٹ لیے جاتے۔بیرونی تجارت کے راستے بند کر دیے گئے۔لیکن مغل بادشاہ اُن کا بال بھی بیکا نہ کر سکتا تھا۔سمندروں میں ان سے ٹکرانا ممکن نہیں تھا کیونکہ مغلوں کے پاس جنگی بحری بیڑا برائے نام بھی نہیں تھا۔ساحلوں پر بھی وہ مقابلہ کرنے کی حیثیت میں نہیں تھے کیونکہ قلعہ بند پرتگالیوں کی آگ برساتی بھاری توپیں قریب پھٹکنے ہی نہ دیتی تھیں۔

پرتگالیوں نے مغل شاہی تجارتی بیڑے کے چار جہازوں کو بھی لوٹ لیا اور ملاحوں کو قیدی بنا لیا تھا۔جن میں سے ایک جہاز میں تیس لاکھ کا شاہی خزانہ تھا اور جہازوں کے مال میں جہانگیر کی ماں کا بھی خاصا سرمایہ لگا ہوا تھا۔مملکت کے اکثر امرا کا بھی تجارت میں سرمایہ لگا ہوتا تھا۔غرض کہ سب ہی پرتگالیوں کی دست برد سے نالاں تھے۔جہانگیر نے مجبور ہو کر پرتگالیوں سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ساحلوں پر مضبوط پرتگالی قلعوں اور شعلہ بار توپوں پر یلغار کرنے کی اُسے ہمت نہیں ہوئی، لیکن ملک میں جتنے پرتگالی تھے، انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ساتھ ہی دوسرے عیسائیوں کو بھی گرفتار کیا گیا اور عیسائی مذہب پر پابندی عائد کر دی گئی۔اب اندرونِ ملک جہانگیر کی حکومت تھی تو ساحلوں اور سمندروں پر پرتگالیوں کی، جس کے سبب کئی برسوں تک بیرونی تجارت بند رہی۔کوئی ہندوستانی یا عرب جہاز سمندر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

جہانگیر نے عاجز و مجبور ہوکر پرتگالیوں سے مذاکرات کیے۔ پرتگالیوں کی پہلی شرط یہ تھی کہ انگریزوں سے تمام مراعات واپس لے لی جائیں اور انھیں دربار سے نکال دیا جائے۔ مزید یہ کہ سمندر پار سے آنے والی کسی بھی دوسری قوم کو پرتگالی وائسرائے کی اجازت کے بغیر کسی بھی قسم کی مراعات نہ دی جائیں اور ہندوستانی تجارتی جہاز تاوان ادا کرتے رہیں۔ غرض کہ عملاً پورا ہندوستان چند حقیر پرتگالی قزاقوں کا یرغمالی ملک بن چکا تھا اور مغل شہنشاہ ان سے خوف زدہ رہتا تھا۔

جہانگیر نے مجبوراً تائب ہوکر پرتگالیوں کی تمام شرائط قبول کرلیں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ انگریز سے تمام مراعات واپس لے لی گئیں۔ ہاکنز معہ اپنے ساتھیوں کے 1611 میں بظاہر نامراد انگلستان واپس چلا گیا(19)۔

مگر انگریز نے 1612 میں دشمنوں کو شکست دے کر مغل حکمرانوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں۔

31 دسمبر 1600 میں قائم ہونے والی ''برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا صدر دفتر لندن میں تھا۔ اس کے بانیوں میں جان وائسی اور جارج وائٹ مشہور تھے۔ ان کی تجارت کی اہم ترین اجناس میں کاٹن، سلک، نمک، مصالحہ جات، شورہ، کپڑوں کے رنگ سازی کے سامان، چائے اور افیون شامل تھے۔ یہ ایک اجارہ دار کمپنی تھی جس کا بنیادی مقصد مشرق اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا اور ہندوستان میں تجارتی طور پر ان کا استحصال کرنا تھا۔ بعد میں انہوں نے غلاموں کی تجارت میں ہاتھ ڈالا۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور برطانیہ کے لیے جاسوسی کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔ اس ایسٹ انڈیا کمپنی کو نہ صرف تاج برطانیہ کی حمایت حاصل تھی بلکہ اس کے پیچھے برطانیہ کے بڑے بڑے دماغ بھی منصوبہ بندی میں مصروف تھے جنہوں نے کمال مہارت سے اس کمپنی کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی، فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی، سوڈیش ایسٹ انڈیا کمپنی، پُرتگیز ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈینیش ایسٹ انڈیا کمپنی سب کو پیچھے دھکیل دیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہندوستان کے لوگ اس کو ''کمپنی بہادر'' کے نام سے پکارنے لگے۔ 1772 میں اس کمپنی نے پریزیڈنسی یعنی بنگال اور بہار میں براہ راست لوگوں سے مالیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔

1615 میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول کا وفد ولیم ایڈورڈ کی قیادت میں جہانگیر کے دربار میں پہنچا۔ اُس وقت تک جہانگیر کو یقین ہو چکا تھا کہ انگریز ہی وہ واحد قوت ہے جو پرتگالیوں کے فتنے سے اُسے نجات دلا سکتی ہے۔ ساتھ ہی سر تھامس رو کی قیادت میں انگلستان اور ہندوستان کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ انگریز نے اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے تجارتی تعلقات کو فروغ دیا۔ اس کے برعکس پرتگالی دو سو برس سے کسی بھی اخلاقی اور قانونی جواز کے بغیر ہندوستانی ساحلوں کو لوٹتے رہے۔ انہوں نے ظلم و بربریت کا بازار گرم کیے رکھا۔ وہ یہاں کے بچوں کو زبردستی چھین کر عیسائی بناتے اور ہندوستان کے غریب انسانوں کو غلام بنا کر لاطینی امریکہ میں فروخت کرتے۔ لیکن مغل شہنشاہ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اکبر سے لے کر اورنگزیب تک تمام مغل حکمران پرتگالیوں کے خوف میں مبتلا رہے تھے۔ وہ انھیں قزاقی کا تاوان ادا کرنے اور انھیں اپنے سروں پر بٹھانے پر مجبور تھے۔ حقیقتاً یہ انگریز ہی تھا جس نے پرتگالی لٹیروں کو پیہم شکستیں دے کر ان کے ظلم و بربریت سے ہندوستان کو نجات دلائی۔

ہندوستان میں برطانیہ والے، تجارت اور سرمایہ میں اضافہ کے سبب رفتہ رفتہ پرتگیزیوں کا اثر کم کرتے رہے اور 1635 کے بعد تو انھوں نے پرتگیزی کمپنی کے بہت سے علاقے چھین لیے۔ سندھ جہاں پرتگیزی بہت طاقت ور ہوا کرتے تھے، وہاں اُس کی جگہ پہ انگریز آئے اور 1636 میں انھوں نے شاہجہاں کی اجازت سے ٹھٹھہ میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔

مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انگریز تاجر دیانت دار تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نہ تو پرامن ادارہ تھی، نہ ایمان دار تھی اور نہ ہی قول کی پابند۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ کمپنی کا سیاسی اقتدار محض نجی مہم جوئی اور انفرادی بہادری پر مبنی نہ تھا، نہ ہی ان کی فتح میں برطانوی قوم کا کوئی وراثتی جذبہ موجود تھا

۔ بلکہ ان کی فتوحات کی وجہ مرکنٹائل کیپٹل ازم اور اس کی سماجی معاشی اور سیاسی قوتیں تھیں جنھوں نے اس کی فتح کی راہیں مقرر کیں۔ تجارت، منافع اور لوٹ کھسوٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایمان کے بڑے بڑے ستون تھے۔

بہر حال، انگریز کمپنی اس قدر زور آور نکلی کہ 1769 میں اس نے سب کو شکست دے کر ہندوستان میں اپنا سیاسی اور تجارتی اقتدار قائم کرلیا۔

1765 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کرلی اور اُسے منافع خوری کی اور چھوٹ مل گئی جس سے عام لوگوں کی زندگی تباہ ہوئی۔ ایڈم اسمتھ (Adam smith) کی رائے میں ''کسی بھی ملک کے لیے خالص تجارتی کمپنی کی حکومت شاید ہر قسم کی حکومت سے بدتر ہے''۔

اس صورتحال کا اندازہ ولیم بولٹس کے الفاظ میں: ''جب یہ (برطانوی) قوم آئندہ ہونے والے پھل پر نظریں گاڑے ہوئے ہے، کمپنی اور اس کے نائبوں کو درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کھلی چھوٹ ہے۔''

دیسی حکام کسانوں پر ظلم روا رکھتے اور مالیہ میں غبن کرتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین ان بدعنوانیوں سے چشم پوشی کرنا سودمند سمجھتے تھے۔

کارل مارکس نے اس زمانے کے حالات پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اور اس بات کا تجزیہ کیا کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستانی معیشت خصوصاً گاؤں کے سماج کو تباہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''کمپنیاں دولت اندوزی کی ہوس کو بڑھانے کا قومی سبب تھیں۔ جو خزانے یورپ سے باہر قتل وغارت گری اور دوسروں کو غلام بنانے سے حاصل ہوئے متواتر مادرانِ وطن (ام البلاد) میں پہنچتے رہے اور وہاں بہت بڑا سرمایہ فراہم ہوگیا''۔ 1700 اور 1761 میں برطانوی پارلیمنٹ میں ایسے قوانین پاس کیے گئے جن کی رو سے چند مخصوص چیزوں کے علاوہ انگلستان میں ہندوستان میں چھپی یا رنگی ہوئی چیز کو جس میں جزو اً روئی بھری گئی ہو، کام میں لانا قطعی ممنوع قرار دے دیا گیا۔

ہندوستان، ایران اور چین کا پختہ ریشم یا چھپی ہوئی یا رنگین چھینٹوں کا پہننا تعزیری جرم تھا۔ دوسو پونڈ تک جرمانے کی سزا تھی جب کہ دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی مال ٹھوسا گیا جس پر کوئی محصول نہیں تھا۔

''انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا۔ برطانوی مصنوعات نے ترقی کر کے پہلے ہندوستان کی صنعت پر جو ابتدائی حالت میں تھی غلبہ پایا اور آخر کار اُسے تباہ کر دیا۔ ہندوستان برطانوی مال کی کھپت کے لیے سب سے بڑا بازار بن گیا۔ اجڑے ہوئے صنعت کاروں اور دست کاروں کی حالت خستہ ہوگئی''۔

چناں چہ لارڈ ولیم بنٹنک نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ''تجارت کی تاریخ میں اس پریشان حالی کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ سوتی کپڑا بننے والے جولاہوں کی ہڈیاں سرزمین ہند پر دھوپ میں سڑ رہی ہیں''۔

1827 اور 1837 کے درمیان ڈھاکہ کے نفیس ململ پیدا کرنے والوں کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر صرف بیس ہزار رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اجڑے صنعت کاروں نے زراعت کا سہارا ڈھونڈا، اور یوں خود زراعت بھی شکار ہوئی۔ زمین پر مزید بار پڑا اور لگان میں اضافہ ہوا۔ کمپنی کے تحت علاقوں میں کسان مجموعی طور پر والیانِ ریاست کی رعایا کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال، زیادہ مفلس اور زیادہ بددل تھے۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی دیسی حکمران اس قدر مالیہ کا تقاضا نہیں کرتا جس قدر کہ انگریز کرتے تھے۔

کارل مارکس نے لکھا ''خانہ جنگیوں، حملوں، انقلابات اور قحط کی جو بھی بلائیں ہندوستان کی سرزمین پر پے در پے نازل ہوئیں، وہ کتنی ہی پیچیدہ، اچانک اور تباہ کن رہی ہوں لیکن ان سب کا اثر سطحی تھا۔ انگلستان نے ہندوستان کا سماجی ڈھانچا یکسر توڑ ڈالا اور ابھی تک تعمیر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ پرانی دنیا کے کھونے اور اس کی جگہ نئی دنیا نہ پانے سے ہندوستان کی موجودہ خستہ حالی میں ایک قسم کی افسردگی کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ہندوستان، برطانیہ کے زیرِ حکومت اپنی تمام قدیم روایات اور اپنے ماضی کی تمام تاریخ سے محروم ہوگیا ہے۔ یہ برطانوی ناخواندہ مہمان ہی تھا جس نے

ہندوستان کی دستکاری ختم کی اور چرخا تباہ کیا۔ برطانوی بھاپ اور سائنس نے ہندوستان کی سرزمین پر زراعت اور صنعت کا رشتہ اتحاد توڑ دیا۔''

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے عہد میں ہندوستان کے معاشی نظام کو سراسر برہم کر دیا۔ انہوں نے قدیم بندوبست اراضی کو تہ و بالا کر دیا۔ ملک کی صنعت و حرفت کو پاش پاش کر دیا۔ اور ہندوستان کی معیشت کے ان دو شعبوں کے درمیان رابطے کو منقطع کر دیا۔ وہ اس ملک کی دولت کو باقاعدگی کے ساتھ نکال کر اپنے ملک میں لے گئے اور ہندوستانی معیشت کی پیداوار کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے نے اس نئے غارت گر کے ہاتھوں سختی جھیلی۔ زمینداروں کو ان کی زمین سے بے دخل کر دیا گیا اور کسان کنگال ہو گئے۔ تاجروں کے شہری متوسط طبقے کا بحیثیت ایک آزاد جماعت کے نام و نشان مٹ گیا۔ اہلِ صنعت و حرفت اپنے تخلیقی پیشوں سے محروم ہو گئے۔ ملک کے معاشی نظام اور اس کے ہر طبقے کی بے مثال تباہی کا قدرتی نتیجہ ایک عظیم سماجی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا اور یہ 1857 کی بغاوت تھی۔

مارکس نے لکھا کہ ''اٹھارویں صدی کے پورے دورانیہ میں ہند سے انگلینڈ لے جائی گئی دولت معمول کی تجارت سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ یہ اُس ملک کے براہِ راست استحصال سے حاصل کی گئی تھی''۔ انڈیا کو محض ٹیکسوں کے ذریعے نہیں لوٹا گیا بلکہ براہِ راست لوٹ، رشوت اور اجارہ داری سے ایسا کیا گیا(20)۔

اینگلز نے اگست 1857 The New American Cyclopaedia کے لیے ''افغانستان'' کے عنوان کے تحت پندرہ فل سکیپ صفحوں پر مشتمل ایک تفصیلی مضمون میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سندھ کے تالپوروں اور بلوچستان پر قبضہ کا تذکرہ کیا۔

چنانچہ دسمبر 1687 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنے نمائندے کو مدراس میں یہ ہدایت نامہ بھیجا تھا کہ ''تمہارا فرض ہے کہ وہاں پر ایک ایسی سول اور فوجی قوت قائم کرو اور اس کی کفالت کے لیے اتنی مالی آمدنی پیدا کرو کہ وہ ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے ایک وسیع اور مستحکم برطانوی مقبوضے کی بنیاد بن جائے''۔

اُدھر یورپ میں صنعتی، سماجی اور ذہنی انقلاب کے باعث زندگی کا پرانا نظام بدل رہا تھا اور انسان اپنے لیے ایک نیا ماحول، اور ایک نئی دنیا تخلیق کر رہا تھا۔ لیکن یہاں ہمارے خطے کے غارت گر مغل اور مقامی فیوڈل ان تبدیلیوں سے بے خبر تھے۔ وہ بیہودہ لوگ عالی شان عمارتیں بنوانے، رقص کی محفلیں سجانے، حسین عورتیں چُن چُن کر اپنے حرم میں قید کرنے، زرق برق لباس پہننے اور عمدہ عمدہ کھانے پکوانے میں مصروف رہتے تھے۔ مغربی دریافتوں اور ایجادوں سے بہرہ ور ہونے کے اگر مواقع ملتے بھی تو وہ ان سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔ مثلاً پرتگالیوں نے 1576 میں گوا میں چھاپے خانے لگا لیے تھے۔ ان چھاپے خانوں میں وہ اپنی مذہبی کتابیں چھاپتے تھے اور ہندوستانیوں میں تقسیم کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ مطبوعہ کتابیں اکبر کی نظر سے بھی گزریں۔ وہ اکبر بادشاہ جس کو ہمارے لال بجھکڑ دانش وروں کی طرف سے ''روشن خیال بادشاہ'' کا لقب دیا گیا۔ اِس بے ہودہ اکبر نے چھاپے خانے کے قیام کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ ایک تو مطبوعہ کتابوں کا خط بہت خراب ہے اور دوسرا، اِس سے خوش نویسوں کی روزی ماری جائے گی۔

یہ بھی دیکھیے کہ قریب قریب ہر بڑے تجارتی شہر میں انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں مگر کسی ہندوستانی امیر یا سوداگر یا دانش ور کو ان کی زبان سیکھنے، اُن کی کتابیں پڑھنے، اور اُن سے مغربی علوم و فنون کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ جہانگیر کو انگریز سوداگر اپنے ملک کی عجوبہ چیزیں بطور تحفہ پیش کرتے تھے۔ لیکن بادشاہ سلامت یا کسی وزیر نے برطانیہ کی ایجاد کردہ کسی مشین کی فرمائش نہ کی۔

اس کے علاوہ حاجیوں کے قافلے ہر سال ڈچ، برطانوی، اور پرتگالی جہازوں کے ذریعے مکہ شریف جاتے تھے۔ مگر کسی حاجی نے مغربی جہازوں کے کل پرزوں کو دیکھنے یا اُس طرح کے کل پرزے بنانے کا ادارہ کرنے کی تکلیف نہیں کی۔ کسی حاجی کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ آؤ لگے ہاتھوں یورپ کی سیر بھی کر لیں اور دیکھیں کی اہلِ مغرب کی دنیا کیسی ہے۔.....خود کفیل اور حصار بند ذہنیت تو قہر ہوتی ہے!۔

جیسے کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یورپ پر سائنس حملہ آور تھی۔ تحقیق کے گویا بند ٹوٹ چکے تھے۔ ایک ایک شعبہ سوالیہ نشانوں سے بھر جاتا اور پھر ایک ایک کر کے ان سوالیہ نشانات کے عقدے کھلتے جاتے۔ پیرس، انقلابِ فرانس کی زد میں آ چکا تھا۔ بادشاہ، جو ایک زمانے تک ظلِ الٰہی (خدا کا سایہ) تھا، اب عوام کے ہاتھوں خدا کے سائے سے محروم ہو کر معتوب ہو چکا تھا۔

یہی تو وہ زمانہ تھا جب 1830 میں چارلس ڈارون برطانوی بحریہ کے بیگل نامی جہاز میں برطانوی نو آبادیوں کے فطری ماحول کے سروے پر متعین ہوا۔ ڈارون نے جزیروں اور جنگلوں میں جب جانور نما انسانوں کے قبائل کو دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی کہ ننگ دھڑنگ مرد و زن زندہ رہنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ وہ حیران تھا کہ انسان آیا کہاں سے۔ اُس نے لاکھوں سال پرانے فاسلز سے پتہ چلایا کہ تخلیق کا سارا عمل قابلِ فہم ہے اور یہ کہ ہماری یہ دنیا سست رفتار، بتدریج اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی فطری تبدیلیوں کا مجموعہ ہے۔ قوانین، قوانین اور قوانین۔ ساری کائنات قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ روایت اور اوہام کے کپڑے اترتے گئے تو نیچر کو سمجھنے میں آسانیاں آتی گئیں۔ ایسے میں روٹی روزگار اور آمدن کی نئی راہیں ڈھونڈنے کا جنون تو آنا ہی تھا۔ سو آ گیا۔ پورا یورپ باؤلا ہو گیا اور اُن کا سارا براعظم نو آبادیوں کو زیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔

اگر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دھاوا کرنے والا اولین کارپوریٹ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کمپنی نے ایک صدی تک جنوبی ایشیا کے وسیع خطے کو نہ صرف فتح کیا، بلکہ اسے زیرِ نگیں رکھا، اور مسلسل لوٹا۔ انگریزی کا لفظ loot یہیں کے لفظ ''لوٹ'' سے ہی نکلا ہے۔

مارکس نے لکھا حتیٰ کہ 1693 میں اقتدار کے لوگوں کو ''گفٹ یعنی تحائف'' کی مد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا سالانہ خرچ نوے ہزار پاؤنڈ تھا۔ کمپنی، برطانوی حکومت میں لوگوں کا تبادلہ کرواتی تھی، برخواست کرواتی تھی، مخالف کمپنیوں کو دیوالیہ کرواتی تھی(21)۔

اس طرح پھولتے پھولتے ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی قوت سے ایک فوجی قوت میں ڈھل گئی۔ مشرق کو لوٹنے والی قوت، اور بغاوتوں کو بزورِ قوت دبانے والی قوت۔

اگر آج گوگل جیسی دنیا کی سب سے بڑی خونخوار کارپوریشنوں کو باہم ضم کیا جائے تو وہ سب مل کر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی باولی علاقائی بھوک کے سامنے پالتو بلیاں لگیں گی۔

اور جب اہلِ برطانیہ اپنے خوابِ بے شعوری سے جاگے تو انھیں اندازہ ہوا کہ ارے یہ تو غلط ہو رہا ہے۔ حکومت برطانیہ کے علاوہ تو کسی اور طاقت کو اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے پاس علاقے رکھے۔

تب لوگ، اُن کے نمائندے اور وزیر، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پیچھے پڑ گئے۔ مجبوراً کمپنی نے 1767 کو قومی خزانے میں چار لاکھ پاؤنڈ سالانہ جمع کرنے کا معاہدہ کر کے اپنی جان بچالی۔

یوں انگریز نے مشرق کی سرزمین پر اپنے خون خوار پنجے گاڑ دیے۔ ہندوستان اُن کا ہو چکا تھا۔ مگر، بلوچستان پہ انگریز قبضہ، ابھی مستقبل بعید کی بات تھی۔

حوالہ جات

1۔ گیلینو، ایڈوارڈو۔ Open Vein of Latin America -1997 - Latin لیٹن امریکہ بیورو، لندن۔ صفحہ 60۔

2۔ گیلینو، ایڈوارڈو۔ اوپن.....صفحہ 79۔

3۔ گیلینو، ایڈوارڈو۔ اوپن.....صفحہ 80۔

4۔ اینگلز، فریڈرک۔ فطرت کی جدلیات۔ درکتاب جدلی مادیت۔ دارالاشاعت ترقی ماسکو۔ 1979۔ صفحہ 77

5۔ واٹسن، پیٹر۔ آئیڈیاز۔ 2006۔ فونیکس۔ صفحہ 558

6۔ سارنگ۔ پاکستان' ہسٹری آن دی رن۔ 2006۔ گڈبکس لاہور۔ صفحہ 24

7۔ فاکس، رالف۔ دی کالونیل پالیسی آف برٹش امپیریلزم۔ 2008۔ آکسفرڈ۔ صفحہ 9

8۔فاکس،رالف۔۔۔صفحہ 10

9۔ویلوریا۔’’From the Middle۔۔۔‘‘۔صفحہ 652

Monsoon-10 رابرٹ کیپلاں۔2011،رنیڈم ہاؤس نیویارک۔صفحہ 60

11۔ Annals of Balochistan جمع کنندہ حمید بلوچ۔جلد نمبر 1۔سید ہاشمی لائبریری۔

سنِ اشاعت (2012) صفحہ 91

12۔ویلوریا۔ایف۔پی۔۔۔"From Middle"۔صفحہ 650۔

13۔مکران گزیٹیئر۔صفحہ 46

14۔مکران گزیٹیئر۔صفحہ 46

15۔فاکس،رالف۔۔۔صفحہ 7

16-مبارک علی’’تاریخ اور آج کی دنیا‘‘۔نگارشات لاہور،صفحہ نمبر 10۔

17۔فاکس،رالف۔۔۔صفحہ 8

18۔فاکس،رالف۔۔۔صفحہ 9

19-خان،نذیرالدین۔پہلا پتھر۔آج۔کراچی نمبر 83۔صفحہ 187

20۔عرفان حبیب Assays in India History تلیکا،نیودھلی۔1995۔صفحہ 36۔

21 نقوی، عارف۔ انقلاب 1857 اور ہمارا ضمیر ۔ ماہنامہ قومی زبان کراچی۔جنوری

2021۔صفحہ 15

چیپٹر دو:

بلوچ،کپٹلزم میں

1-عالمی تجارتی سرمائے کا فروغ

اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں یہاں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔اور خود انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا۔وہاں ایجادات تھیں جو دھڑا دھڑ ہوتی جا رہی تھیں۔1760ء میں اُڑنے والی نال(Flying Shuttle) منظر عام پر آئی۔ 1764 میں ہاگریوز نے سوت کاتنے کی مشین (Spining Jenny) ایجاد کی۔ٹکسٹائل انڈسٹری کے برپا کردہ صنعتی انقلاب نے انگلینڈ میں ٹرانسپورٹیشن میں حیرت انگیز ترقیاں دیں۔ اس انقلاب نے پہلے نہریں بنوائیں، پھر سڑکیں اور آخر میں ریلوے۔1785ء میں واٹ نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا۔1814 میں جارج سٹیفن سن نے پہلا دخانی انجن بنایا جو چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتا تھا۔

1829 میں انگریز کی خالص بھاپ سے چلنے والی پہلی ریل گاڑی نے مانچسٹر سے لیورپول تک، چالیس میل کا سفر کیا۔

یہ ریل 1831 میں امریکہ میں بھی رائج ہوئی۔پھر اگلے برس یعنی 1832ء میں فرانس میں اور 1837ء میں روس میں چلنے لگی۔گھوڑے تو اب بس عرب شیوخ کی طرح کے فیوڈلوں (نائٹوں) کے پاس رہ گئے تھے' اور یا پھر مراثی کے پاس۔۔۔۔گھوڑے، جدید ریل کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے تھے۔

برطانوی ٹیکسٹائل انڈسٹری نہ صرف صنعتی انقلاب کے پیچھے قوتِ متحرکہ تھی بلکہ اس نے عالمی معیشت میں بھی انقلاب برپا کر دیا۔تاریخ کے ہر دوسرے انقلاب کی طرح یہ صنعتی انقلاب بھی بغیر مزاحمت کے نہ تھا۔ وہاں جاگیردار اور پادری نے اُس کے راستے میں خوب خوب رکاوٹیں ڈالیں۔انگلینڈ کے خان ونواب پندرہ سال تک اِن انجنوں کے ساتھ اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے تھے تاکہ ثابت کر سکیں کہ ان کا اصلی اور نسلی گھوڑا انجن سے زیادہ تیز رفتار ہے۔یعنی سائنس کا مذاق اڑایا جائے اور عوام کے سامنے اپنی روایتی فیوڈل زندگانی کو ہی بہتر قرار دیا جائے۔

فیوڈل تو ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں، خواہ یورپ کے ہوں یا بلوچستان کے۔ پھنے خان، گردن اکڑائے ہوئے ، اور عوام دشمن مثلاً میر عبداللہ جان جمالدینی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہمارے ایک سردار نے انگریز کے وقت کار موٹر خرید رکھی تھی۔ جب وہ انگریز سے ملنے جاتا تو گھوڑی پر بیٹھ کر اپنے علاقے سے باہر نکل جاتا۔وہاں ایک گیراج میں اُس کی کار بند ہوا کرتی تھی۔وہ گھوڑا چھوڑ کر کار میں بیٹھ جاتا اور انگریز کے دربار جاتا۔واپسی پر بھی وہ اپنے علاقے کی سرحد تک کار موٹر سے جاتا اور وہاں سے آگے گھوڑے پر۔ وہ سائنس کی دنیا کی کھڑکی اپنے علاقے کی طرف کسی صورت کھولنا نہیں چاہتا تھا۔

الغرض سائنسی کمالات اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی سے پورا روایتی سماج تغیر وتبدیلی کے لیے بلبلا رہا تھا، وہاں بھی یہاں بھی۔ جدید اور قدیم کی جنگ زیست وموت کی شدت اختیار کر چکی تھی۔

اِن ایجادات کی مدد سے یورپ میں صنعتی انقلاب کو آگے بڑھانے میں جو سرمایہ لگایا گیا اس میں ہندوستان کی لوٹی ہوئی دولت کا بہت بڑا حصہ تھا۔ایک اندازے کے مطابق پلاسی کی جنگ(1757) سے لے کر واٹرلو کی جنگ(1815) تک انگریزوں نے ہندوستان سے 50 کروڑ سے لے کر ایک ارب پاؤنڈ تک کا خزانہ سمیٹا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ دنیا میں صنعتی انقلاب انگلینڈ سے ہی شروع ہوا اور اُس نے وہیں بڑے بڑے ڈگ بھرے۔اس لیے کہ انگلینڈ کے پاس دنیا بھر میں سب سے ممتاز شراکتی صنعتی ادارے موجود تھے۔دراصل یہ ادارے خود اُن شراکتی سیاسی اداروں پہ بنے جو وہاں قائم تھے۔وہاں ملکیت کے حقوق مضبوط تھے، مالیاتی مارکیٹیں بہتر صورت میں موجود تھیں، خارجی تجارت میں ریاستی منظور کردہ اجارہ داری کم تھی اور صنعتی توسیع میں رکاوٹیں موجود نہ تھیں۔ وہاں معاشی ضرورتوں اور سماج کی خواہشات کے حوالے سے سیاسی نظام کھلا اور جوابدہ تھا۔انہی شراکتی معاشی اداروں نے ہی جیمز واٹ جیسے باصلاحیت و بابصیرت لوگوں کو مواقع

اور incentive عطا کیے کہ وہ اپنی مہارتوں اور تصورات کو فروغ دیں اور نظام پر اپنے اور قوم کے مفاد میں اثر ڈالتے رہیں(1)۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا حقیقی آغاز ملکہ الزبتھ کے دور میں محض چند سمندری مہم جوؤں کے ادارے کی حیثیت سے ہوا تھا۔ بتدریج انہیں اپنے جہازوں کو اسلحہ سے لیس کرنا پڑا اور فوجی دستے تیار کرنے پڑے۔ یہ تجارتی کمپنی منافع کی صورت میں مصالحہ جات، رنگنے کا مصالحہ، چائے اور زیورات کا کاروبار کر رہی تھی۔ یہ آئی تو تھی خریدنے اور بیچنے مگر یہاں اُسے قزاقی کے تمام مواقع میسر آ گئے تھے۔ اس کی پیش قدمیوں کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ یہ امر باعثِ تعجب نہیں ہے کہ نہ صرف اس کے کپتان، سپہ سالار اور افسران، بلکہ اس کے کلرک اور عام سپاہی بھی مالِ غنیمت سے لدے پھندے واپس پہنچتے۔ (سرمایہ داری کا ابتدائی صفحہ ہی ڈاکے اور قزاقی سے آلودہ ہے !!)۔

تاریخِ عالم میں یہ ایک عجیب اور بے مثال صورتِ حال تھی۔ انگریز پارلیمنٹ کی حکمرانی کے تحت لندن کی ایک معمولی تجارتی کمپنی ایک دوسرے پورے برصغیر پر فرمانروا تھی جو برطانوی سلطنت میں شامل کسی بھی ملک سے کہیں زیادہ بڑا' اور گنجان آباد تھا۔ انگریزوں کی اکثریت کے لیے ہندوستان ایک دور دراز، حیران کن اور تقریباً ناقابلِ رسائی سرزمین تھی، جہاں غریب مہم جو نوجوان جاتے تھے اور پھر کئی سالوں کے بعد امیر اور تند مزاج بوڑھوں کی صورت میں واپس لوٹتے۔

2۔ انگریز کے وقت کا بلوچستان

انگریز جس وقت بلوچستان کی طرف متوجہ ہوا تھا تو اُس وقت بلوچ سماج ایک نیم قبائلی زرعی معیشت میں تھا۔ قبائل واضح خط کشیدہ سرحدوں میں محدود نہ تھے بلکہ ہمہ وقت حرکت و ہجرت اور مائیگریشن میں تھے۔ روٹی روزی کا بندوبست جنگوں مناقشوں حملوں اور غنیموں کے ہاتھ میں تھی۔ فرد اور وہ بھی جنگی فرد جہاں سے ملتا قبیلے میں شامل کیا جاتا۔

سومیانی بندرگاہ صرف بلوچستانی ضروریات کی درآمد برآمد نہیں کرتا تھا بلکہ دور دیسوں کی تجارت کا ٹرانزٹ روٹ بھی تھا۔ سومیانی کا ٹرانزٹ اور مینوفیکچرنگ مرکز، کپڑے اور قالین کی ساحلی تجارت میں سپیشلائز تھا۔ رنگ اور چمڑا مسقط کو جاتا تھا.....

اُس وقت کے بلوچ سماج میں مویشی یا زمین کا مالک ہی حاکم ہوتا تھا (اور وہ شخص سردار، یا وڈیرہ ہوتا تھا)۔ اُس وقت بلوچستان کی آبادی کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ مستقلاً یا موسمیاتی طور پر خانہ بدوش تھا۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں ہر شخص کو اپنے سماجی مقام کا پتہ تھا اور وہ اپنے اسی مقام کے اندر زندہ رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ اور آنے والی نسلوں کو بھی یہی کچھ کرنے کا کہتا تھا۔ حکمران طبقات موجود پیداواری قوتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم دیکھیں گے کہ انگریز آنے کے بعد ہمارے اس نظام کو کسی خاص مرگ آور بخار نے نہیں پکڑا، ہاں البتہ اُسے ہو بہو ایسا بھی نہیں رہنا تھا۔

انیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں کلات ایک متحد اور مضبوط ریاست تھی۔ جنوب مغرب میں آج کے ایرانی بلوچستان کے سمندر سے لے کر مشرق میں ہڑند و داجل (ضلع راجن پور)' اور شمال میں کوئٹہ سے لے کر جنوب میں خان گڑھ (جیکب آباد) تک' سارا بلوچستان بہت ہی ڈھیلی قبائلی فیڈریشن کی صورت میں قائم تھا۔ مغربی (ایرانی) بلوچستان اور افغانستان میں شامل بلوچ علاقہ بھی ریاست کلات کے حصے ہوا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں بلوچستان مغرب میں بمپور اور جاسک، مشرق میں داجل، ہڑند، ڈیرہ غازیخان، جنوب مشرق میں خان گڑھ، اور جنوب میں لسبیلہ، کیچ اور کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔ نوری نصیر خان (1750۔1795) کا وطن رقبہ میں چھ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ تھا۔

یہ ایک ایسی سرزمین تھی جس کی حفاظت اُس کے بیٹے صدیوں سے کیے ہوئے تھے۔ اُن

کے علاوہ خود فطرت بھی اس کی حفاظت کرتی تھی۔ بلوچستان کی جغرافیائی دفاعی حالت کئی صدیاں قبل خلیفہ دوئم، حضرت عمرؓ کو لکھی گئی رپورٹ میں موجود ہے، جس میں انہیں بلوچستان پر یہ کہہ حملہ سے روکا گیا تھا:

"ارض سَھلُلھا جَبل
وَ ما ءُ ھا و شَل
وَ ثمر ھا وَ قَل
وَعدوھا بَطل
وَ خیرُھا قلیل
وشرّ ھاطویل
وَ الکثیرُ بھا قلیل

ترجمہ:

اس کی سرزمین کوہستانی ہے
جس میں پانی قلیل ہے
یہاں کا خاص پھل گوگل (گُچ) ہے
یہاں کے لوگ دلیر ہیں
اس کی بھلائی بہت کم ہے
اس کی برائی بہت لمبی ہے
اور اس کے متعلق جتنا بھی زیادہ کہا جائے کم ہے۔

۔۔۔اور انگریز کو اِس سرزمین سے واسطہ کرنا تھا۔

انگریز کی آمد کے وقت تک بلوچوں کے سارے قصبے شہر یا تو بحیرہِ بلوچ کے ساتھ ساتھ بسائے گئے تھے، اور یا پھر کارواں راہوں پہ واقع تھے۔ یہ گاؤں اور قصبے دراصل کاروانوں کے روٹ ہوا کرتے تھے۔ ہم اُس وقت کے بلوچستان میں قصبوں کی تین نمایاں قطاریں دیکھ سکتے ہیں:

1۔ مغرب کی طرف گوادر، تربت، پنجگور، واشک، خاران، نوشکی، مستنگ، کوئٹہ، کندہار
2۔ پہاڑی سلسلے میں سومیانی، اوتھل، بیلہ، خضدار، سوراب، کلات، مستنگ، کوئٹہ، کندہار
3۔ اور کچھی کے نشیبی میدانی علاقے میں جھل، گنداواہ، بھاگ، حاجی، ڈھاڈر، سبی، لہڑی۔

اسی طرح براستہ کلات بحیرہ بلوچ کی ساحلی بندرگاہیں تھیں۔ ایک اہم ''کارواں روٹ'' مرو سے براستہ ہرات اور فرح تا کندہار آتا تھا۔ ایک کارواں روٹ شمالاً جنوباً براستہ کوئٹہ اور شکار پور تا حیدرآباد (دارالحکومت سندھ) تھا'۔ بلوچستان بحیرہِ بلوچ کے ساحلوں گوادر، پسنی، اور ماڑہ، سومیانی اور کراچی (جنوبی افغانستان تک سارے عقبی علاقے کے ساتھ) سے شروع ہونے والی تجارت سے وابستہ تھا۔ نیز یہ تجارت افغانستان و جنوبی پنجاب (ملتان) اور سندھ (شکارپور، حیدر آباد) کے شہروں کے درمیان تھی۔

صرف ایک ترچھا رابطہ موجود تھا جو کہ تل چوٹیالی کا ''تجارتی راستہ'' تھا جو کہ ڈیرہ غازی خان سے چاچڑ درہ اور سنجاوی سے پشین تک جاتا تھا اور کندہار کو مل جاتا اور وہاں سے نوشکی اور پھر فارس کو جاتا تھا۔

کارواں راستے مغربی اور شمال مشرقی بلوچستان کے پہاڑوں کو عبور کرتے تھے۔ اِن کارواں راستوں کے ساتھ ساتھ ریگولر وقفوں پر آرام گاہیں اور تجارتی پوسٹ موجود تھے۔ اِن میں کلات اہم ترین تھا، جو کہ بلوچستان کا دارالحکومت تھا۔ اسی لیے کلات میں سارے مقامی اور دور دراز کے اہم روٹس آن ملتے تھے۔ غلاموں کی منڈیاں یہاں لگتی تھیں جن میں اومان تک کے سوداگر حصہ لیتے تھے۔ شکارپور سے ہندو بینکاروں کے مبادلہ کے بل یہیں ادا ہوتے تھے۔

* اِن کُل اکتیس شہروں میں سے چار' بندرگاہیں تھیں، نو کے پاس قلعہ، بازار، اور ہائشی علاقہ تھا'

اور 14 مشرقی شہر کا نمونہ پیش کرتے تھے جہاں مرکز میں بازار اور مسجد ہوا کرتا تھی، پڑوس میں رہائشی کواٹر تھے اور ارد گرد فصیل یا چار دیواری تھی۔

* وہ شہر جن کے گرد فصیل تھی اور جو جزوی طور پر قلعہ بند تھے' یہ تھے: مینہ بازار، میختر، حاجی کوٹ، سنجاوی، ڈھاڈر، لہڑی، حاجی شہر، ماوند، بھاگ، کلات، گنداواہ، جھل، خضدار، بیلہ اور اوتھل۔

* وہ شہر جن کا بازار الگ تھا، یہ تھے:

تربت، پنجگور، واشک، خاران، نوشکی، مستنگ، کوئٹہ، سبی، کاہان۔

اُس وقت ہمارے پورٹ یہ تھے: گوادر، پسنی، اور ماڑہ اور سومیانی۔ سومیانی کے بارے میں میسن نے لکھا تھا (1843، صفحہ 304): ''سومیانی ایک ہزار گھروں پر مشتمل قصبہ ہے۔ اس کا بڑا بازار ہے اور یہاں بڑی تعداد میں ہندو تاجر اور دستکار رہتے ہیں''۔..... (تصور کیجئے کہ دوسو برس قبل ایک ہزار گھروں پر مشتمل شہر کتنا بڑا شہر ہوگا!!۔

3۔ سماجی تقسیم

(حاکم، بلوچ ، ھذمتگار)

مکران میں سماجی طور پر کلات کی خانی (18-20 صدی تک) نے بلوچ آبادی کی تین کیٹیگریاں قائم کیں جو یہ تھیں: حاکم، بلوچ اور ھذمت گار۔

حاکم: یعنی (حکمران)۔ یہ اصطلاح کلات کی بالادستی سے قبل بھی مقامی طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہ اصطلاح ہر اُس شخص یا گروپ کے لیے استعمال ہوتی تھی جو ایک خاص علاقے پر اقتدار رکھ سکتا تھا۔ گچکی (کلات کی خانی اور مکرانی دونوں کی نظر میں) حاکم تھا۔ گو کہ ان کے خلاف لڑائیاں ہوتی تھیں اور کامیابی کی صورت میں دوسرا گروپ حاکم کہلاتا تھا۔ اس لیے جب ان کا اقتدار ختم ہوجاتا تو پھر انہیں حاکم نہیں کہا جاتا تھا اور انہیں تنزلی دے کر ''بلوچ'' میں شامل کیا جاتا۔ انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی حکمرانی کے تحت گچکی کے علاوہ نوشیروانڑیں، میروانڑیں اور بزنجو حاکم گروپ تصور ہوتے تھے۔ حاکم کا بیٹا خود بخود حاکم ہوتا تھا۔

وہ حاکم جو بلوچ گروپ سے تعلق رکھتے تھے، انہیں حاکم کے ساتھ ساتھ بلوچ بھی تصور کیا جاتا تھا۔ طاقتور لوگ' یا خان کے ساتھ اچھے تعلقات والے لوگ ٹیکس سے بچ جاتے۔ ہر مالدار شخص حاکم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے حاکم بننے کے لیے خانی سے سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کی ضرورت تھی۔ جب انگریز مکران پہنچے تو حاکم' کلات کے مقامی نمائندے تھے جبکہ دشت کے کہدائی جیسے دوسرے نمایاں گروپ ٹیکس تو نہیں دیتے تھے مگر سرکاری طور پر حاکم کے عہدے کی برگزیدگی سے محروم تھے۔

مکران کے مقتدر طبقات میں گچکی، نوشیروانڑیں، میروانڑیں اور بزنجو اشرافیہ شامل ہیں۔ یہی لوگ مکران کی زمینیں رکھنے والی جنڑی تشکیل کرتے ہیں۔ برطانوی قبضہ سے قبل ان کی طاقت ان لوگوں کی طاقت سے معمولی کم تھی جنہیں قدیم انگلینڈ میں فیوڈل بیرن (Barons) کہتے تھے۔ ایک عام بلوچ کے قتل پر حاکم سے کوئی خون بہا طلب نہ کیا جاتا تھا۔ وہ بغیر کسی وجہ کے نچلے طبقات کے لوگوں کو قتل کرتے تھے.....اور یہ عام سی بات تھی۔

بلوچ: مکران میں حاکم کے لفظ کا الٹ لفظ ''**بلوچ**'' ہوتا تھا۔ اس میں وہی لوگ شامل تھے جو بلوچ ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ حاکم ایک سیاسی رتبہ ہوتا تھا جبکہ بلوچ عام لفظ ہوتا تھا۔

ھذمت گار: مکران کے سماج میں تیسرا درجہ ''**ھذمت گار**'' ہوتا تھا۔ یہ دراصل بے زمین لوگوں کے مختلف درجے تھے۔ ان میں خانہ بدوش مالدار تھے، ساحلوں والے ماہی گیر اور مچھیرے یعنی ''میڈ'' تھے، لوڑی، داستان گو جیسے دستکار اور گھریلو ملازم (خانہ زاد) تھے اور یا پھر دوسرے ایسے لوگ تھے فیوڈل کے لیے کام کرنے پر مجبور تھے۔ ان میں دیگر گروپ بھی شامل تھے مثلاً درزادہ (بے زمین مزدور)۔ چنانچہ ''ھذمت گار'' کا گروپ مختلف لوگوں کا مجموعہ تھا(2)۔

لوڑی: لوڑی آباد بھی تھے اور خانہ بدوش بھی۔ آباد لوڑی عظیم المرتبت کام کرنے کے

باوجود درجے کے شہری ہیں۔اس لیے یہ خود کو لوڑی کہلانے سے کتراتے ہیں۔اور دوسرے فرضی قصے گھڑ کر دوسرے نام رکھتے ہیں۔سارے لوڑی یا تو ترکھان تھے یا لوہار، سنار، موسیقار اور شعر سنانے والے۔ترکھان کو بلوچی میں دارتراش، لوہار کو آسن کار اور سنار کو زرگر کہتے ہیں۔(اور کتنے کارآمد ہیں یہ لوڑی!!)۔

4۔انگریز بڑھتا گیا

ہندوستان پر قابض انگریز کو ایران، افغانستان اور وسطی ایشیاء میں اپنی سازشوں اور مداخلت کاری کے سلسلے میں بلوچستان ہی سے گزرنا تھا۔اس لیے ہماری سرزمین کی سٹرٹیجک اہمیت بہت زیادہ تھی۔چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت عرصہ قبل 1760ء کی دہائی میں ایران کے بادشاہ کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا جس کے تحت انگریزوں نے ساحل پر زمین رکھنے کا حق حاصل کرلیا۔ چنانچہ اس نے بندرعباس اور بوشہر میں بغیر محصول کے اپنی تجارتی بستیاں بسانے اور کشتیوں کے ٹھہرنے کے لیے ان زمینوں سے استفادہ کرنا شروع کیا۔

1810ء میں انگریزوں نے اپنے استعماری منصوبوں کی تکمیل کے لیے بلوچستان کا مطالعہ کرنا شروع کیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے پوٹنگر کو سیاح کے بھیس میں خان محمود خان کے دربار میں کلات بھیج دیا گیا۔یہ سامراجی شخص شیطانی قابلیتوں سے بھرا ہوا تھا۔وہ نہایت باریک بین اور دور بین آدمی تھا۔اس نے مستقبل کی قبضہ گیری کے لیے اپنے حاکموں کو بہت اہم معلومات دیں۔

1814ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایران کے ساتھ خلیج فارس کے ایرانی ساحل میں اپنے قلعوں کو مضبوط کرنے کا معاہدہ کیا۔ چھ سال بعد ہی اس نے عمان کے شیخ سے خلیج فارس کے پانیوں میں اپنی بحری افواج کی سرگرمیوں کا حق حاصل کیا۔اس طرح وہ خلیج فارس اور بحیرہ بلوچ

کے پانیوں میں بلوچستان (ایرانی) کے ساحلی علاقوں میں اپنا تسلط قائم رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔1831ء میں مشہور انگریز جاسوس، الیگزنڈر برنز نے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ آکلینڈ کی طرف سے پنجاب کی سکھ ریاست کو افغانستان کے خلاف اپنا اتحادی بنانے کا کام شروع کیا۔اس نے سندھ کے بلوچ امیروں سے دریائے سندھ میں انگریز تاجروں کی آزادانہ آمدورفت کے لیے مذاکرات شروع کیے۔یہ معاہدہ 1832 میں ہوگیا۔

اُدھر انگلینڈ کے اندر 1830 میں لبرل پارٹی فتح مند ہوکر اقتدار میں آئی اور وہ کم وبیش گیارہ برس تک اقتدار میں رہی۔اس پارٹی نے مشرق میں بادشاہی روس کی پیش قدمی روکنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کیں۔ 1838 میں اس حکومت نے حکومتِ ترکی کی خوب مدد کی۔حتیٰ کہ 1841 میں اس نے ایک بار پھر مصر کو ترکی کے ماتحت کردیا۔ بادشاہی روس کے خلاف اسی پالیسی کے تحت لارڈ آکلینڈ کو ہندوستان میں متعین کیا گیا۔

اِسی بڑے منصوبے کے تحت، 1838ء میں ایک انگریز افسر لیچ، کلات میں خان محراب خان کے دربار گیا تاکہ بلوچستان کی جاسوسی بھی کرے اور بلوچستان میں سے افغانستان کی جانب انگریز فوجوں کے گزرنے کی اجازت بھی حاصل کرے۔یہ مقصد بھی تھا کہ افغانستان جانے کی اجازت کی صورت میں افواج اور اس کے جانوروں کے لیے خوراک اور چارے کا بندوبست بلوچستان کرے۔مگر میر محراب خان نے ایسا معاہدہ کرنے سے انکار کردیا۔(3)۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی۔ برطانیہ کی پرائیویٹ فرم ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی مفادات کے حصول کے لیے امن وامان کو بحال رکھنے، محصولات سے بچنے، مقامی تاجروں اہلِ حرفہ اور کاشتکاروں کا استحصال کرنے، اور ریاستوں کو اپنا دست نگر بنانے کے لیے فوجی قوت کی بہت ضرورت تھی۔ چنانچہ کمپنی نے مقامی سپاہیوں کی کمپنیاں کھڑی کردیں جن کے افسر برطانیہ سے آنے والے تعلیم یافتہ انگریز نوجوان ہوا کرتے تھے۔واضح رہے کہ 1832 تک سارا ہندوستان کمپنی کے زیرتسلط آچکا تھا۔

اُدھر فرانس کو ہندوستان میں اپنا گم کردہ وقار دوبارہ حاصل کرنے کا خیال آیا۔ ذرا مرحلہ وار دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نپولین نے 1798 میں مصر پر حملہ کر دیا تھا۔ مصر اور شام پر قبضہ کے بعد اُس نے ایران کو خیر سگالی کے پیغام بھیجنے شروع کر دیے اور قاچار حکمرانوں کو شہ دی کہ وہ روس سے جارجیا لے لیں۔ اسی طرح وہ میسور میں ٹیپو سلطان کا ساتھی بنا جو کہ برطانیہ کے خلاف لڑ رہا تھا۔ (اور اسے دائیں بازو کے دانشوروں نے شیر کی کھال پہنا کے پچاس برس تک ایک ہیرو بنائے رکھا)۔ مگر 1799 میں ٹیپو کی شکست اور موت کے بعد فرانس کا یہ سہارا بھی ختم ہوگیا اور اس نے ایران پہ توجہ مرکوز کر دی۔ مگر 1807 میں یہاں بھی دوسرا کھیل ہوگیا۔ شاہی روس نے ایران کو شکست دی اور اُس کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ فرانس کی یہاں سے بھی چھٹی۔ اور یہ فرانس 1815 کے واٹرلو نامی جنگ کے بعد ہمارے منطقے سے صاف ہوگیا۔

تو اب، اس خطے میں دو قوتیں رہ گئیں: برطانیہ اور روس۔ برطانیہ نے ایک طرف ایران کے بادشاہ کو پیسے لگائے اور دوسری طرف افغانستان کے شاہ شجاع سے 1809 کا معاہدہ حاصل کرلیا۔ برطانیہ نے ایران کی خوب مدد کی اور اشتعال دلایا مگر ایران نے 1826 میں روس سے ایک اور عبرتناک شکست کھالی۔ یوں روس اور برطانیہ دونوں کا مفاد پورا ہوا کہ ایران خطے میں من مانی چلانے کی اب کوئی قوت نہ رہی۔ چنانچہ طے پایا کہ بادشاہی روس وسطی ایشیا میں عیش کرے اور برطانیہ ہندوستان میں۔ واضح رہے کہ اُس وقت تک روس وسطی ایشیا پر قبضہ کر چکا تھا اور اُس نے ایران سے لے کر پنجاب تک اپنے سفارتی مشن بھیجنے شروع کر دیے تھے۔

برطانیہ زیادہ چالاک تھا۔ اس نے افغانستان میں اپنی مداخلتیں جاری رکھیں۔ مگر اب روس و ایران کی یاریاں اُسے پریشان کرنے لگیں۔ اس نے جون 1838 میں ''خراج جزیرہ'' پر قبضہ کرنے فوج بھیج دی۔ ساتھ میں رنجیت سنگھ کو پشاور تک حکمرانی کرنے، اور شاہ شجاع کو کابل و کندہار سنبھالنے کا سہ طرفہ معاہدہ کرلیا۔ اور اس معاہدے کو عملی بنانے (یعنی، شاہ شجاع کو تخت پر بٹھانے) کے لیے 1839 میں افغانستان پر حملہ کرنے روانہ ہوا۔ پہلی افغان جنگ کے لیے، برطانوی فوجیں پنجاب کے بجائے سندھ کے راستے سے گئیں اس لیے کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب سے برطانوی فوجوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔.....راستے میں بلوچستان تھا!!!!!۔

یہ گویا ''حملہ آور اور مزاحمت کار کے بطور'' بلوچ کے ساتھ انگریز کا اولین واسطہ ہوا۔ بلوچ کا ترپ کا پتہ ہمیشہ سے گوریلا جنگ رہی ہے۔ اور ''انگریز بلوچ'' تاریخ تو شاہد ہے کہ کچھی اور درہ بولان دو ایسے علاقے تھے جہاں بلوچوں نے انگریز سے اپنی خفگی کا اظہار تعداد میں سب سے زیادہ، اور شدت میں سب سے شدید، انداز میں کیا تھا اور اُسے خوب خوب نقصان پہنچایا۔ درّہ بولان ''جنگ جاہ'' بنا رہا۔

بولان استعاروں کی سرزمین ہے۔ یہ داستانوں، رومانوں اور مائتھالوجیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ فتوحات، نعروں، سیٹیوں، شکستوں، زخموں، آہوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ بولان شاعروں کا موضوع رہا۔ بولان اور گولان تک ایشیا کی سرخی کی تمناؤں پر مشتمل نعرے تو ہم خود لگایا کرتے تھے۔ بیورغ کی گراناز بولان، گل خان کی گھن گرج بھی بولان، سجاد ظہیر کی گھر اُداسی کا اظہار بھی بولان، توکلی مست کا راہگزر بھی بولان، اور عطا شاد کی ابریشمی نرمی کا اظہار یہ بھی بولان۔

یہ طویل درہ کولپور سے شروع ہوتا ہے اور رندلی تک جاتا ہے۔ (مقامی لوگ اس درہ کو ''خرلکائی کوتل'' کہتے ہیں)۔ اس کی کل لمبائی 45 میل ہے۔ یہاں راہداری کے ٹیکس رئیسانڑیں اور کُرد لیا کرتے تھے۔ یہی درہ بولان، سامراجیوں پر مری بلوچ قبیلہ کے حملوں اور اُن پر شب خون مارنے کے لیے ایک پسندیدہ جگہ تھی۔

بولان گریٹ گیم کی کامیابی ناکامی کا چیف جسٹس بھی تھا۔ بلوچ اور بین الاقوامی سیاست میں بولان کی اہمیت اس بات سے لگائی جاسکتی ہے کہ انگریز کے بقول، خان محراب خان :''.....نے اُس وقت ہماری فوج کی سپلائی منقطع کی جب ہماری فوج کابل جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو کیمپ لُوٹنے کا کہہ رکھا تھا''۔(4)۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب انگریز افغانستان پر قبضہ کرنے اپنی فوجیں بھیج رہا تھا۔ راستہ ظاہر ہے بلوچستان تھا، بولان تھا۔ سامراج دشمن محراب خان نے اِس سامراجی فوج کو یہیں پر تھکا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ افغانستان، ایران، اور وسطی ایشیا کی بڑی جنگ میں انگریزوں کی شکست تو گویا بلوچوں کے دل کی آرزو تھی کہ سامراج دشمنی بنی نوعِ انسان کا ایک مشترک جذبہ ہوتا ہے۔

چنانچہ انگریز فوج کندہار جاتے ہوئے جب درہ بولان سے گزر رہی تھی تو بلوچ عوام نے قدم قدم پہ اُسے مارا۔ سامراجی یلغار گر فوج پر بلوچوں نے جا بجا حملے کیے۔ بولان کے ہر موڑ پہ اُس کا سامان لوٹا، ضائع کردیا۔ اس کی رسد کاٹ دی، اس کے سپاہی مارے اور اس کو ہلکان کردیا۔

انگریز فوج کے جن افسروں نے بعد میں اپنی یادداشتیں لکھیں، انہوں نے تسلیم کیا کہ درہ بولان سے گزرتے وقت بلوچوں کے حملوں سے انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ درہ بولان کی ہر چٹان کے نیچے اور ہر ہر موڑ پر انگریز فوج کے سپاہیوں کی کٹی پھٹی اور پھولی ہوئی لاشیں پڑی نظر آتی تھیں، اُن کے مرے پڑے اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں سے راستہ اٹا پڑا تھا۔ کوئی بھی رات بلوچوں کے شب خونی حملوں سے خالی نہیں جاتی تھی۔ اس طرح ہزاروں جانیں کھوکر ہی انگریز فوج، بلوچستان سے گزر کر افغانستان میں داخل ہوسکی تھی۔(5).....

مگر، اُدھر 26 اپریل 1839 کو بغیر لڑائی کے قندہار قبضہ ہوگیا، جولائی 1839 میں غزنی پہ قبضہ کیا گیا اور بغیر کسی مزاحمت کے اگست 1839 کو کابل پر قبضہ ہوگیا۔

دوست محمد بخارا بھاگ گیا۔ چنانچہ انگریز نے بڑے آرام سے اپنے ''تھالی چٹ'' شجاع کو کابل کے تخت پر بٹادیا۔ مگر بکا ہوا شجاع کہاں عوام کو قابلِ قبول تھا۔ بکے ہوئے شجاع عوام کو کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوتے۔ ڈھائی سال تک ساری کوششوں کے باوجود برطانیہ کے اِس ایجنٹ کو عوام کے دل جیتنے میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ برطانیہ وہاں سے جنوری 1842 میں واپس ہوا۔ مگر، اُسے باسلامت واپسی بھی نصیب نہ ہوئی۔ جگہ جگہ اس پر حملے ہوتے رہے اور وہ ایک عبرتناک شکست سے دوچار ہوا۔

5-انگریز، بلوچ مزاحمت کا خالق

انگریز نے سوچا کہ اگر افغانستان میں کامیابی کے ساتھ ''اپنا آدمی'' تخت نشین کیا جاسکتا ہے تو یہی طریقہ بلوچستان پر کیوں نہیں دہرایا جاسکتا؟۔ اُسے تازہ تازہ اِس کا تجربہ بھی ہوچکا تھا۔ مگر، افغانستان کی طرف پیش قدمی کے دوران بلوچوں کا معاندانہ رویہ کھل کر سامنے آچکا تھا۔ اُسے یہ تجربہ بھی ہوچکا تھا کہ جب بلوچ اپنے پڑوسیوں کے معاملے میں انگریز کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ خود انگریز کے وفادار کیسے بنیں گے؟۔

اس لیے اس نے اپنے لیے تین فوری نوعیت کے کام متعین کرلیے:

* خان محراب خان کو گرانا
* مری قبیلے کو مارنا
* سامراج دشمن بجار خان ڈومبکی کو ہستی سے مٹانا۔

اور اِن سارے امور کی برآوری کے لیے پہلی چال یہ تھی کہ بلوچوں کے اندر گھسنے کا کوئی راستہ ڈھونڈا جائے۔ اور یہ راستہ تھا اُن سے مذاکرات کا ڈھونگ رچانا۔ تاکہ مذاکرات میں اُن کی جاسوسی بھی کی جائے اور اُن میں غدار بھی پیدا کیے جائیں۔

چنانچہ پہلا کام یہ کیا گیا کہ الیگزنڈر برنز کو مختلف رنگوں میں پوشے ہوئے پیسوں، لالچوں کے ہتھکنڈوں سے لیس کرکے کوئٹہ سے کلات روانہ کیا گیا۔ بلوچ تو مُچی ومرکہ و مذاکرات کی قوم ہے۔ اِس گفت وشنید والی قوم کے سربراہ محراب خان، اور سازش وکراہیت بھرے انگریز سامراج کے نمائندے برنز کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ راست و راستبازی تو مذاکرات کرتی ہے،

چنانچہ وہ مذاکرات کررہی تھی۔مگر انگریز تو شیطان تھا، اور شیطان اپنی کثیر جہتی ابلیسیت کے ہاتھوں مذاکرات کی آڑ میں اور ''بہت کچھ'' کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اُسی ''بہت کچھ'' میں لگا ہوا تھا۔ یہ جادوگر انگریز، دوستی کا معاہدہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ خان کے خلاف سازشیں بھی کررہا تھا۔ ان سازشوں کا شعبہ موہن لال کے پاس تھا جو خان کلات کے دربار میں ملاقات کے وقت برنز کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے درباریوں کو رشوت دے کر اُن میں اپنے ایجنٹ پیدا کر لیے ۔(6)۔تلخ معروض، تلخ فیصلے ہی کرواتا ہے۔ بلوچ کے لیے تلخ معروض کے ہاتھوں یہاں طے پانے والے، ''دوستی کے معاہدے'' کی موٹی موٹی باتیں یہ تھیں۔

1۔انگریز کو افغانستان جاتے وقت کچھی اور بولان کا راستہ استعمال کرنے کی اجازت ہے۔خانِ کلات انگریز فوج کے رسل ورسائل اور حمل ونقل کے سامان کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے۔

2۔انگریز فوج کے لیے سواری اور باربرداری کے جانوروں کا انتظام خان کلات کرے گا۔

3۔خان کلات میر محراب خان شالکوٹ میں شاہ شجاع الملک کا استقبال کرے گا اور اس کی اطاعت قبول کرے گا۔

4۔ان مندرجہ بالا خدمات کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی خانِ کلات کو، خان تسلیم کرے گی۔

5۔ایسٹ انڈیا کمپنی ہر سال ڈیڑھ لاکھ روپیہ امداد (سب سڈی) کے بطور خان کو دے گی۔

بلوچ کو تو پکا یقین تھا، البتہ انگریز بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ دھونس اور لالچ سے مسلط کردہ اس معاہدے پر نہ تو خان عمل کرے گا اور نہ ہی بلوچ اِسے مانیں گے۔

6-بجار خان ڈومبکی

19ویں صدی بلوچ قوم کے لیے بے رحم صدیوں کے آئندہ کے پورے سلسلے میں سے اولین صدی تھی۔اس لیے کہ ہم پہ انگریز نے حملہ کر دیا تھا۔ یہ صدی ممتاز ترین صدیوں میں بھی اولین تھی۔ اس لیے کہ انگریز بغیر مزاحمت کے ایک لمحہ بھی نہ رہا۔ اس صدی میں بلوچوں نے بلوچستان پہ بہت خون نچھاور کر دیا۔لہو کی یہ قربانی جبلی ہی نہیں شعوری بھی تھی۔

حملہ آور کو سلامت نہ جانے دینے والے ان بہادروں میں میر بجار خان (وزیرانڑیں)ڈومبکی بھی شامل تھا۔

1839ء کے زمانے میں ڈومبکی قبیلے کا سربراہ سردار بلوچ خان تھا۔ وہ ایک سادہ لوح اور امن پسند انسان تھا۔انگریز نے اُس سے دوستی کا ہاتھ کیا بڑھادیا کہ اُس نے پوری زندگی انگریز کی وفاداری میں گزار دی۔ اسی لیے میر بجار خان جیسے وطن پرست نوجوان اُس سے دل میں ناخوش تھے۔ چنانچہ فطری بات ہے کہ سارے قبیلے کی نگاہ ودل وروح سردار بلوچ خان کے بجائے میر بجار خان کی طرف تھیں اور تلوار کے دھنی ڈومبکی قبائل اُس کے اشارے پہ مرمٹنے پر کمربستہ تھے۔

1839ء میں جب انگریز فوج قندہار جاتے ہوئے ذبیحہ خانہ (کچھی) سے گزر رہی تھی تو بجار خان کے بہادر ساتھی، ایک اور سامراج دشمن ترک علی جکھرانڑیں کی سربراہی میں انگریز فوجوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ بجار خان نے خود کو انگریز قافلوں پر حملوں کے لیے گویا وقف کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سمیت قبضہ گروں کا راستہ اتنی بار لوٹا کہ دشمن کے حوصلے تقریباً تقریباً پست ہو چکے تھے۔اس میدانی علاقہ میں سے کسی فوجی قافلے کو خیریت سے پہنچانے کے لیے ایک پوری رجمنٹ چاہیے تھی۔ انگریز کے لیے یہ معاملہ اس لیے بہت سنجیدہ تھا کہ ان کی فوجوں کی رسد کا واحد راستہ یہی تھا۔

ایک انگریز افسر ایسٹ وک نے اپنی مشہور کتاب ''ڈرائی لیوز فرام ینگ ایجپٹ'' میں بجار خان کی جنگ کے بارے میں یہ دلچسپ قصہ بیان کیا: ''.....رات کے وقت بجار خان کے سرفروش، میر ترک علی جکھرانڑیں کی سربراہی میں برطانوی فوجوں پہ ٹوٹ پڑے اور انہیں لوٹ لیا۔وہ اُن کے اچھے بار بردار اونٹ بھی اور، نیز تیز رفتار اونٹ (مہری) بھی لے اڑے۔

دوسرے دن یہی جکھرانڑیں انگریز افسر مسٹر کین کے پاس آئے اور کہا: ''صاحب! اگر آپ کو اونٹ اور مہری چاہئیں تو ہمارے پاس ہیں، ہم بیچیں گے''..... افسر کین نے ہاں کردی اور جکھر انڑیوں نے اُسی سے چھینے ہوئے وہی اُونٹ اُسے فروخت کردیے۔ افسر کین نے ہنس کر کہا کہ ''یہ عجب سوداگری ہے کہ کل ہمارے اونٹ جکھر انڑیں چھین کر لے گئے اور آج ہم اپنے ہی اونٹوں کو خرید رہے ہیں''۔ (جی ہاں، افسر صاحب یہی معاملہ تو بلوچوں کے ساتھ بھی رہا۔ وہ اپنے وطن میں رہنے، چلنے پھرنے اور دفن ہونے کی اجازت، تم انگریز افسروں سے لینے پر مجبور کردیے گئے تھے۔ تمہارے ساتھ تو اور برا سلوک ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ تم قبضہ کرنے دوسرے کے وطن پر خون ریزی کررہے تھے)۔

آیئے ذرا نئی نسل کو ایک اور بات بھی بتادیں۔ انہیں جنگِ آزادی کے تصور تک سے شناسائی نہ رکھنے والے غیر بلوچ ''دانشور'' یہ بتاتے رہتے ہیں کہ جنگِ آزادی کے لڑنے والے گویا دولت، لوٹ مار، یا غنیمت کا مال اکٹھا کرنے کے لیے لڑتے ہیں۔ یہ گمراہ کن بات ہے، حقیر اور ہلکی بات ہے۔ جنگِ آزادی تو ایک مقدس انسانی عمل ہے۔ غلام، تو گدھا اور بیل اور گھوڑا ہوتا ہے، انسان کی تو سرشت میں آزادر ہنا لکھا ہوتا ہے۔

آیئے انگریز اور دوسرے سامراجیوں کی پیدا کردہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اِسی بڑی ہستی یعنی بجار خان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُسے انگریز کے سر چارلس نیپئر نے ایک قاصد کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ ''ہمارے خلاف جنگ بند کردو تو ہم تمہیں تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ دیں گے، نواب کا خطاب عطا کریں گے اور پلیجی سے لے کر بیگاری واہ کا سارا علاقہ بطور جاگیر دیں گے''۔

اُس بلوچ نے (اُس زمانے کے) تین ہزار روپوں، نوابی کے خطاب اور ہزاروں ایکڑ زمین کی پیشکش کو جس طرح لیا وہ ہر باضمیر انسان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس نے ایک ہی تاریخی جملے میں آزادی کا پورا فلسفہ بیان کرکے انگریز کے پیغام کا جواب دیا ''ایک بھوکا مگر آزاد شیر جنگل میں بہتر ہے بہ نسبت اُس لومڑی کے جو شاہی محل میں قید ہو''۔(7)۔ (افسوس بلوچ بچہ نصاب میں خالص اور سچے بجار خان کو نہیں پڑھ سکتا، اور سوالیہ نشانوں سے بھرے دُور دراز میسور کے ٹیپو سلطان اور کرنال کے لیاقت علی کو پڑھنے پہ مجبور ہے!)۔

بالادست کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لفظ ''آزاد'' ڈکشنریوں سے نکال دیا جائے۔ صرف ''پابند'' کا لفظ، باندی کا لفظ، غلام کا لفظ محتاج کا لفظ، ''ڈسپلن'' کا لفظ باقی رہے۔ سب کے پاؤں بندھے ہوئے ہوں..... چرند کے، پرند کے، حتیٰ کہ اشرف المخلوقات کے بھی۔ چنانچہ آزاد منش بلوچ کے پاؤں باندھنے میجر بلاّ مور کی سربراہی میں ایک انگریز فوج اکتوبر میں ڈومبکیوں کی طرف روانہ ہوئی۔ بجار خان کو خبر ہوگئی۔ وہ ساون کے سیاہ بادل کی طرح لپک کر پلیجی پہنچا اور اپنا سارا مال ومتاع اور گاؤں اپنے ہاتھوں سے نذرِ آتش کردیا۔ اپنا گھر بار جلانے کے بعد وہ لڑائی کے لیے اچھی جگہ پکڑنے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ پانچ میل شمال میں پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ اُدھر مالِ غنیمت کے لیے رال ٹپکاتا انگریز جب پلیجی پہنچا تو اُسے وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ ملا۔ کھاؤ جتنی راکھ کھا سکتے ہو، پھانکو جتنی مٹی پھانک سکتے ہو!!۔ مگر اسے اِس راکھ میں بلوچ کے پرعزم چہرے نظر آئے۔ انگریز سراسیمگی میں مدد کے لیے پکارا۔ تب بالائی سندھ سے لیفٹیننٹ امیؔل کی سربراہی میں 400 ''بلوچ لیویز سوار'' بلامور کی کمک کے لیے روانہ ہوگئے۔ بجار خان پہاڑ سے نکلا اور پلیجی پر واچڑو (ژالہ) بن کر ٹوٹ پڑا۔ امیؔل کی فوج کا صفایا کردیا۔ اس کے 25 آدمی مر گئے اور دوسروں نے ''دُڑکی'' لگائی۔ تب دم دستی امیؔل اور بلامور کی مدد کے لیے لیفٹیننٹ کلارک کی سربراہی میں ''پونا گھڑ سوار'' فوج روانہ کردی گئی۔

پہاڑ کے اس عظیم المرتبت مالک کے 50 ساتھی شہید ہوگئے اور گیارہ گرفتار۔ امیؔل اپنی فوجوں کے ساتھ شاہ پور لوٹا اور وہاں 250 ''سکّر ہندوستانی گُھڑ سوار'' فوج اس کی مدد کو آئی۔ اِس فوج کے ساتھ جنرل جیکب تھا۔ بجار خان ایک سوو طن پرستوں کے ساتھ اوچ آیا تو فرنگی نے

اوچ پر حملہ کر دیا۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ رات کی تاریکی نے جنگ رکوا دی۔ بجار خان پھر کوہ کے دامن میں تھا۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اور بہت سے فرنگی مرے۔ اس قہر و قیامت کے دوران جنرل جیکب راہ بھٹک گیا اور ڈومبکیوں کے نرغے میں آیا۔ جنگی اصولوں پہ سختی سے قائم بلوچوں نے اس جنگی قیدی کی جان بخش دی۔ (اس خوبصورت روایت کا نبھانا بلوچوں کو بہت مہنگا پڑا۔ جنرل جیکب کی جان بخشی ہوگئی۔ مگر انہی اشرف انسانی روایتوں کو قائم رکھنے کے لیے تو ساری جنگ تھی، ساری قربانیاں تھیں، ساری سامراج دشمنی تھی)۔ انسانی حسین روایتیں زندہ باد ہوں!۔

چارلس نیپئر نے بلوچوں کے چانڈیہ قبیلے کے سردار غیبی خان کو طلب کر کے کہا کہ اپنے قبیلے کے ساتھ بجار خان کی رکاوٹ بنو اور اسے گرفتار کر کے لاؤ۔ اس نے ایسا کرنے کا وچن دیا۔ فرنگی نے اُسے نوابی کا خطاب دیا اور ضلع لاڑکانہ میں تین لاکھ ایکڑ جاگیر بخش دی۔

مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ تالپر اور سندھ کے دوسرے بلوچ لڑے نہیں۔ سامراج ہو، اور عوام اس سے نہ لڑیں، یہ بھلا ممکن ہے؟۔

بہر حال، سارے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد 1845 میں چارلس نیپئر نے ڈومبکیوں کو فنا کرنے کی نیت سے ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ 15 جنوری 1845 کو جنرل جیکب کی سرکردگی میں اِن فوجوں نے شاہ پور کو گھیر لیا۔ یاد ہے نا، یہ وہی جیکب تھا جس کو بلوچوں نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ اس کی جان بخشی کی تھی؟۔ کتنا برا ہوتا ہے نیکی سے ناواقف کے ساتھ نیکی کرنا!!۔ مگر کیا کیا جائے، انسان تو اصول، رواج، قانون، آئین اور کنونشن کی پیروی کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتا تو بدتہذیب انگریز اور بلوچ میں فرق کیا رہ جاتا؟۔ اور اے بلوچ نوعمر! کتنا برا لگتا ہے آپ کو ایک ہی بات کا بار بار تجربہ کرتے رہنا۔ مگر یار! اچھی باتوں کو دوہراتے رہنا چاہیے۔ ہاں اگر اگلا دھوکے باز ہے تو بس اپنے اصولوں کو سختی سے برقرار رکھتے ہوئے خبردار رہنا، اُسے دھوکے کا موقع نہ دینا۔

اس مہم میں باسٹھ بلوچ پکڑ لیے گئے اور تین شہید کیے گئے۔ انگریز شاہ پور سے پلیجی پر حملہ آور ہوئے۔ جکھرانڑیں قبیلے کے سربراہ سردار دریا خان کی سرکردگی میں سات سو بہادر نوجوان سامنا کرنے نکلے۔ سخت لڑائی کے بعد بالآخر پلیجی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ پانچ فروری کو فرنگی نے پہاڑوں میں تعاقب جاری رکھا۔ بجار خان اُن پر حملہ آور ہوتا رہا۔ بہت سے انگریز مارے گئے۔ بجار خان کے بھی نمایاں ساتھی شہید ہوتے رہے۔ اس کے دو بھائی انگریزوں کے ہاتھ آئے اور وہ خود مزید اندر پہاڑوں میں گیا۔ آگے کئی برس کی جنگ اس کا مقدر بنی رہی اور ہر جنگی آرٹسٹ کی طرح موت اُس کے بھی تاک میں رہی۔

لیکن، جنگ کا پانسا تو کب کا پلٹ چکا تھا۔ یلغار گر کامیاب ہو چکا تھا۔ بلوچ کسی منظّم و مشترک انداز کی بجائے انفرادی، قبائلی مزاحمتیں کرتے کرتے ہلکان ہو چکا تھا۔ بجار خان کو وقت چاہیے تھا۔ اگر آپ خود ایک اچھا معروض پیدا نہ کر سکیں تو آپ کو دو قدم پیچھے ہو کر ایک اچھے معروض کی پیدائش کے لیے خود کو تیار کرنا ہوتا ہے۔ معمر بجار خان کی نگاہِ امید تالپور کے دربار پر پڑی۔ وہ ان کے دارالحکومت خیر پور چلا گیا۔ تالپور میر نے اپنے ''باہوٹ'' کو بلوچی رواج کے مطابق رکھا۔ بجار خان کافی عرصہ خیر پور میں رہا' اور پھر اپنے علاقہ آ گیا۔ وہاں چند سال زندہ رہا اور ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کر گیا۔ (8)۔

اُدھر، ہماری تسبیح کا ایک اور خوبصورت دانہ ٹوٹ گیا۔ نومبر 1839 میں مری قبیلے کا' کاہان فرنگی کے قبضے میں گیا۔ جنرل جیکب نے شیر بیگ کی مدد سے نفسک کا راستہ دریافت کیا۔ چنانچہ اس نے گیارہ فروری 1840 میں نفسک اور ساڑتاف سے ہوتے ہوئے اپنی توپیں سلامتی کے ساتھ پلیجی تک پہنچا دیں۔ لیکن بلوچ پہاڑ، دشمن کے لیے کبھی بھی شاہراہ نہیں بنے۔ جیکب بھی کوئی استثنا نہ تھا۔ وہ بھی آیا تو کب سلامت گیا؟۔ بلوچستان کے پہاڑوں کے اندر' حملہ آور کے خلاف مزاحمت میں اگر آدمی اور جانور نہ بھی لڑیں تو یہاں کی کانٹے دار جھاڑیاں اُن کی زندگی کی پتلونیں پھاڑ ڈالتی ہیں۔

اُدھر بگٹی بلوچوں کی سرکوبی کے لیے میجر بلامور کو مقرر کیا گیا جس نے خفیہ طور پر اور اچانک ڈیرہ بگٹی پر چڑھائی کر دی۔ بگٹی بھی بھیڑوں کا گلہ ثابت نہ ہوئے (وہ کب بھیڑوں کا گلہ ثابت ہوئے؟)۔ انہوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ مگر بہادری اور حب الوطنی کی جنگ کی کامیابی میں بہر حال ٹکنالوجی کا ایک رول ہوتا ہے۔ کمتر ٹکنالوجی تو انسانی اشرف و نازک جذبات کو زمیں بوس کرتی ہے۔ چنانچہ انگریز کا توپ خانہ کم ترقی یافتہ ٹکنالوجی والے بہادر و حب الوطن بلوچوں کو پچھاڑ گیا۔ میر بیورغ خان بگٹی قیدی بنا، اُسے گرفتار کر کے سندھ لے جایا گیا اور وہاں نظر بند کر لیا گیا۔ بلّا مور تین ماہ تک بگٹی علاقے کو تاخت و تاراج کرتا رہا۔ ہمارے بیورغ کو دو سال تک جلا وطنی میں رکھا گیا۔

7۔ لعل شہید

Laal Shaheed

(شہادت 13 نومبر 1839)

اُس زمانے، اور پھر بعد کے بلوچ شاعروں نے اپنے اِس بہادر، وطن پرست اور آزادی پسند بادشاہ کی توصیف و تعریف میں زبردست شاعری کی۔ خود دشمن بھی اس ''شاہِ بلوچاں'' کی توصیف کرتا رہا۔ الیگزنڈر برنز نے خان محراب خان کو غیر معمولی فراست والا اور دماغ کا طاقتور بادشاہ پایا، اور وہ کانفرنس کے دوران ''زندہ دل تعجب کے ساتھ برطانیہ، اُس کے اداروں، اور حکومت کی تعریف کر رہا تھا''۔ وہ شاہ شجاع کے طور طریقوں پہ اپنے اظہارِ ناراضگی میں بلند آواز تھا۔

اِس بلوچ سیاستدان نے کہا: ''شاہ شجاع کو دوبارہ تخت کے حصول کے لیے افغانوں پر بھروسہ کرنا چاہیے، جبکہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ زمین کے پھیلاؤ کی جدوجہد کر رہا ہے، جو کہ ایک ایسی توہین ہے جسے اُس کی قوم کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ کبھی کام نہ آئے گا۔ تم انگریز لوگ اپنی بھرپور فوجوں سے اُسے تخت پہ کچھ وقت تک تو رکھ سکو گے مگر جونہی تم لوگ وہ ملک چھوڑ دو گے، تمہارے شاہ شجاع کو اُس کی سرحدوں سے پرے دھکیلا جائے گا۔ وہ قومی اور مذہبی دشمنی کے طوفان سے کبھی بھی مزاحمت کے قابل نہ ہوگا، جو کہ پہلے ہی افغانوں کے دلوں میں اُس کے خلاف بلند کھڑی ہے''۔(9)۔

ہم ذکر کر چکے کہ 1839 میں انگریزوں نے بلوچستان پر مکمل قبضے کا خواب دیکھا۔ شال کوٹ (کوئٹہ) میں انگریز افسر کو ہدایت ملی کہ کلات پر حملہ کر کے نوری نصیر خان کے پوتے خان محراب خان کا تختہ الٹا جائے۔ (محراب خان اور نصیر خان دونوں بڑے انسان تھے۔ ایک نے چاہ بہار سے لے کر جیکب آباد، اور ہڑند تک بلوچ قوم کو یکجا کر کے ایک سلطنت قائم کی۔ جبکہ دوسرا اِس سلطنت کو سات سمندر پار سے آنے والے حملہ آور انگریز سے بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر گیا۔ ایک نے زندہ رہ کر تاریخ لکھوادی، دوسرے نے سر دے کر تاریخ لکھ دی۔ ایک نے خود کو نوری کہلوایا، دوسرا تا ابد قوم کا چراغ و نورِ راہ بنا)۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ محراب خان پہلے ہی سے انگریزوں کی پیدا کردہ قبائلی خانہ

جنگیوں، سازشوں اور جھگڑوں میں گردن گردن پھنسا ہوا تھا۔ بولان پہ انگریز کو اُس کے مال ومتاع سے بار بار گنجا کرنے اور اُس پہ کمر توڑ حملوں نے تو سمجھو انگریز کو باولا کر دیا۔ بلوچ اونٹوں کے اُس کے گلے کے گلے لے اُڑتے تھے، بولان کے پہاڑوں سے نیچے گزرتے انگریز فوجوں پر پتھر لڑھکاتے جاتے تھے، پانی کے سرچشمے بلاک کرتے جاتے اور کچھ کنوؤں کو تو جان بوجھ کر آلودہ کرلیا جاتا تھا .....انگریز حملہ آور تو بہ پڑھنے تک پہنچے ہوئے تھے۔

انگریز نے محراب خان تو ایک اہانت آمیز خط کے ذریعے کوئٹہ طلب کرلیا۔

شیر دل وسخن دان وسخن پال، خان محراب خان کو، جب پولیٹیکل افسر کا وہ خط ملا تو وہ تو اس کی بے باکی پہ حیران ہوا۔ ایک شیطان صورت دغاباز لٹیرا اپنے نحوست بھرے در پہ بلوچوں کے سفید ریش کو سبک سر ہوکر جھک جانے کی آس بھی کیسے کرسکتا تھا؟۔۔۔محراب خان نے ایک پکے سامراج دشمن کے بطور ایک مدبرانہ مگر تلخ جواب لکھ بھیجا۔ وطن سے عشق تو ساری شجاعت کی ابتدا ہوتی ہے۔

انگریز کا مغالطہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ وہ تو بقیہ برصغیر کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ یہ بلوچ لہجہ تو اُس کے لیے بہت ہی نامانوس وناخوشگوار تھا۔ زور آور کو کمزور کی طرف سے حکم عدولی تو کیا، تعمیل میں پس وپیش بھی گوارا نہیں ہوتی۔ اور یہاں تو بلوچ نے اس کی ''اعلیٰ حضرتی'' اُس کے منہ پر دے ماری تھی۔ انگریز نے یہ تلخ جواب پا کر اُس بڑے انسان پہ دو الزام لگائے:

ایک یہ کہ خان محراب خانِ عالیشان سے ملاقات کے وقت الیگزنڈر برنز کی بے عزتی ہوئی تھی۔

دوسرا یہ کہ، برنز کا وہ بکس جس میں خانِ کلات کے ساتھ معاہدہ کی کاپی تھی، دو ہزار روپے کے ساتھ لوٹ لیا گیا تھا، اُس میں بھی خان کا ہاتھ تھا۔

آخر 4 نومبر 1839 کو فرنگی فوجیں اپنی ناترس سیاہ دہن توپیں لے کر گولے برسانے کلات کی طرف روانہ ہوئیں۔ کلات پہ حملہ آور فوج کے ساتھ 65 فرنگی اور 12 ہندوستانی افسر شامل تھے۔

وطن پہ عاشق، سامراج دشمن، اور دلیر شہریار میر محراب خان نے جب سرداروں سے ملکِ بلوچستان کے دفاع کے لیے مدد کی جھولی پھیلائی تو انہوں نے آنکھیں دز دیدہ کیے انکار کردیا۔ ایک سردار کے پاس تو میر نے اپنی بیٹی کو مدد طلب کرنے بھیجا' مگر مدد نہ ملی۔

مدد تو چھوڑیے، وہ اگر غیر جانبدار رہتے بھی تو غنیمت تھی۔ سرداروں نے وطن فروشی کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ انہوں نے تو حتیٰ کہ راستے میں ہر جگہ انگریز جرنیل، ولشائر کا خیر مقدم کیا اور اس کی فوجوں کو اناج اور چارے کے علاوہ اونٹ اور گھوڑے فراہم کیے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا جب کلات کا محاصرہ ہوا۔ توپوں کے ذریعے شہر اور قلعے پر شدید گولہ باری شروع ہوئی۔ توپیں کیا تھیں اژدھے کی پھنکا تھیں، آتش وانگار پھینکنے کی راکھشس تھیں۔ ہر چیز کو جلاتی توڑتی غراتی بلائیں تھیں۔ محشر کی گرمی برپا کرتی توپیں۔ توپیں جو بلوچ روایتوں سے ناواقف تھیں، توپیں جو قہرِ الٰہی تھیں۔ توپیں جو نہ تو دشمن کو پہلے سے خبردار ہونے کا بلوچ رواج پورا کررہی تھیں، نہ وار کرنے میں دشمن کو بھی موقع دینے کی روایت سے آگاہ تھیں۔ توپیں جو گناہ و بے گناہ، مرد وزن، کم سن و بزرگ سن کا خیال نہ رکھ رہی تھیں۔ توپیں جو مسجد و قرآن نہ دیکھتیں، جو قبرستان، پیرخانہ اور مندر کا لحاظ نہیں رکھتی تھیں۔ ہر طرح کی روایت، رواج اور اخلاقیات سے بے نصیب فرنگی فوج کی تینوں رجمنٹیں میری (قلعہ) کی بلندیوں پہ چڑھ دوڑیں۔ میجر پینی کوئک نے کندھاری دروازہ پہ حملہ کیا۔ جنرل ولشائر نے بقیہ فوج کے ساتھ میری کے شمالی دروازے پر حملہ کردیا۔

بلوچ کس طرح لڑے، آؤ ہم دشمن کمانڈر ولشائر کی زبانی سنتے ہیں: ''دشمن (بلوچ) قدم قدم پر نہایت بہادری، استقامت، اور جوش کے ساتھ لڑتا رہا، دشمن نے قلعہ کے اندرونی حصہ تک اِسی طرح مقابلہ کیا اور زمین کے ایک ایک انچ کے لیے لڑا.....قلعہ کلات کی حفاظت، غزنی کے مقابلے میں زیادہ مضبوط طریقے پر کی گئی تھی۔ اِس بہادر قلعہ میں محصورین اور لڑاکوؤں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی۔ میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہماری طرف مرنے

والوں اور زخمیوں کی تعداد شدید تھی''۔

بالآخر انگریز توپوں نے قلعہ کلات کی فصیلیں ڈھادیں، اور در و دیوار پہاڑ ڈالے۔ انگریز فوج کو خان کے دربار میں موجود جاسوسوں نے قلعہ کے خفیہ راستے بتائے(10)۔

سنگ وخشت و گِل کا بنا بلند حصارِ قلعہ ٹوٹ گیا تو بھی ہمارے اوسان خطا نہ ہوئے۔ جنگ سے پہلے شکست قبول کرنے سے نا آشنا بلوچوں کے بادشاہ، میر محراب خان اور اس کے نجیب ساتھیوں نے تلواروں سے دوبدو جنگ شروع کردی۔ گرتے پڑتے، گرد و غبار کی تاریکی میں سے راستہ بناتے، نعروں پھنکاروں میں راہ تلاشتے بلوچ قوم کے برگزیدہ بیٹے اپنے سروں پہ کھیلنے کا واحد بچا راستہ اختیار کر گئے۔ پُرشان و پرجوش و پُرتوکل وطن دوست بلوچ، اپنی تلواروں ڈھالوں کو جھٹکوں میں چلاتے اپنے کمانڈر محراب سِچار و مہتر کی سُنت میں انگریز پر گردن بُر، وار کرنے لگے۔ پیچھے ہٹنا طبعی ہو نہ ہو روحانی موت تو یقیناً تھی۔ وطن پرست بلوچ اپنے سر دیتے رہے، عدو کے سروں کی فصل کاٹتے رہے۔

''میر محراب خان نے اپنے 700 مجاہدوں کی کمان کرتے ہوئے تلوارِ برہنہ کے ساتھ ایک دلیرانہ مزاحمت پیش کی۔ ایسی مدافعت جہاں کو ھیں کلات اپنے مالکوں کی وفات پہ شرمسارنہ ہو۔ تیغ و خنجر نیاموں سے کب کے آزاد ہو چکے تھے، زرہ اور خود آزادانہ کام کر رہے تھے۔ لاشیں گرتی رہیں، گردنیں کٹتی رہیں، کلمہ کا ورد ہوتا رہا، داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے رہے ہمت و بہادری ابھارنے کے لیے محبوباؤں کو یاد کر کے حملہ کرنے کی تدبیریں ہوئیں.....اور 13 نومبر 1839 کو دوپہر کے وقت بلوچوں کی سب سے مضبوط گردن ڈھل گئی۔ خان محراب خان تلوار ہاتھ میں لیے شہید ہو گیا''۔(11)۔

یہ پیراگراف پڑھنے والا بلوچ! ذرا فخر سے، اپنی گردن تان لو۔ اس لیے کہ تمہارے اسلاف کے سرتاج، محراب خان شہید کے پاک جسم پر زخموں کے 39 شان و عظمت کے ایوارڈز تھے۔ ایک انگریز افسر' خان کی حب الوطنی کے نرغے میں آچکا تھا، محراب خان نے اس کا

سامراجی سر، ہمارے پاک وطن کی خاک میں غرق کرنے کے لیے اپنی تلوار بلند کی کہ جنرل دلشائر نے دیکھ لیا اور پستول سے فائر کر دیا۔ دیوشان ننگ کا پاسدار، اور پہلے ہی زخموں سے چور چور امیر محراب خان ماں وطن پہ گر پڑا۔ اُس سر پر بلاؤں کے ہزاروں طوفان ٹوٹے تھے مگر اُسے جھکا نہ سکے۔ زمانے کے سب سے بڑے طوفان و چیلنج (انگریز) کے سامنے بھی اُس کی سونتی ہوئی تلوار میان میں نہ تھی اور وہ شہادت کا احمریں لباس پہن کر اپنے دیگر دائمی زندہ شہیدوں کی لاشوں میں شامل ہوا۔

اُس روز شہید ہونے والے ہمارے اسلاف میں مندرجہ ذیل متبرک اور بھاری نام شامل ہیں:

عبدالکریم رئیسانڑیں برادر سردار اسد خان رئیسانڑیں، سردار ولی محمد شاہی زئی مینگل (ماموں امیر محراب خان شہید)، میر تاج محمد شاہی زئی مینگل (خالہ زاد بھائی میر محراب خان)، میر محمد علی شاہی زئی مینگل، میر پزل محمد (محمد فاضل) برادر سردار محمد خان لہڑی، سردار زمان خان پندرانڑیں، میر داد کریم چندوزئی شاہوانڑیں، میر شہباز خان نیچاری، میر بدل خان برادر سردار شہباز خان نیچاری، خان محمد دیہوار اربابِ شہر کلات، میر نبی بخش جتوئی علاقہ نرمک کلات، میر قیصر خان بزنجو' میر شاہ دوست بزنجو، محمد رضا وزیر خیل، نور محمد شاہی ولد بولات سگار سرمستانی انچارج اسلحہ خانہ' تاج محمد شاغاسی، دیوان بچا مل وزیرِ مال، دیوان کھیم چند، دیوان آسرداس مکھی ہندو پنچائیت کلات(12)۔ ان کے علاوہ 400 دیگر بلوچوں نے جام شہادت نوش کیا۔(13)۔ دیگر زعما جن کے نام تحریر نہیں کیے گئے ہیں وہ قبیلہ مینگل، زہری، محمد حسنی، شاہوانڑیں، بنگل زئی، قلندرانڑیں، گرگناڑی، سالانڑیں، میروانڑیں اور قبیلہ کمبرانڑیں سے تعلق رکھتے تھے۔

انگریز افواج کے 32 آدمی ہلاک ہو گئے جن میں لیفٹیننٹ گریوٹ بھی شامل تھا۔ اُس کے 107 آدمی زخمی ہوئے جن میں سے 37 بعد میں مر گئے(14)۔ اوسط دیکھیے تو اس لڑائی میں شامل

انگریز فوج کا ہر چھٹا شخص مارا گیا۔ہم نے کب غنیم کو سلامت جانے دیا!۔

محرابِ حق، باطل شکن، محراب خان کو عمیق احترام سے بلوچستان میں ''لعل شہید'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اُس سے بلوچ عوام کو وہی محبت و تکریم ہے جو دنیا بھر میں عوام اور وطن کی سلامتی کی راہ میں قربان شدہ شہداء کی ہوتی ہے۔

محراب خان، پہلے بھی ایک عام شخص نہ تھا۔وہ تو کلات کا، پورے بلوچ سماج کا خان اور حکمران تھا۔اس نے سر دے دیا ننگ نہ دی۔اس نے لمبے چوڑے فلسفے کو اپنے مقدس جسم پر محض ایک گولی کھا کر بیان کر دیا۔وہ شہید ہو کر جدوجہد، مدافعت اور مزاحمت کا ایک نمونہ، ایک سمبل بن گیا تھا۔وہ بلوچوں کے لیے ایک حسرت، ایک پشیمانی بن گیا۔وہ ایک ارادہ، ایک عزم اور ایک قول میں ڈھل گیا۔محراب خان کی شہادت بلوچوں کے لیے بے بسی کا ماتم بن گئی، غصہ اور غضب کا سبب، اور کچھ کر گزرنے کا موجب۔

محراب خان ''لعل شہید'' بنا۔شہیدوں میں سے لعل و موتی۔ایک عام ہیرو بھی ہمارے روزمرہ محاوروں کا حصہ بن جاتا ہے یہ تو ہیروؤں کا ہیرو ہے۔اس لیے بلوچ اپنی سچائی کی قسم اُسی کے نام کی کھاتے ہیں۔عزم کی مضبوطی کے لیے کہے گئے فقرے میں اس کا نام شامل کرتے ہیں۔راہِ حق کی تمثیل کے لیے ''لعل شہید'' کہہ دیتے ہیں۔محراب خان ہماری غزل کا مقطع بنا۔وہ ہماری جدوجہد کا مینی فیسٹو بنا، حکمتِ عملی ہوا۔اور اسی کی جیسی موت ہماری تمنا اور دعا بن گئی۔وہ ہماری نئی پود کے تازہ دم ولولوں کے لیے زندگی کا سبب بن گیا۔وہ اُس نئی پود کی پیشانیوں پہ شفق بن کر دمکتا ہے جو اپنی مادر وطن کو کرشموں کی کرنوں سے نہلائیں گے۔.....اس سارے منظر نامے کو ''حیاتِ جاوداں'' کہتے ہیں۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری یہ ساری تاریخ انگریز کی لکھی ہوئی ہے، تو ان کا خیال درست نہیں۔بہت مضبوط بلوچ ورژن موجود ہے۔ہم شاعری کی صورت اپنے بہادروں کے رقصِ مزاحمت کے ایک ایک قدم بیان کرتے چلے آئے۔اس کربلا نامہ کے بارے میں گدّ ومری

کی پاک شاعری موجود ہے۔اگر ہم اُس کی شاعری میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اُس کا سیاسی شعور اس قدر بالغ تھا کہ وہ سامراج اور سامراجیت کی اصل بنیادوں کو بھی جانتا تھا۔وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ برطانوی سامراج، کلات کا خزانہ اونٹوں پر لاد کر کلکتہ شہر لے گیا۔

کلات پر انگریزی یلغار کے وقت محراب خان کا بیٹا اور ولی عہد میر نصیر خان شہر میں موجود نہ تھا۔وہ شہر و قصبہ سے نکل گیا اور بلوچوں کی روایتی مزاحمتی گوریلا جنگ کے لیے پہاڑوں کی امانت بنا۔انگریز نے محبت خان کے پڑپوتے اور احمد یار خان کے ٹین ایجر (14 سالہ) بیٹے، اور اپنے پروردہ شہنواز کو خان کو تخت پر بٹھا دیا۔اور لبدین (لَوڈے Loveday) نامی انگریز افسر کو اُس کا مشیر بنا کر کلات میں متعین کر دیا۔تب انگریز نے بلوچستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے شروع کر دیے۔کوئٹہ اور مستنگ کو بلوچوں سے کاٹ کر انہیں نکیل شدہ ''شاہ'' شجاع کے ''حوالے'' کیا ۔اور کچھی کو سندھ کے حکمرانوں کے اونٹوں کی قطار میں آخری اونٹ کی دُم سے باندھ دیا۔

میسن نے انگریزوں کی طرف سے سازش و انتقام کے اس عمل کے حاصلات کو یوں بیان کیا:

1۔کلات کا شہر تباہ کیا گیا۔جہاں ایک تہائی گھر اور تقریباً تمام دکانیں ہندو سوداگروں کی تھیں۔اُس کا اہم بازار غیر اہم ہو گیا اس لیے کہ کوئی کاروان، راہزن قبائل کے ڈر کی وجہ سے کلات کی طرف جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔

2۔خان کی طرف قبائلی فرمانبرداری ختم ہو گئی۔

3۔قبائل مسلسل ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور خان کے اقتدار کے ہر دعوے کی مخالفت کر رہے تھے۔

4- ملک کی معیشت جامد ہو گئی۔

5۔انفرادی قبائل ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔

8-ساڑتافہ جنگ

Saarhthaff War

(16 مئی 1840)

بلوچ سلطنت تباہ ہوگئی تھی۔ بلوچ کی مرکزیت کاٹ دی گئی تھی، اسے ''شجاعائز'' کر دیا گیا تھا اور محراب خان کے بجائے اپنے پٹھو کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ انگریز مطمئن کہ حکام بالا تک اچھی رپورٹیں جائیں گی۔ مگر اُس غاصب کو اندازہ نہ تھا بلوچ کو اپنے بادشاہ اور اُس کے ساتھیوں کا ذبیحہ ایک تلخ یاد کے بطور ہمہ وقت ڈنگ مارتا رہے گا۔ سُبکی سے ریش ریش روح، احساسِ زیاں سے پھڑکتے عضلات، اور غصہ سے بپھری قوم۔ آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی ہم محراب اور بچامل کو نہ بھولے!۔

مری بگٹی پہاڑ کے قبیلے، کچھی کے میدان اور سراوان سے جھلاوان تک پورا وطن اب انگریز کے خلاف کھلی دشمنی پر آیا۔ اس سارے پس منظر میں انگریز کی جانب سے اپریل 1840 میں کاہان پر مستقل قبضہ کا فیصلہ ہوا۔ یعنی اب باری پہاڑ کے قبائل کی تھی۔ مری اور بگٹی کی، سب سے متحرک، آبادی میں سب سے بڑے، اور جغرافیائی طور پر بہت ہی سٹریٹجک بلوچ قبیلوں کی۔ غاصبانہ ارادوں سے قندہار جانے والی انگریز فوجوں کی رسد کاٹنے کی حرکت انگریز کہاں معاف کرسکتا تھا؟۔ لہذا مری قبیلے کو بھی اپنے کیے کی سزا ملنی تھی۔ نیز، ان قبیلوں کو مجبور کرنا تھا کہ وہ کوّے کو شاہین مان لیں شاہنواز و شجاع کی حکمرانی تسلیم کریں۔ احمق سامراج ایک بار پھر بلاوجہ بڑی بلاؤں کو جگا رہا تھا۔

چنانچہ مشرق کے دو بڑے قبیلوں کو ''پالتو'' بنانے کے لیے میجر تھامس رچرڈ بلاؔ مور کی قیادت میں فوجیں روانہ کی گئیں۔ اس فوج کو آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ خود بلامور کے زیرِ کمان ڈیرہ بگٹی کی طرف روانہ ہوا، اور دوسرا حصہ کپتان ریٹ کی قیادت میں کاہان فتح کرنے چل پڑا۔

بگٹیوں کی طرف سے ایک گھمسان، خون آشام اور ناترس جنگ کے بعد ڈیرہ بگٹی پر قبضہ کیا گیا۔ البتہ مری نے دوسرا جادو کر دکھایا۔ سردار دودا خان اپنے خاندان اور پورے قبیلے سمیت کاہان خالی کر گیا۔ اب قبضہ بھلا کیا کرنا تھا۔

لیکن انگریز احمق پھر بھی نہیں سمجھا۔ اس نے بہرحال مری قبیلہ کے ہیڈکوارٹر، کاہان پر قبضہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ یوں، کلات قبضہ کے چند ماہ بعد اپریل کے پہلے ہفتے میں کپتان لیوس براؤن پلیجی کے مقام پر جمع شدہ فوجوں کو کاہان تک کمان کرنے سکھر سے چل پڑا۔ ایک اور دستہ لیفٹیننٹ والیول کلارک کی سربراہی میں بھی۔ ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ کیا دوزخی گرمی ہوگی۔ انگریز افسر ایسٹ وِک کے بقول ''یہ گرمی کسی کے سر کو بھی پگھلا دیتی ہے خواہ وہ سر لوہے کا بنا ہوا ہو یا گرینائیٹ کا''۔(15)۔

براؤن بار بردار اونٹوں کی کمی کی وجہ سے تین ہفتہ تک پلیجی میں رکا رہا۔ اُس کو مہیا کردہ دستے کی تفصیل یوں تھی: 300 انفنٹری، 50 اریگولر ہارس، 50 پٹھان گھڑسوار۔

منصوبہ یہ تھا کہ 600 اونٹوں پر چار ماہ کا راشن لے کر کاہان جایا جائے گا۔ اور پھر ''حلوہ'' کاہان کو فتح کرنے کے بعد لیفٹیننٹ کلارک نامی متکبر شخص 80 پیدل اور پچاس گھڑسواروں کی حفاظت میں خالی اونٹ واپس لائے گا، اور مزید چار ماہ کا راشن لے کر پھر کاہان جائے گا۔ انگریز پاگل تھا کہ اُس نے نہ ''اگر'' کیا نہ ''مگر''، نہ ''انشاءاللہ'' بولا، نہ ''خدا نے چاہا تو'' کہا۔ اِس قدر خرمستی کہ اس کا کامن سنس تک گھاس چرنے گیا تھا۔

چنانچہ، دو مئی کو مرگ کے حوالے ہونے والی یہ انگریز فوج روانہ ہوگئی۔ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ دوزخ کی طرح جلتے ہوئے مئی میں 600 اونٹوں پہ مشتمل لمبی قطار کا روان کا حشر کیا ہوگا۔ اگر وطن پہ مرمٹنے والے بلوچ نہ بھی لڑتے تب بھی اس قافلے میں سے کچھ کو پیاس نے مار دینا تھا،

کچھ کولُو نے، کچھ کو sun stroke نے، کچھ کو سیلاب نے، کچھ کو سانپ نے، اور کچھ کو ملیریا نے .....بلوچستان نے اپنے دفاع کے بہت سارے انتظامات کر رکھے ہوتے ہیں!!۔

بے خبر انگریز کے لیے یہ خوش گوار حیرت تھی کہ ایک آدھ چھوٹی موٹی جھڑپ کے ماسوا کوئی بڑی لڑائی نہ ہوئی۔ کوئی مزاحمت، کوئی بڑی جنگ نہ ہوئی اور یوں بالکل خیر خیریت کے ساتھ دو مئی کو روانہ شدہ یہ فوج ساڑتاف ونفسک کے دشوار گزار راستے سے دس دن میں کاہان پہنچی۔ 12 مئی 1840 کو۔

.....اور کاہان انہیں خالی ملا۔ مری سے بڑا جنگی حکمتِ عملی کا ماہر آپ کو خطے میں نہیں ملے گا۔ آزادی پسند عوام سامراج کے تربیت یافتہ سپاہ سے کئی گناہ زیادہ سٹریٹجسٹ ہوتے ہیں۔ مٹی کی پتلی پتلی دیواروں والا کاہان خالی کر دیا گیا تھا، اس کے گیٹ اتار کر دور فصلوں کے اندر چھپا دیے گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ پکی ہوئی گندم کی کھڑی فصل محض معمولی مقدار میں انگریز کے ہاتھ لگی، اس لیے کہ بقیہ کو بلوچوں نے آگ لگا دی تھی۔ جی، اپنی فصلوں کو خود آگ لگا دی۔ (اور ایسا دو سو سال قبل 1840 میں ہوا تھا)۔ طاقت و غرور سے سرشار انگریز قلعہ کے گرد خندق کھودنے اور قبضہ کردہ کاہان کے دفاع کو یقینی بنانے میں لگ گیا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ پلیجی سے کاہان روانگی کے وقت انگریز افسر کلارک، نے ڈینگ ماری تھی کہ: ''میں کاہان جا رہا ہوں۔ اگر دودا (سردار مری) میں مجھ پر حملہ کرنے کی ہمت ہے تو آ جائے''۔ (پتہ نہیں، یہ سارے حملہ آور بازاری زبان کیوں استعمال کرتے ہیں!!)۔ کسی غیر کے خلاف اپنے وطن، اپنی آن اور وقار کی حفاظت ویسے ہی ارفع انسانی فریضہ ہوتا ہے۔ مگر لڑائی شروع ہونے سے قبل، شکست دینے سے پہلے، اور غلام بنانے سے قبل، بازاری زبان استعمال کر کے انگریز افسر نے مری کو اشتعال دلایا۔ بلوچ ''لفظ'' کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ ہلکی زبان کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ جو سارتر نے کہا تھا ناں کہ: ''الفاظ، بھری ہوئی بندوقیں ہوتے ہیں''۔ اور گرامر سکولوں میں پڑھا کلارک، یہ بندوق چلا بھی چکا تھا۔

اُس کے جواب میں مری نے کوئی نیچ زبان استعمال نہ کی۔ حملہ آور کا استقبال بہت خاموش شان سے کیا گیا۔ اُسے کوئی طعنہ نہ دیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس، گدّو مری کی زبانی اپنے دشمن انگریز کی بہادری کی تعریف کی گئی۔

اسی طرح دشمن کے اسلحہ کی تفصیل و تعریف بھی کی گئی۔ اس میں بڑی سنجیدہ اور متین اور سنگین زبان استعمال کی گئی اور ہمیں کوئی بڑائی اور تکبر اور دکھاوے کی بات نہیں ملے گی۔ زبان بہت سنبھال کر محتاط اور شائستہ انداز میں استعمال کرنی چاہیے۔

اپنا اپنا کلچر ہوتا ہے، اپنی اپنی تمدنی روایات ہوتی ہیں۔ لٹیرا ہمیشہ طور اطوار میں ہلکا پن دکھا جاتا ہے۔ جبکہ برحق فریق ہمیشہ بردباری بھری مدافعت دکھاتا ہے۔ کوئی گالی گلوچ نہیں، کوئی ہلکا پن نہیں۔ آپ گدو کے اشعار میں بلوچوں کا ٹھہراؤ بھرا اور سنگین و شائستہ رویہ ضرور دیکھ لیں۔

بہرحال، کاہان میں خوب ستانے کے بعد بھی مری کی طرف سے گہری خاموشی تھی۔ جب انگریز جانوروں اور آدمیوں کی تھکاوٹ اچھی طرح دور ہوئی تو حسبِ پروگرام کلارک کی واپسی کا پروگرام بنا۔ چنانچہ، پانچ دن بعد 16 مئی کو وہ 700 خالی اونٹ لے کر کاہان سے واپس روانہ ہوا تاکہ مزید راشن اور رسد کاہان پہنچاتا رہے۔ جب وہ نفسک کے درے پر پہنچا تو اپنی دوربینوں اور اوزاروں سے پورے علاقے کو خوب کھنگال کر دیکھا۔ اُسے ہر طرف خیر خیریت نظر آئی۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ نہ جنگ نہ جنگ کی تیاری۔ یہاں کہیں بھی بلوچ نہ تھے۔

انگریز افسر کا دل قہقہے لگانے لگا۔ وہ بلوچ (مری) کی جانب سے ایسی بزدلی کا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فتح کا سرور ویسے بھی بہت بدبخت ہوتا ہے، سر چڑھ کر بولتا ہے اور کامن سینس کا بیڑہ غرق کر دیتا ہے۔ اور اِدھر مری تو دوربینوں میں بھی نیست و نابود تھا۔ خوب تسلی کر کے کلارک نے اپنے ساتھ کسی بھی حفاظتی دستے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چنانچہ اُس نے ایک صوبے دار، 5 حوالدار اور 50 جوانوں کو واپس کاہان بھیج دیا۔.....

مگر صرف مری جانتے تھے یا اُن کا سنجیدہ خدا، کہ اُن لوگوں کو نہ کبھی واپس کاہان پہنچنا تھا، نہ

ہی آگے شکار پور جانا تھا اور نہ اِن کی لاشیں ملنی تھیں۔ ارے مری جو یہ طے کر چکا تھا، بس۔ بے کراں خاموشی میں مری قبیلہ ملک الموت بن چکا تھا۔ پہاڑ جیسے آغوشِ مادر میں چُھپا مری قبیلہ پتہ نہیں کہاں سے اچانک نکلا اور کمال خاموشی کے ساتھ مطمئن و بے خبر دشمن کا ذبیحہ شروع کر دیا۔ بس ایک آدمی زندہ چھوڑ دیا کہ جا کر اپنے افسروں کو اپنی تباہی کی خبر سنائے۔ باقیوں کو سامراج دشمن تلواروں نے ''چُر'' لیا۔

کلارک پیچھے اپنے آدمیوں کے اِس سارے ذبیحے سے بے خبر، اپنی مستی اور دھن میں مگن چلتا رہا۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے اس مرگِ انبوہ کا پتہ تک نہ چلا۔ وہ اپنے زعم میں چلتا رہا اور بلوچوں کے بھگوڑے ہونے پر نازاں ہر طرح کے حفاظتی اقدامات سے بے پرواہ رہا۔ اسے کیا پتہ کہ دو ہزار مری اُس کی بھی آنتڑیاں نکالنے کہیں نہ کہیں چھپے بیٹھے ہیں، ایسے کہ نہ چھینک نہ کھانسی۔ وہ موت کی سی خاموشی میں، ہم رنگِ کوہ بن کر یوں اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے جیسے ہمارے کندھوں پہ بن محسوس کیے فرشتے۔

.....اور پھر جیسے جادو ہو گیا ہو، جیسے اچانک پہاڑ نے قے کر کے انسان اگلنے شروع کر دیے ہوں.....مری نازل ہو گئے۔ نہ بچا صوبیدار اور نہ کلارک خود۔ وطن دوستی اور آزادی پسندی نے سامراجی عزائم کی آنکھیں نکال دیں۔ راشن و گولہ بارود اور خیموں سمیت 700 اونٹ مری لے گئے۔ 80 پیدل، 50 گھڑ سوار، اور اُن کا لیڈر کلارک بلوچستان کے پہاڑ کا ناشتہ بنے۔ مری کا سجی خوری کا جیب میں رکھا چاقو آج دھرتی کے سب سے بڑے تکبر کا گلا کاٹ رہا تھا۔ اور سندھ و ہند کے لاشریک مالک انگریز کے لیے کچھ نہ بچا.....ایسا ہوا ساڑتاف کی چوٹی پر!!۔

انگریز کے اس عظیم ترین نقصان کا اس پس منظر میں جائزہ لیجیے کہ جب سے اُس نے دریائے سندھ عبور کیا تھا، یہ اس کی اولین عبرت ناک شکست تھی۔ غروری مونچھیں خاک ہو گئی تھیں، وطن پالی کا سر بلند ہو گیا تھا اور کوہستان کے اس عزم کی تصدیق ہو گئی کہ اُس پہ قبضہ کے ارادے سے آنے والا ہر غنیم اپنے نرخرے کو داؤ پر لگا کر آئے۔

9 - نَفُسک ءَ جنگ

NafuskWar

(31 اگست 1840)

آیئے واپس کاہان کو دیکھتے ہیں۔ کاہان، مری کے درویش سردار، دودا خان کی شہزادی جیسی بہو بیٹیوں کا آباد کردہ کاہان، آنسوؤں میں بھگو کر خالی کر دیا گیا تھا۔ اور وطن کی شاہ زادیاں خود آئی ڈی پیز بن کر چھالوں سے چھلنی پیروں اور زخمی ناخنوں کے ساتھ اندھیرے غاروں کی طرف گرتی پڑتی چلی گئیں تھیں۔ کاہان جس کی گود اپنے بچوں سے خالی تھی اور وہاں بارود و بربادی نے انڈے دینے کی ٹھانی تھی۔ کاہان جہاں ڈھینگ (الّو) فریادیں کر رہے تھے۔

مگر دشمن اب خود بھی میٹھی نیند نہیں سو رہا تھا۔ کاہان پکڑنا (قبضہ کرنا) تو ممکن تھا، اِس کا ہضم کرنا ناممکن۔ کاہان نے قابض کو، سٹارویشن (طویل بھوک) سے مارنے کی حکمتِ عملی بنالی تھی۔ اب منظر یہ ہے کہ میجر براؤن اپنی تباہ حال فوجوں اور رسد کی شدید کمی کے ساتھ کاہان قلعہ میں محصور پڑا ہے۔ کاہان قلعے میں پھنسے ہوئے فوجیوں کا راشن ختم ہو رہا ہے۔ اُنہیں کمک نہیں پہنچائی جا سکتی کہ راستوں پر اچانک نیزے اور تلواریں اُگ چکی تھیں۔ انگریز کاہان کو خالی کر کے واپس جانے کے بھی قابل نہ تھے کہ راستے کا ہر پتھر چُست آنکھ میں بدل چکا تھا اور ہر جھاڑی ایک مردم کُش مری میں۔ یہ فوج مکمل طور پر گھیرے میں تھی۔ کاہان اب انگریز کے لیے ایک مقبوضہ قلعہ

نہیں بلکہ قہر کا کھڈا بن چکا تھا۔

روٹی روزی دینے کا فرشتہ میکائل روٹھ گیا تو براؤن نے اپنے آدمیوں کو نصف راشن پر رکھ دیا۔ عقل کا اندھا تھا کہ مری کی حکمتِ عملی ہی نہ سمجھ سکا۔ وہ تو مردار خون سے اپنے خنجروں کو ناپاک نہ کرنے اور انگریز کو بھوک سے مار دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس احمق نے فصیل کی بنیاد کے ساتھ ساتھ گہری خندقیں کھدوائیں اور اُن میں نوکیلی سروں والی لکڑیاں گاڑ دیں۔ لڑتا مری سے ہے اور مدد حاصل کرتا ہے جنگی نصاب سے!! تخلیقی قبائل، آزمودہ طریقے استعمال ہی کیوں کریں گے؟۔ چنانچہ اب اُسے مزید کمک کے لیے بہت بے قراری تھی، مگر آگے تو بھوک مسلط کرنے والے دیو بیٹھے تھے: دودا مری، دلیل سومرانڑیں، لال خان رامکانڑیں.....

عام آدمی کو بھی سمجھ آتا ہے کہ اب بچنے کا راستہ کیا تھا۔ بھئی بات کرو، مذاکرات کرو، ناک رگڑو، معافی مانگو، تاوان ادا کرو، وطن خالی کر دو، واپس نہ آنے کی ضمانت دو۔ مگر کہاں جی؟۔ جو طاقت پورے ہندوستان کو نگل گئی ہو اُس کا ذہن ایک معمولی قبیلے کو اپنے برابر تسلیم کرنے کو تیار کیسے ہوگی؟۔ یا پھر اس قدر بے بس کہ اوسان خطا۔ عقل ماؤف۔

چنانچہ انگریز کو ایک بار پھر بدبختی کے پسو نے کاٹ لیا۔ سینکڑوں انگریزوں کی موت ایک بار پھر کوہستانِ مری میں لکھی گئی۔ عزرائیل اپنا ہیڈ کوارٹر وہیں قائم کیے انتظار میں جو تھا۔ اب کی بار میجر کلبرن کی قسمت پھوٹی۔ اُسے 600 انفنٹری، 300 اِرریگولر ہارس، تین توپوں اور ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ایک قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا گیا تاکہ کاہان کے اپنے بھوکے گیریزن کو کمک پہنچا پائے۔

اور آسمان، تضحیک سے بھرا آسمان، انگریز کو دیکھ کر ''ہونہہ!!'' کہہ رہا تھا۔ دیکھو ناں، یہ اگست کا مہینہ تھا۔ سبی ولہڑی وجیکب آباد وڈھاڈرو کاہان.....اور اگست کا ماہ۔ یہ علاقہ دوزخ کا پینڈا بن جاتا ہے۔ اور پھر قہر وقہار مون سون کی بارشیں ایک اضافی موت تھیں۔ ایسے حالات میں تو چھٹی جماعت کا بچہ بھی ایک ہزار اونٹوں کے ساتھ حملہ کرنے کا فیصلہ نہیں کرے گا۔ انگریز

لگتا ہے چرس پیے ہوا تھا۔ (پھر بھی ہمارے بڑے بوڑھے کہتے رہتے ہیں کہ، انگریز بہت عقلمند تھا!)۔

جنگ کہنا، جنگ گانا اور جنگ لکھنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر جنگ میں موجود ہونا، جنگ میں سے گزرنا، اور اس میں موجود تہہ در تہہ حقائق کو جسم وروح پہ بھگتنا بہت سخت کام ہوتے ہیں۔

گوریلا نوکدار ٹھونگیں کھانے کے لیے بہت ہی موزوں یہ انگریزی فوج، 24 اگست کو پلیجی سے روانہ ہوئی۔ بلوچی میں کہتے ہیں کہ ''چوہے کے اپنے گزرنے کے لیے بل چھوٹا تھا اس نے پھر دُم کے ساتھ درخت کا تنا بھی باندھ لیا''۔ اِس بے وقوف چوہے یعنی، انگریز نے خود کو پھانسنے کا سارا بندوبست کر لیا۔ اُس احمق نے پلیجی سے چٹانی مری علاقے میں سے گزارنے کے لیے پہیے والی توپ بھی ساتھ لی۔

آیئے ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والی انگریز فوج کی اس مارچ کے بارے میں لیمبرک کا یہ پیراگراف پڑھیں:

''کانوائی خشک ندی کے راستے پیچ وخم کھاتی چل رہی تھی۔ اوپر پہاڑوں پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ پریشانی تھی کہ کہیں بارش نہ ہو اور سیلاب نہ آئے۔ دور پہاڑوں میں گرج چمک ہو رہی تھی۔ شمال کی جانب کوہِ بانبور کی وہشتناک کھائیاں دکھائی دے رہی تھیں جو کہ بلوچ داستانوں میں مشہور ہے۔ قدم قدم پر علاقہ کٹھن تر اور وحشی تر ہوتا گیا۔ بیل گاڑیوں اور توپوں کے پہیے بجری میں سے گزر رہے تھے اور بڑے بڑے پتھروں پر کھڑکھڑ کر رہے تھے۔ اونٹ بوجھ تلے گڑگڑا رہے تھے۔ دستہ ٹھوکریں کھاتا آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ فضا لوگوں کی چیخوں سے زندہ تھی مگر ماحول میں ایک مردہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک بھی زندہ چیز دکھائی نہیں دیتی تھی سوائے گِدھوں کے جو اُن کے اوپر چکر لگا رہی تھیں۔ موسم کرخت ہوتا جا رہا تھا .....کوئی آبادی اور سکونت نظر نہیں آئی مگر انہیں مارچ کے راستے کے دونوں اطراف

بلندیوں سے اپنی نقل وحرکت کو غور سے دیکھے جانے کا احساس تھا۔ اِس سب کچھ سے مارچ کے لوگوں کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی.....

''29 تاریخ (اگست) کو فوج سیاہ آف سے شمال کی جانب کاہان روانہ ہوئی۔ سڑک توپوں کے لیے مزید دشوار ہوئی۔ دشوار چڑھائیاں، ندی نالوں کے کٹاؤ، بجری والا راستہ اور اتنے بڑے بڑے پتھر کہ دو توپوں کے پہیے ٹوٹ گئے۔ لدے ہوئے کئی اونٹ اور کئی بیل گرنے لگے۔ اور اب بلوچوں نے اپنی فوقیت کو جتانا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے ہراساں کرنا شروع کر دیا.....''۔

کاہان کے جنوب میں نفسک کے مقام پر 31 اگست 1840ء کو انگریز کی اِس کمکی فوج اور مری کے درمیان جنگ ہوئی۔ انگریز کا کمانڈر تھا جان کنیز، اور مری کا کمانڈر سردار دودا خان مری۔ ہوا یوں کہ جب انگریز فوج پہاڑوں کے دامن میں پہنچی تو پہاڑوں کی ساری چوٹیوں پر اچانک مری بلوچ اُگ آئے تھے۔ توڑے دار توپکوں اور پتھروں سے لیس بلوچوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ بدترین چڑھائی تھی۔ جو پتلا سا راستہ اوپر کو جاتا تھا اس کو مریوں نے پہلے تباہ کر دیا تھا۔ گرمی، مری اور خوف۔ اب سپاہیوں کی پیاس ناقابلِ برداشت و ناقابلِ بیاں تھی۔ تھکاوٹ سے چور، گرمی کی ماری، اور پیاسی ''پانی پارٹی'' واپس نہ آئی۔ اُسے خضداری تلواروں نے ''اپنا'' بنا دیا تھا۔ مری، انگریز سامراجیوں پر مرگ آور سپرے شروع کر چکا تھا۔ اب کے وہ ساڑتاف والی پچھلی لڑائی میں کلارک سے چھینی جانے والی بندوقیں بھی استعمال کر رہے تھے۔

ایک طرف ٹیکنالوجی سے لیس، سامراجی ملک گیری کی ہوس ہے۔ اور دوسری طرف وطن دوستی اور آزادی کا متبرک جذبہ ہے۔

سامراج دشمنی کے بھی تو ہزار رنگ ہوتے ہیں۔ ہم ہمیشہ عوامی تحریکوں کو بڑی یکسانیت میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور یوں ہم سے کتنے اچھے اور دلچسپ لوگ اور اُن کے قصے گم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ عوامی تحریکوں میں تو واحد بڑے نکتے پر یکساں سوچ پائی جاتی ہے۔ باقی زندگی کو تو ہر شخص اپنے سماجی معاشی پس منظر کی مطابقت میں دیکھتا ہے۔ اپنی اپنی عینک سے۔

یہاں مری انگریز جنگ میں بھی پورا قبیلہ جمع تھا۔ یہاں مختلف طبیعتوں، پس منظروں کے حامل قبائلی موجود تھے۔ آزادی پسند بلوچ مختلف عہد کرتے ہیں۔ مثلاً دیکھیے ایک مری کیا قول دیتا ہے:

ڈُھوکہ مہری آں لیڑھے کاراں
مس کُشاں ڈیڈھاں لیڑھے کاراں

ترجمہ: میں ڈیوک (انگریز افسر) کے مہاریوں میں سے ایک مہاری لاؤں گا
میں انگریز مار کر ایک مہاری اونٹ لاؤں گا

اور یہ ڈیوک (انگریز افسر) بلوچوں میں ڈھوک کے نام سے مشہور ہے۔ مری ایک پوری جنگ کا ''ڈھوکہ جنگ'' کے نام سے تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ماضی بعید کے لیے بھی ''ڈھوکہ وختانی'' (ڈیوک کے زمانوں) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ایسٹ وک مری کے اِن حملوں کا قصہ یوں لکھتا ہے: ''انگریز سپاہی جلد جلد مرتے گئے اور ان کے افسر بہت زخمی ہوئے۔ جب فوج نصف منزل تک گئی تو مریوں نے نیچے یورش کر دی اور پہاڑی آبشار کی طرح اپنے سامنے والی ہر چیز کا صفایا کرتے چلے گئے۔ ایک کے سوا اِس فوج کے سارے افسر مارے گئے''۔

مری کے پڑوسی قبائل اور دور و نزدیک کے حاسدوں کے اندر مری قبیلہ اور ایک توپ کا قصہ، بہت مشہور ہے۔ یہ تقریباً ضرب المثل بن چکا ہے۔ ہوا یوں کہ انگریز اپنے توپ سے اپنے دفاع کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ہیبت ناک آواز اور نقصان پہنچانے والے گولوں نے مری کو ذرا سا بے چین کر دیا تھا۔ لہٰذا اُس توپ کے ساتھ کچھ تو بہر حال کرنا تھا۔ کوئی اُسے ہماری بے وقوفی سمجھتا ہے، کوئی طنز کرتا ہے' کوئی اُسے اندھی بہادری گردانتا ہے۔ جو جی چاہے کہہ دیں، ہم تو بس ایسے ہیں۔ انگریز کا اپنا بیان ملاحظہ کیجئے: ''پہاڑ پر جانے والوں میں سے بیس انگریز بھی نہ بچے اور فتح یاب مری ایک ہاتھ میں پتھر اور دوسرے میں تلوار لیے توپ کے قریب پہنچے۔ انہوں نے

پتھر ہمارے آدمیوں کے منہ پر مارے۔ مریوں کے ایک مشہور سردار نے خود اپنی ڈھال ایک توپ کے سامنے اس وقت دے دی جب وہ چلنے والی تھی۔ اُسے اِس توپ نے بھون ڈالا ۔فوجیوں کا کہنا تھا کہ حملہ کا یہ طریقہ اس قدر خوفناک تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سپاہیوں کی بندوقیں ہاتھ سے پکڑ لیتے تھے۔ اور خود کو سنگینوں پہ پھینک دیتے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح یا پھر جنگلی درندوں کی طرح لڑتے تھے''۔(16)۔

تاریخ میں بلوچستان پر سارے حملہ آور تربیت یافتہ فوجی رہے ہیں۔ جبکہ مقابلے میں بلوچ، غیر فوجی تربیت یافتہ عام انسان ۔ انگریز کی اس تربیت یافتہ فوج کا سارا خزانہ، راشن، اونٹ اور توپیں قبضہ ہو چکی تھیں۔ ڈھائی سو سپاہی اور چار انگریز افسر، اور دو دیسی افسر موت کی نیند سلا دیئے گئے۔

توپیں لاشیں چھوڑ کر' شکست نا آشنا میجر کلبرن واپس پلیجی کو پسپا ہوا۔ مگر وہاں تک بھی جاتے جاتے اس کے کارواں کی دم سلامت نہ گئی اور یلیجی تک پہنچتے پہنچتے اس کی فوجوں کا پچھواڑہ قتل وزخمی ہو چکا تھا، لُٹ چکا تھا۔ ایک افسر سمیت کئی آدمی یلیجی پہنچ کر موت کی وادی کے حوالے ہو گئے۔

جب آپ کے آباؤ اجداد کوئی اچھا اور یادگار کام کریں تو اُس کو بیان کرنا خودستائی نہیں ہوتی۔ یہ تو انسانی اشرف اقدار میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ انگریزی فوج کی لاشوں میں سے بلوچوں نے اُن لاشوں کو حرمت بخشی تھی جنہوں نے بہادری سے لڑائی کی تھی۔ اُن بہادر دشمنوں کی شجاعت کی تکریم کا تمغہ اُن کی لاشوں پر یوں سجایا گیا کہ اُن کی دونوں کلائیوں کو جوڑ کر اُن پر سرخ دھاگے لپیٹ دیے گئے تا کہ انہیں دوسری لاشوں پر فوقیت حاصل ہو۔ میر گل خان نصیر نے ذکر کیا ہے کہ ایک انگریز شاعر فرانسس ڈی ویل نے اپنے افسر نیپیئر کے ساتھ ان لاشوں کو دیکھا تھا۔ وہ شاعری مجھے دستیاب ہوگئی جو ہم ضمیمہ کے بطور کتاب کے آخر میں دے رہے ہیں۔

ہتو رام کے بقول اس لڑائی میں پانی نے دھوکہ دیا۔ راستہ بھی خراب تھا، بلوچ رسم ورواج سے انگریز کی ناواقفیت بھی تھی اور خود بلوچوں کو بہت غصہ تھا، اس لیے کہ اُن کی ریاستِ کلات کا والی خان محراب خان تازہ تازہ شہید ہو چکا تھا(17)۔ تاویل کوئی بھی ہو، وضاحت جیسی بھی ہو، جواز کوئی بھی ہو، سچ یہ ہے کہ مری نے محض دو حملوں میں اُس برطانوی فوج کا آدھا حصہ تباہ کر دیا جس نے دوسری بار اُن کے علاقے میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی۔

بے یارومددگار قلعہ کاہان، اور اس میں پڑی بے راشن انگریزی فوج اور اس کے سربراہ میجر براؤن کی بے بسی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی، انگریز پوری طاقت لگا کر بھی اپنے اس پوسٹ کو بچانے میں ناکام چلا آرہا تھا۔ کاہان کے محصور قلعے میں پڑے پڑے بھی موت تھی اور یہاں سے ذرا ہلنے پر بھی موت تھی ۔ایک راستہ باقی تھا۔ مری سردار سے بحفاظت واپسی کا کوئی معاہدہ، کوئی یقین دہانی حاصل کرنا۔ لہٰذا ساری پھنے خانی، فرعونیت اور ''سپر پاوری'' کا نشہ ہرن ہو چکا تھا، اور بالآخر گھمنڈی براؤن نے بلوچوں کے کمانڈر کو لکھا:

''دودا مری.....میں آپ کو آپ کا قلعہ واپس کردوں گا بشرطیکہ آپ مجھے میدانوں تک بحفاظت پہنچنے کی شخصی ضمانت دیں.....'' (لیمبرک، صفحہ 75)۔ ارے یہی تو بات ہے جس کی سمجھ حملہ آوروں کو نہیں ہے۔ یہی کہ: '' آپ کو آپ کا قلعہ واپس کردوں گا''۔ ہمیں یہی تو چاہیے ہوتا ہے۔ ہمارا قلعہ قبضہ نہ کیا جائے۔ ہمارا وطن قبضہ نہ کیا جائے ۔بس، صرف اسی صورت میں بلوچ غضب بن جاتا ہے۔ وگرنہ تو یہ اشرف المخلوقات کے بھی اشراف اقوام میں سے ایک ہے۔ جب انگریز نے کہا'' آپ کو آپ کا قلعہ واپس کردوں گا'' تو ہم نے اُس کے اِس قول پر بھروسہ کیا کہ'' وہ دوبارہ ہمارے وطن پر حملہ نہیں کرے گا''۔ ہم اسے بحفاظت واپس نکلنے کی ضمانت دیتے ہیں۔

حاکم وظالم ومتکبر وجابر براؤن کو ہمارے دودا کے بھتیجے گامنڑ خان کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر

مذاکرات کرنے پڑے۔ یہ حیوان ہم انسانوں کو یوں بیان کرتا ہے: ''ہم نے ان بلوچوں کو انسانوں میں سب سے زیادہ مہذب اور شائستہ پایا''۔ چنانچہ مذاکرات کے نتیجے میں معاہدہ ہوگیا۔ انگریز کے پاس اب اس کے اپنے بقول دودا کا ''نوبل قول'' موجود تھا۔ نوبل انسانوں کے نوبل سردار کا نوبل قول۔

چنانچہ ہزیمت میں بھگوئے انگریز کو کاہان قلعہ پر سے اپنے پھٹے پرانے جھنڈے کو اتارنا پڑا۔ اور 28 تاریخ کو اِس قول کے ساتھ اُس نے کاہان خالی کردیا کہ وہ دوبارہ ہمارے وطن پہ حملہ نہیں کرے گا۔ چاروں طرف پہاڑوں پر بلوچ موجود تھے، حملہ کرنے نہیں بلکہ اپنا قول پالنے کے لیے کہ انگریز کی حفاظت کے ''سخن'' یعنی وعدے پر کوئی آنچ نہ آئے۔ (مگر قبضہ گر کا کوئی قول، کوئی خدا، کوئی رسول نہیں ہوتا۔ دوسو سال قبل جھوک شریف میں شاہ عنایت رحمتہ اللہ علیہ کی کسان فوج کے ساتھ حاکموں نے تیس سیپاروں کا قران سر پر رکھ کر حفاظت وسلامتی کا قول دیا تھا، اور پھر اُسے توڑا تھا۔ اب دوسو برس بعد کوہستانِ مری کے شاہ عنایتوں نے یہی تلخ عمل پھر اپنی گردنوں لاشوں پہ دُھرانا تھا۔ اور ہم دیکھیں گے کہ انگریز نے ہمارے وطن پر دوبارہ حملہ نہ کرنے کا اپنا وہ وعدہ پھر توڑ دیا)۔ بہرحال، انگریز اپنی تین توپیں چھوڑ کر مری کا علاقہ خالی کرگیا۔ دو توپیں بیس برس بعد 1859 میں حاصل کی گئیں۔ مگر تیسری توپ تو 80 سال بعد 1918 میں کہیں جا کران کے ہاتھ آئی۔ ''اُس توپ پر موجود تلوار کی کاٹ کے نشانات جنگ نفسگ کی ہولناکی کے سرٹیفکیٹ ہیں''۔

10- کلات کی اجڑتی حکمرانی

دنیا بھر کے انسانوں کی طرح بلوچستان کے عوام بھی اپنے حکمرانوں کو کسی سُپر پاور کا ایجنٹ دیکھنا نہیں چاہتے۔ عوام ایسے حکمرانوں سے ہمیشہ نجات چاہتے ہیں جو دوسروں کے

دستنگر اور مجبورِ محض ہوں۔ یہی مسئلہ اب کلات میں درپیش تھا۔ خان محراب خان تو وطن دوستی کی جنگ میں لعل شہید بن چکا تھا۔ اب تو انگریز حاوی تھا۔ اب وہ جسے بھی خان بنا تا وہ انگریز کا پٹھو ہی ہوتا، اور پٹھو حاکم کو تسلیم کروانے میں انگریز کے سارے تباہ کن اقدامات کے باوجود بات نہ بنی۔ اور بات نہ بنی تو انگریز نصیر خان کو حکمران تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اُسے کچھی سے طلب کیا اور 6 اکتوبر 1841 کو عزت واحترام سے تختِ کلات پر بٹھادیا۔ تخت نشینی کے موقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے میجر اَوٹ رم، بریگیڈیئر انگلینڈ اور کرنل سٹیسی نے شرکت کی۔

1841 کو ایک اور ''دوستی معاہدہ'' بلوچوں پر مسلط ہوا۔ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بلوچستان کے مختلف مقامات میں فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ اور خارجہ امور میں کمپنی کی اطلاع اور منظوری کے بغیر بلوچ کوئی کام نہیں کرسکتے تھے۔ پاگل انگریزوں نے اپنی طرف سے خان کو پابند کیا کہ وہ ایرانی بلوچستان یا ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کی سرحد کے قریب بدامنی پیدا نہیں ہونے دے گا۔ نیز وہ برطانوی سوداگروں کا تحفظ کرے گا اور مقررہ حد (فی بار بردار اونٹ پانچ روپے) سے زیادہ محصول نہیں لے گا۔

واضح رہے کہ چارلس نیپئر سندھ کے تالپر امیروں کو شکست دے کر اُس وسیع سرزمین کو اپنے مقبوضات میں شامل کرچکا تھا۔ ساتھ ہی پنجاب کی حکومت بھی ہتھیار پھینک چکی تھی اور یوں ہمارا پڑوسی سندھ و ہند مکمل طور پر فتح ہوچکے تھے۔

11- تصحیح

یہاں ایک غلط العام بات کی اصلاح ضروری ہے۔ میں نے جتنے بھی تاریخ دان پڑھے ہیں اُن سب میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ انگریز نے بلوچستان میں کوئی معاشی تجارتی اور

سیاسی مفادات کی وجہ سے حملہ نہیں کیا بلکہ محض اس لیے کہ روس کے بادشاہ کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ہم دلیل کے ساتھ واضح کرتے ہیں کہ ایسا نہ تھا۔ بلوچستان کو محض بیرونی لٹیروں کے لیے گزرگاہ کے بطور فتح نہیں کیا گیا۔ نہ ہی برطانیہ صرف شاہی روس کو روکنے کے واحد مقصد سے بلوچستان پر حملہ آور ہوا تھا۔

ہندوستان سے افغانستان، مشرقی ایران اور وسطی ایشیا تک انگریزوں کی صنعتی مصنوعات کی ٹرانزٹ کے سارے زمینی راستے بلوچستان میں سے گزرتے تھے، اور ساری سمندری تجارت بحیرہِ بلوچ کے ذریعے ہی ہوسکتی تھی۔ اسی لیے تو قابض کی طرف سے بلوچستان کے ہر خان کے ساتھ کیے گئے ہر معاہدہ میں تجارتی راستوں کو پرامن اور کھلا رکھنے کی شق ضرور موجود ہوتی تھی۔ (صنعتی سرمایہ نے بلوچستان میں اپنی مخاصمت اور مزاحمت ختم کرنے کے لیے 1839، 1841، 1851، 1876 کے بڑے معاہدے کیے۔ یہ معاہدے اُن معاہدوں کے علاوہ ہیں جو وہ انفرادی قبائل سے وقتاً فوقتاً کرتا رہا)۔ اس لیے یہی بات صحیح ہے کہ بلوچستان انگریز کو تجارتی راہوں کی وجہ سے عزیز تھا۔ تاجر کو تجارت کرنی ہوتی ہے۔..... اور بلوچستان دنیا کی وسیع منڈیوں کا ''گیٹ وے'' تھا اور اب بھی ہے۔

بلوچستان کی اِس دوسری اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ برطانیہ کو زارِ روس کے بڑھتے ہوئے اثرات پہ بڑی تشویش تھی۔ اس لیے وہ بلوچستان میں گیریزن قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنی ہندی سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔

علاوہ ازیں انگریز کو بلوچستان پہ اس لیے بھی قبضہ کرنا تھا کہ وہ ایران اور افغانستان پر بھی بالواسطہ طور پر اپنی حکمرانی چاہتا تھا۔

اور ایک بڑی حقیقت یہ بھی تھی کہ اِن مقاصد کے ساتھ ساتھ اُسے خود بلوچستان کو بھی لوٹنا تھا۔ بلوچستان پر حملہ کرنے میں برطانوی سامراج کا ایک بہت بڑا مفاد' معاشی بھی تھا۔ یہاں کے خشکی اور سمندری وسائل کو لوٹنا تھا، اِس کے سمندر کو تجارتی مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اور

اس کے باشندوں کا معاشی استحصال کرنا بھی یہاں پر اُس کے للچانے کے محرکات تھے۔ برطانیہ ایک کیپٹلسٹ ریاست تھی۔ اسے بلوچستان میں مارکیٹوں، معاشی وفوجی حلقہِ اثر، اور خام مال کے بڑے ذخائر کو لوٹنا تھا۔ یہاں کا سستا مزدور استعمال کرنا تھا۔ اِسی طرح اُس نے اپنا تیار مال بھی تو بیچنا تھا۔ (ہم اُس کی تفصیل آگے دیں گے)۔

لیکن، اس سب کچھ کے علاوہ ایک بہت بڑا ظلم ہم پہ کیا گیا۔ اس سیاسی عسکری سماجی معاشی اور ثقافتی بالادستی کے نظام والے برطانیہ نے بلوچستان کو نیم غلام تو بنایا، اس کا استحصال تو کیا اور استبداد تو جاری رکھا۔ مگر اس طرح کہ یہاں موجود فیوڈل رشتے برقرار رہیں، یہاں پیداواری قوتیں چرواہے اور نیم کسان ہی رہیں، اور سماجی ڈھانچہ جوں کا توں رہے۔ چنانچہ اس نے بلوچستان کے تاجر اور سرمایہ کار کو فروغ پانے نہ دیا۔ اس نے منڈی، برآمدی اور درامدی تجارت بجائے بلوچوں کے یورپی اور ہندی تاجروں کے حوالے کی (18)۔ ہم اِس ظلم کا نتیجہ تین سو سال بعد اب تک بھگت رہے ہیں۔ (مگر ہم نے خود بھی تو ایسا نہ ہونے دیا۔ ہم نے انگریز کو ٹکنے بھی تو نہیں دیا!! ہم نے اچھا کیا)۔

برطانیہ اِس سارے عرصے میں کیموفلاج کے ذریعے، سازباز، دھوکے اور سازش کے ذریعے، لالچ اور پیسے کے ذریعے اور حتیٰ کہ طاقت کے ذریعے بلوچستان کو مطیع بنانے کی کوششیں کرتا رہا۔ جبکہ دوسری طرف بلوچ محنت کرنے والے لوگ، ماہی گیر، خانہ بدوش، چرواہے اور کسان اپنے مادروطن کے دفاع، اور اپنی آزادی کے لیے لڑائیاں لڑتے رہے۔ وہ کبھی خودرو، غیر منظّم، نیم شعوری جنگ ہوا کرتی تھی۔ اور کبھی ہم مکمل طور پر شعوری، منظّم اور منصوبہ بند قومی آزادی کی جنگ کی صورت ان غیر ملکی سامرجیوں کے خلاف لڑتے رہے۔

12۔ خان گڑھ

اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے انگریز کا اگلا بڑا اقدام یہ تھا کہ اس نے 1847ء میں بلوچستان میں خان گڑھ (جیکب آباد) کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ اس سے قبل شکارپور اُس کے لیے یہ کام دے رہا تھا۔ اب چونکہ اس کے مقاصد، اور جغرافیائی اثرات وسیع ہوگئے تھے اس لیے اب شکارپور سیاسی و انتظامی لحاظ سے اپنی مرکزیت والی پوزیشن کھو چکا تھا۔ سندھ تو مکمل قبضہ ہو چکا تھا، وہاں مزاحمت کا خطرہ نہ رہا۔ چونکہ معاملات اب افغانستان اور زاہدان تک کے کرنے تھے، اور بلوچستان سے گزر کر اور بلوچستان میں رہ کر کرنے تھے، اس لیے شکارپور سے آگے بڑھ کر خان گڑھ میں ڈیرے ڈالنے ضروری ہوگئے تھے۔ یوں انگریز نے شکارپور کے بجائے خان گڑھ کو ایک مرکز کی حیثیت سے کھڑا کیا' اور جنرل جیکب نے اُسے خان گڑھ سے جیکب آباد بنادیا۔ بلوچستان بھر کو یہیں سے کنٹرول کیا جانا تھا۔ اسی خان گڑھ قلعے نے بعد میں کلات پر انگریزوں کی مداخلت کاری میں اُن کی بہت مدد کرنی تھی۔ انگریز نے نہ صرف سرحدی علاقوں میں گیریزن بنائے بلکہ نقل وحمل کے لیے سبی، کوئٹہ، مچھ، ژوب، اور دیگر جگہوں پر کنٹونمنٹ بنائے۔ اوران کے درمیان ریلوے لائن بچھادی۔ نہ صرف ان چھاؤنیوں کو آپس میں ملادیا گیا بلکہ اس سے ایک طرف زاہدان اور دوسری طرف چمن سے افغانستان کو بھی ملادیا گیا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ فرنگی نے اپنی جو ہلاکت خیز سیاست ڈیرہ غازیخان کے میدانوں سے شروع کی تھی، اُسے اُس نے میدانوں ہی کے ذریعے خان گڑھ اور سبی تک پھیلا دیا۔ کوہِ سلیمان کو تو اُس نے بہت بعد میں عبور کرلیا اور پھر مری، بگٹی، مزاری، ڈومبکی علاقوں سے لے کر مکران کے سمندر اور کوہِ تفتان کے دامنوں تک کے سارے بلوچ علاقے کو خوف، رشوت، سازش اور حیلوں بہانوں سے اپنی بادشاہی کے تابع کردیا۔ (یہ الگ بات ہے کہ بلوچستان نے اُسے ''سئے تاخی تف'' نامی بیماری میں مبتلا کیے رکھا جس میں ایک دن افاقہ رہتا ہے اگلے دن پھر جھٹکے کھلاتی سردی کے ساتھ بخار پکڑتا ہے)۔

انگریز بلوچستان میں بے مزاحمت ایک گز بھی نہ جاسکا۔ وہ بے لڑائی ایک پل بھی نہ رہا۔ اس سلسلے میں صرف درہِ بولان میں انگریزوں پر مری اور دیگر قبائل کے بار بار حملوں کا تذکرہ ہی کافی ہوگا۔ جہاں انگریزوں کے بے شمار قافلے لوٹ لیے گئے اور اس کا جانی نقصان ہوتا رہا۔ پورے خطے میں بلوچستان واحد علاقہ تھا جہاں انگریز کو اِس طرح کی مزاحمت کی بوچھاڑوں میں مبتلا رکھا گیا۔ بجار خان ڈومبکی سے لے کر انگریز کے بلوچستان سے کوچ کر جانے کے پورے 80 برس تک انگریز کے عظیم الجثہ بدن سے خون رستا ہی رہا۔ بلوچ نے کبھی بھی اس کا ریش شدہ زخم مندمل ہونے نہ دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ انگریزی دور ''سامراجی'' دور نہ تھا، یہ تو ''سامراج دشمن'' دور تھا۔ اور بلوچ کی وہ 80 سالہ تاریخ سامراجی غلامی کی تاریخ نہیں، سامراج دشمنی کی تاریخ ہے۔

خان گڑھ کے جیکب آباد میں ڈھلنے ہی کے زمانے میں میر نصیر خان نے انگریز سے ''دوستی کے معاہدہ'' پر دستخط کردیے، اور اپنی وفاداری انگریزی حکومت کے ہاتھ 50 ہزار روپے سالانہ کے عوض فروخت کردی۔ ایک اور حرکت یہ ہوئی کہ مری قبیلہ کی بغاوتوں کو روکنے کے لیے 17 دسمبر 1841ء کو میر نصیر خان (اور کرنل سیٹی) نے دوست علی مری کو لہڑی بلا کر انگریز کے خلاف ہاتھ روک دینے کی ہدایت کی۔ دوست علی نے خان کی بات مان لی۔ جس کے عوض انعام میں خان کے گنداواہ کا ایک گاؤں مری کے سردار کو جاگیر کے بطور دے دیا۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ سارا وان کے سرداروں کو محراب خان کو شہید کرتے وقت انگریز سے معاونت کے صلے میں اعزازات دیے گئے تھے۔ (مگر بھلا ہم کیوں سرداروں اور خانوں کی بات کریں، اُن کی باتیں کرنے والے تو اور بہت ہیں!!)۔

ہم تو سرداروں کے پرے، دوسری طرف دیکھے ہیں۔ بلوچ عوام الناس کی طرف، اصل مالک کی طرف۔ وہ اپنی آزادی کے لیے ہر پل لڑتے رہے۔ ویسے بھی بلوچ، سامراج کے خلاف جنگ کو بہت انجوائے کرتا رہا ہے۔ اُسے یہ لپک جھپٹ اچھی لگتی رہی ہے۔ کوئی بہت بڑے مرصع و مسجع منشور سے مبرا، بلوچ نے پوری تاریخ میں محض دو ایک بنیادی انسانی پیدائشی

حقوق کو رہبر بنائے رکھا۔ وہی اس کی شاعری تھے، وہی اس کے نعرے استعارے تھے اور وہی اغراض ومقاصد تھے۔ (شاید ہم آج بھی اُسی طرح ہیں۔ کوئی لمبی چوڑی تفاصیل، موجود نہیں ہیں)۔

1843ء کو مری نے بادرہ اور کوئٹ منڈاھی کو پنڑیں قبائل سے چھین بَر ہاں قبضہ کرلیا اور انگریزی قافلوں کے راستوں کو بند کردیا۔(19)۔ پورا کچھی مری کے حملوں کی زد میں رہا۔ اس نے برطانوی راج کے خلاف ایک مکمل جنگ شروع کردی اور ہر ہر جگہ پر انگریز فوجوں اور املاک پر حملے کیے۔ پنجاب کی سرحد سے لے کر سندھ کی سرحد تک اور یہاں اپنے بلوچستان میں کچھی کے میدانوں تک میں مری کی جنگی کاروائیاں روزمرہ کا معمول بن گئیں۔

رچرڈ اسحاق بروس نے اپنی کتاب ''دی فارورڈ پالیسی'' میں اس سب کا یوں تذکرہ کیا: ''مریوں کو مطلق ناقابلِ اصلاح گردانا گیا۔ انہیں لاقانون قرار دیا گیا۔ اور کسی بھی مری کو پکڑنے پر دس روپے انعام کا اعلان کیا گیا''۔ (اُس زمانے کے دس روپے!!)۔ نتیجہ یہ کہ میدانی علاقے کے لوگ اپنے خاندانوں اور مال مویشی کے ساتھ سندھ منتقل ہونے لگے۔

اسی طرح 1845 میں انگریزوں نے سات ہزار کے لشکر کے ساتھ بگٹی قبائل پر چڑھائی کردی۔ اس قبیلے کی مزاحمتی حملوں نے انگریز کو بے چین جو کر رکھا تھا۔ اس انگریز لشکر نے اوچ اور پلیجی کے راستے دو طرفہ محاذ قائم کیا۔ بگٹی شکست کھا گئے، علاقہ خالی کیا گیا اور سارا قبیلہ کھیتران کے علاقے میں پناہ گزین ہوگیا۔ (جی، ہم ایسی مہاجرتیں بھی بہت کرتے رہے ہیں!)۔

1847ء میں ولیم میری ویدر کی سرکردگی میں بگٹی قبیلے کے خلاف پھر ایک کارروائی کی گئی (کراچی میں اب بھی اسی ظالم کے نام سے میری ویدر ٹاور قائم ہے)۔

اسی سال (1847) انگریز نے مری (بلوچ) عوام پہ بھی یورش کردی۔ اس جنگ میں بگٹی سردار سلام خان انگریز کے ساتھ تھا۔ بڑی جنگ 1849ء میں ہوئی اور ہمیں درّہ بولان پر حملوں سے باز رہنے کی سختی سے تنبیہ کی گئی۔ مگر مری قبائل نے بی بی نانی پر حملہ کردیا جو کہ درّہ بولان کے

سرے پر واقع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ حملہ خود ہمیں بھاری پڑ گیا۔ 1300 حملہ آوروں میں سے 750 مار دیے گئے۔ زخم چاٹتے بلوچوں نے کچھ دن بعد لہڑی پر حملہ کردیا۔ مگر وہاں پر بھی ہمیں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔(20)۔

13- بلوچ بدن ٹکڑے ٹکڑے

1849 ہی کو انگریز نے بلوچ کے ساتھ ایک اور ابدی دشمنی کر ڈالی۔ اس نے ڈیرہ جات کو اُس کے بلوچ جسم سے کاٹ ڈالا اور اسے پنجاب کے ساتھ ملالیا۔ بہت دور رس مقاصد کے ساتھ ایسا کیا گیا۔ کیوں کہ اگر امن وامان کا مسئلہ ہوتا تو وہ تو حل نہ ہوا۔ اس لیے کہ اُس سے اگلے ہی سال قبیلہ بزدار نے چھاپہ مار کارروائیاں شروع کردیں۔ اس نے عمر کوٹ اور یارو کے دیہاتوں پر یلغاریں کردیں۔ وڈور، اور بلانی شہر لوٹ لیے۔ انگریز نے بزداروں پر جوابی حملہ کردیا۔ اور لوٹا مال واپس لائے۔ مگر اُسے اس عمل کو بہت بار دوہرانا پڑا۔ (بلوچ، حملہ آور سے دوہرائی بڑی کراتا ہے)۔

چنانچہ 1853 کے ایک سال میں تین بار بزدار گھڑ سواروں کی لوٹ مار والے حملے ہوئے۔ جس کے بعد منگروٹھا میں انگریزوں سے بڑی مڈبھیڑ ہوئی۔ 1855 میں انہوں نے ایک بار پھر آس پاس تباہی مچادی۔ مارچ 1856 میں ہندوستان کے وائسرائے نے بزدار قبیلہ کے تمام وظائف بند کرنے کا حکم دیا۔ اس سال بزداروں نے فرنگ کے زیر قبضہ علاقوں پر گیارہ بار حملے کیے۔(21)۔

اس دوران انگریز کے مقرر کردہ کٹھ پتلی افغان بادشاہ، شجاع کو کابل میں قتل کیا گیا اور دوست محمد کابل کے تخت پر بیٹھ گیا (یا بٹھا دیا گیا)۔

انگریز کی نظر میں بلوچوں کے ساتھ 1841ء والا معاہدہ پرانا ہو چکا تھا لہٰذا مئی 1854ء میں جیکب نے خان سے ایک نئے معاہدہ پر دستخط کروائے۔ اس نیک اور ''محبّ وطن'' کام میں بلوچوں کا بالائی طبقہ جیکب کے ساتھ تھا۔

14-انگریز کے اپنے گھر میں آگ

اُدھر انگریز ہم پہ فتوحات کیے جا رہا تھا، اور اِدھر ہم اُسے اس کے مزے چکھا رہے تھے۔ مگر دوسری طرف وہاں خود اُس کے اپنے گھر میں ایک ایسا قصہ پک رہا تھا جس نے آگے چل کر پوری انسانیت کو متاثر کر کے رکھ دینا تھا۔

جس وقت ہم لُوٹے جا رہے تھے اور جوابی کاروائی کے بطور لٹیرے کا جبڑا ٹیڑھا کر رہے تھے تو اُسی دوران ہماری لے جائی گئی دولت سے انگلستان میں صنعت لگ رہی تھی۔ اور وہیں، اسی صنعت سے سرمایہ داروں کا گورکن یعنی مزدور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسی زبردست قوت تھی جس سے مستقبل کے دو سو برس تک سرمایہ داروں کی نیندیں حرام ہونی تھیں۔ اسی نئے سماجی مظہر (مزدور) نے ہر فرد کو ووٹ کا حق دینے کا مطالبہ کر دیا۔ 1836ء میں پہلے لندن میں اور پھر دوسرے انگریز شہروں میں اس کے لیے باقاعدہ مہم شروع کی گئی۔ انہیں محض ووٹ کا حق نہیں لینا تھا۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ اگر عام حق رائے دہی کو رواج دیا گیا تو انہیں پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہو جائے گی اور پھر پوری صورتحال بدل جائے گی۔ اگلے سال مزدور راہنماؤں نے ایک چارٹر (منشور) مرتب کیا جس میں وہ خاص خاص مطالبات شامل تھے جو کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے رکھنے والے تھے۔ پھر انہوں نے اس چارٹر پر دستخط جمع کرنے شروع کیے۔ تین الگ الگ موقعوں 1839 میں، 1842 میں اور 1848ء میں اس چارٹر کو پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ ہر بار دستخطوں کی تعداد پہلے سے زیادہ ہوتی تھی۔ مستقبل کے ان سفیروں کے جمع کردہ دستخطوں

کے ورق اتنے زیادہ اور اتنے بھاری تھے کہ 1842ء میں انہیں ایک بڑی صندوق میں رکھ کر 20 سے زیادہ آدمی اٹھا کر پارلیمنٹ میں لے گئے تھے۔ شام کو مشعلوں کی روشنی میں زبردست جلوس نکلتے۔

یہ ایک زبردست تحریک تھی۔ مزدور کو اپنے اتحاد اور یکتائی میں زبردست قوت نظر آئی۔ یہ تحریک ناکام تو ہوئی مگر اسی کی کوکھ سے صنعتی منظّم مزدوروں کی سب سے پہلی، الگ، اور آزاد سیاسی تحریک نے جنم لینا تھا۔

ویسے بھی سینٹ سائمن، فیوریئر اور رابرٹ اوون جیسے عظیم مفکروں نے سرمایہ دارانہ ارتقا کے ابتدائی دور میں ہی اس کی برائیوں کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے سرمایہ دار دنیا پر نہایت سخت اور جائز تنقید کی تھی اور آئندہ کے منصفانہ سماج کے متعلق تصورات پیش کیے تھے۔ یوٹوپیائی سوشلسٹ کہلائے جانے والے اِن مفکروں کی تصانیف میں عوام کو سرمایہ دارانہ غلامی کی بیڑیوں سے نجات حاصل کرنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن یہ لوگ بہتر اور متبادل سماج قائم کرنے کے صحیح طریقے گرفت میں لانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ ان کے تصورات میں سادہ لوحی اور خوش فہمی بہت تھی۔ اور سماج کو تبدیل کرنے کے لیے انقلاب کے بجائے اُن کا اصلاحات پر زیادہ یقین تھا اور وہ معاشی پیداوار کے طریق پیداوار کی جدلیات تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہی کے تصورات کو تراش خراش کر کے بعد میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے وہ عظیم اور فیصلہ کن نظریہ دے دیا جسے سائنسی سوشلزم کا نظریہ کہتے ہیں۔ انہوں نے ''دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ'' کا حتمی اور دوٹوک نعرہ دیا اور ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' شائع کیا۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو انسانی تاریخ کا نیا موڑ تھا جو 1848 میں وجود میں آ گیا۔ انگلستان میں!!۔

گو کہ ہم نوآبادیات والوں سے انگریز نے یہ سب کچھ چھپا رکھا تھا، اور ہم پہاڑوں میں اُس وقت کی ٹکنالوجی سے بھی ناآشنا اپنی جنگِ آزادی میں مصروف تھے۔ مگر دشمن کے اپنے گھر میں تو آگ لگ چکی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم جیسے ممالک کا سرمایہ نہ ہوتا تو انگلستان

میں وہ سارا معاشی، صنعتی اور سماجی ارتقا (کم از کم اُس وقت) ممکن نہ ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں انگلینڈ کے صنعتی انقلاب اور دوسرے یورپی ملکوں اور شمالی امریکہ کے صنعتی اثرات ایشیا اور افریقہ میں محسوس ہونے لگے۔ انگلستان نے اب ''دنیا کا کارخانہ'' ہونے کا دعویٰ کر یا۔ اور اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد بھی نہ تھا۔ ساری بڑی طاقتوں میں سے اُسی کے پاس دنیا کا سب سے بڑا، اور طاقتور بحری بیڑہ تھا۔ استحصال کے نئے نئے طریقے وسیع پیمانے پر کام میں لانے والا وہی دنیا کا پہلا ملک تھا۔ ہماری تقدیر انگلستان کی اندرونی تبدیلیوں سے براہ راست وابستہ رہی۔

ریفرنسز

1۔ Acemoglu,Daron and Robinson A James why Nations Fail. 2013. Profile Books.

2۔ یوگوفے بیٹ : Equality Versus Hierarchy , Marginality and Modernity۔صفحہ 10

3- پیکولین/شاہ محمد۔ بلوچ۔صفحہ 122

4- آرکائیوز آف بلوچستان'' سال1918، فائلXXIII۔ Raids، نمبر5 جلد نمبر1، صفحہ نمبر3۔

5- نصیرؔ، گل خان۔ بلوچی رزمیہ شاعری۔ بلوچی اکیڈمی۔صفحہ 208

6- پشتو نوا و بلوچو کرانالوجی۔صفحہ 12۔

7- بلوچ، سردار خان۔ بلنگ و بلوچ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 40

8- بلوچ، سردار خان ''بلنگ و بلوچ''صفحہ نمبر148۔

9- ہنری ہیو لاک ، وار اِن افغانستان ، ان 1838-39 نمبر 1 ۔ ہنری کولبرن پبلشرز لندن۔1940۔صفحہ 261

10۔ تاریخ خوانین کلات۔ میر گل خان نصیر۔صفحہ 110۔

11۔ بلوچ، احمد یار، ''مختصر تاریخ۔۔۔۔۔''صفحہ 114

12- پشتو نوا و بلوچو کرانالوجی۔صفحہ 15۔

13- احمد زئی، نصیر خان۔ تاریخ بلوچ و بلوچستان۔ جلد ہشتم۔2000۔ سریاب روڈ کوئٹہ۔صفحہ نمبر12

14- لیمبرک/شاہ محمد۔ جدوجہد آزادی۔صفحہ 22

15- ایسٹ وک/سید ضامن کنتوری۔ عبرت کدۂ سندھ۔صفحہ 144۔

16۔ لیمبرک/شاہ محمد۔ مری بلوچوں کی جدوجہد آزادی۔صفحہ 103۔

17- ہتو رام۔ تاریخ بلوچستان۔صفحہ 86۔

18- حبیب جالب، Oligarchy ,Statehood and Nationalism in Balochistan 2006-۔ سریاب روڈ کوئٹہ۔صفحہ 97

19- لونی، عزیز "Passes from Afghan Frontiers"۔1992۔صفحہ نمبر155۔

20- عثمان حسن، بریگیڈیئر، ''بلوچستان رپورتاژ''صفحہ نمبر437۔

21- بلوچ۔ سردار خان۔ بلنگ و بلوچ۔صفحہ 39۔

خان ھذاداث خان

1- تخت نشینی (پہلی بار)

ہر جانہ دنیا پڑے گا کہ ہم بلوچوں نے اپنے ایک مورخ، محترم نصیر خان احمد زئی کو اُس کی زندگی میں زیادہ سنجیدہ نہ لیا۔ بہت کم لوگوں کی تحریروں یا کتابوں میں اُس کے حوالے ملتے ہیں۔ اس نے ایک انتہائی احسان ہم پہ یہ کیا کہ اُس نے خوانینِ کلات عہد کے بارے میں عرق ریز معلومات اکٹھی کیں۔ اس کی تحریر کے مطابق محراب خان کی شہادت کے ڈیڑھ ماہ بعد اُس کی ملکہ

خدیجہ کے بطن سے ھذاداث پیدا ہوا۔ ھذاداث کی پرورش سوتیلے بھائی نصیر خان کے ہاں ہوئی۔

چہار اطراف انگریز کی حکمرانی تھی اور بلوچی دربار میں چاپلوسی کا راج تھا۔ اس یتیم کا والد اپنے وطن دوست ساتھیوں کے ساتھ وطن کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ یتیمی کے سیاہ سائے تھے اور ھذاداث خان تھا۔

.....اور بلوچ اپنی وسیع سرزمین پہ کسی نہ کسی کونے پر انہماک کے ساتھ برطانیہ سے لڑ رہے تھے۔ مکمل غلامی کبھی نہ دیکھی بلوچ نے۔ سامراج دشمن سرشت بھری ہماری جنگوں میں ہمارے خطے کی جغرافیائی ساخت ہمیشہ ہماری معاون رہی۔ ہاں، کبھی کبھی ہمارا جغرافیہ ہمیں بھی آنکھیں دکھاتا تھا۔ مثلاً 24 جنوری 1852 میں کاہان کے بڑے زلزلے نے سردار (دین محمد) کو تو کچھ نہ کہا مگر سینکڑوں انسان اور ہزاروں مال مویشی مار دیے۔ کاہان مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ مسکن اور ساکن کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے قاتل بھی ہیں، محافظ بھی۔ رقیب بھی ہیں اور رفیق بھی!!۔

1857ء کے اوائل میں خان کلات میر نصیر خان فوت ہو گیا تو میر ھذاداث خان والیِ کلات بنا۔ اُس وقت اُس کی عمر 16 برس تھی۔ رواج اور حالات کے مطابق، سولہ سالہ ھذاداث سرداروں (رواج) کا انتخاب تھا۔ لیکن اُن کے باہمی تعلقات جلد خراب ہو گئے۔ میر گل خان نصیر اس کی بڑی وجہ ھذاداث خان کی ناتجربہ کاری، جذباتیت، کینہ پروری، اور فرنگ و سردار کے گٹھ جوڑ، اور داؤ پیچ سے اُس کی ناواقفی کو قرار دیتا ہے۔

ھذاداث خود تو انگریز کا اس قدر زیادہ مخالف نہ تھا۔ لیکن اس کا مشیر داروغہ گل محمد خان اور گنگا رام انگریزوں کے سخت مخالفت تھے۔ چونکہ دربار میں اِن دونوں کا اثر و رسوخ بہت تھا اس لیے انگریز نواز سرداروں کی ناراضگی لازم تھی۔ اور سردار عام سردار نہ تھے، یہ تو انگریز سے پینگیں بڑھائے ہوئے سردار تھے..... سرداروں کی اِس ھذاداث دشمنی کی، دربار و حکمرانی سے وابستہ دیگر بھی کئی وجوہات تھیں۔ جو سب بالآخر اِس بات پہ منتج ہوئیں کہ ھذاداث خان

سرداروں سے بھڑ گیا اور 17 ستمبر 1857 کو اُس نے مسلح ہو کر گنداواہ کے مقام پر سرداروں کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔.....اور پھر اگلے چھتیس برس تک سرداروں سے اس کی یاری نہ بن سکی (کس شریف آدمی کی اُن سے یاری بنی؟)۔ جہلاوان کے سردار اُس کے کٹر مخالف ہو گئے۔ انہوں نے اُس کے سامنے انگریز کے مرتب کردہ مطالبات رکھے:

1- نوری نصیر خان اول کے آئین اور رسوم و رواج کے مطابق حکومت کی جائے۔
2- نصیر خان نے جو باضابطہ فوج قائم کی، اُسے توڑ دیا جائے۔
3- نظامِ حکومت چلانے کے لیے وزیر مقرر کرنے کا حق سرداروں کو حاصل ہو۔
4- ملک کے سول اور فوجی معاملات میں سرداروں کی رائے کو دخل ہو۔
5- وزیرِ دربار گل محمد کو برطرف کیا جائے۔(1)۔

قصہ کوتاہ، سرداروں اور انگریزوں نے مل کر ھذاداث خان کو مفلوج رکھنے کی طویل سازشیں جاری رکھیں۔ انگریز سامراج اور اُس کے حاشیہ بردار، وسطی ایشیا کے کسی بھی دربار کو اپنی شکرے والی نگاہوں سے اوجھل نہیں رکھ سکتے تھے۔ اِن درباروں کے مالکوں کو ایک طرح سے لگام پہنائے رکھنا اُن کی زندگی اور بقا کے لیے ضروری تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ مخالفت میں ایک گروہ کو پالتے رہے تاکہ جب خان بہت منہ زوری دکھائے تو اُس کو آنکھیں دکھا کر دوبارہ کنٹرول میں رکھا جائے۔ سنڈیمن سے لے کر راجہ احمد خان اور مرکزی پکی اصلی اسٹیبلشمنٹ آج تک یہی تو کرتی رہی ہے۔ میر ادل، گل خان بابا کے ساتھ متفق ہوتے ہوئے بھی سب گناہ ھذاداث خان کے سر تھوپنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ ایک سر چکرا دینے والے عہد میں دوطرفہ سازشوں میں گھرا ایک نوجوان وہی کچھ کرے گا جو ھذاداث کرتا رہا۔ اُس کی بدقسمتی کہ یہ سازشیں نہ وقتی تھیں، نہ مختصر تھیں اور نہ ہی محض مقامی۔ یہ سازشیں اُس کی حکمرانی کے پورے عرصے تک قائم رہیں۔

دربار اور درباری نوازشوں سازشوں پہ تین حرف بھیجئے۔ آیئے بلوچ کی بات کریں، عوام، عوام الناس کی بات کریں۔ اس لیے کہ پوری تاریخ میں فیصلہ کن قوت تو عام آدمی رہا ہے۔ وہی

دانشور ہے، وہی سپاہی ہے، وہی سپاہ ہے، اور وہی جنگی حکمتِ علی کا ماہر ہے۔..... باقی تو سب، مایا ہے۔

اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یورپ ٹیلیگراف، اور دخانی جہازوں کی ایجاد واستعمال کے بموجب طاقت کا پانسہ اپنے حق میں پلٹ چکا تھا۔ مگر بلوچستان تو جغرافیائی لحاظ سے بھی ایک ''وکھرا'' خطہ ہے۔ نفسک اور بار بوٹز میں دخانی جہاز نے کیا کرنا تھا اور ٹیلیگراف نے کیا آسمان گرانا تھا۔

بلوچ، اردگرد کو خود پہ مسلط نہ ہونے دینے، اور اپنی سامراج دشمن جدوجہد کو جاری رکھنے میں لگا رہا۔ وہ مستقلاً انگریزوں پر حملے کرتا رہتا تھا۔ 1857ء میں ''ہان بند'' اور کوہ سلیمان کے دیگر مقامات میں بزدار قبیلے نے انگریز کے خلاف زبردست جنگیں کیں۔ اسی سال مری نے راجن پور کی چھاؤنی پر حملہ کر دیا اور انگریز کے طرفدار، دریشک سردار بجار خان، اُس کا بیٹا دریھنڑ خان اور 38 دیگر انگریز دوست قتل ہوئے (2)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اُسی سال بلوچستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے لوگوں نے بھی انگریز کے خلاف بڑی بغاوت کی۔ عوام ناکام ہوئے، مغل خاندان کا آخری بادشاہ کمپنی کی طرف سے برما میں قید ہوا۔ اور ''دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں'' کہہ کر وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ لیکن اِس عوامی اُبھار نے کمپنی کی عمر بھی ختم کر دی۔

لیکن تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان (اور پاکستان) کی تاریخ کی کتابوں میں 1857 کی جس جنگ آزادی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اس میں بلوچوں کی طرف سے طویل اور مسلسل مزاحمتی جنگ کا تذکرہ تک نہیں ہے۔ ایسے متعصّبانہ نصاب کے خلاف نفرت نہ کی جائے تو اور کیا کیا جائے!۔ اور ایسی جہالت والی ڈگری کو اصلی ڈگری کیسے مانا جائے!۔

22 دسمبر 1857ء کو ھذاداث خان اور سرداروں کے درمیان تباہ کن خانہ جنگی میں شدت لائی گئی۔ انگریزی سامراج' فریقین کو مختلف طریقوں اور ذرائع سے ابھارتا رہا۔ فریقین، جو دونوں کے دونوں برطانوی مدد وامداد پر انحصار کرتے تھے۔ اور برطانیہ چور اور مالک دونوں کے ساتھ تھا۔ اس خانہ جنگی (اور بعد کی ہزاروں خانہ جنگیوں) کے شعلوں نے بلوچوں کی قومی حکومت کی تشکیل اور ترقی کو بہت نقصان پہنچایا۔

اِسی زمانے میں ہمارے اپنے ہاں مشرقی بلوچستان میں ایک تباہ کن خانہ جنگی ہوئی: چمبھڑی کی جنگ۔

ہوا یوں کہ 1858ء کے اندر غلام مرتضےٰ نے اپنے والد سردار سلام خان کے بعد بگٹی کی سرداری سنبھالی۔ اس نے کاہان کے راستے مریوں پر 700 افراد کے ایک لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا۔ مگر بگٹیوں کی واپسی کے راستہ کو مری نے روک لیا اور دونوں قبیلے ''شم'' کے میدان کی شمالی جانب ایک دوسرے کے مقابل جمع ہو گئے۔ آخر چمبھڑی کے مقام پر بگٹیوں نے مری پر حملہ کر دیا۔ یہاں 130 مری مارے گئے اور بہت سے دوسرے مہلک طور پر زخمی ہوئے۔ بگٹی کے 40 افراد مارے گئے۔ (کُل بنے 170 انسان!)۔ مست توکلی کی اس جنگ میں موجودگی، اور اُس عظیم مصرعے کی بدولت میں اِس جنگ کا تذکرہ کر رہا ہوں جس میں دنیا میں کسی بھی بہادری کے نعرے سے بڑا مصرع اُن سے تخلیق ہوا تھا:

جواں نہ یاں جنگانی بذیں بولی

ساری بلوچ خانہ جنگیاں اس ایک مصرعے کے قربان جائیں!!

دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ اُس وقت انگریز فوج کا گشت کرنے والا ایک دستہ شاہ پور کے قریب موجود تھا اور وہ کھڑا اِس برادر کش جنگ کا نظارہ کرتا رہا (3)۔ ارے، بلوچ تو دو بچوں کو لڑتا دیکھتا ہو تو انہیں چُھڑانے دوڑ آتا ہے۔ انگریز کیسا بدتہذیب سامراجی تھا کہ دو مسلح قبیلوں کو قتل و غارت کرتے ہوئے بیچ بچاؤ کرنے کے بجائے اُن کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سولائزڈ مغرب!!

2۔1857 کی جنگ

بلوچستان کے شمالی سرحدوں سے لے کر ہندوستان کے جنوبی کونے تک ہر طبقے کی تباہی اس حد تک پہنچی کہ ایک مہیب سماجی انقلاب کی صورت پیدا ہوگئی۔نتیجہ 1857 کی عوامی بغاوت تھی جس نے حد اور سرحد نہ دیکھی اور پورے علاقے میں پھیل گئی۔(4)

1857 کا انقلاب پٹ فیڈر کے علاقے میں ابھرا۔وہاں کھوسہ قبیلے کے ایک سرکردہ شخص دل مراد کو اُس کے دو ساتھیوں دریا خان جکھرانی اور سید عنایت علی شاہ کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا۔اُس کے ساتھیوں کو تو عدن جلا وطن کیا گیا اور خود اُسے عمر قید دے کر کالا پانی (جزیرہ انڈیمان) بھیج دیا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا تھا۔نام نہاد ''مہذب'' انگریز نے اس کی لاش تک واپس نہ آنے دی۔

دلمراد خان کے بھائی شاہل خان کو بھی گرفتار کر کے مچ جیل میں پھینک دیا گیا جہاں اُسے شیشہ پینے پر لگا دیا گیا۔یوں وہ اندھا ہوگیا اور اسے ایک نابینا شخص کے بطور رہا کر دیا گیا۔

دلمراد اور دریا خان کی وسیع اراضی کو ضبط کیا گیا۔سردار کا ٹائٹل بھی لے لیا گیا۔

3۔اُدھر کمپنی، حکومتِ برطانیہ میں ضم

اگست 1858 میں یو کے یعنی برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ یعنی قانون پاس کیا، جس کو انڈیا ایکٹ 1858 کہتے ہیں۔اس ایکٹ کے ذریعے ''برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی'' کو تحلیل کر کے کمپنی کے تمام اثاثے، ملازمین، ذمہ داریاں اور حقوق وفرائض براہِ راست تاج برطانیہ کے تصرف میں دے دیے گئے۔یعنی 1858 سے پورا برصغیر عملاً برطانیہ راج کے تسلط میں آ گیا اور یہ سلسلہ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ تک جاری رہا۔

1858ء میں برطانوی پارلیمنٹ (جس کے اندر ظاہر ہے، سرمایہ دار طبقے کا اثر تھا) نے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی سخت مخالفت کی۔دلچسپ ہے کہ یہ کمپنی برطانیہ کی محض ایک تجارتی کمپنی تھی۔مگر طاقتور اِس قدر کہ ملک برطانیہ سے کئی گنا بڑے ہندوستان پر اُس کی حکومت قائم تھی۔حکومت برطانیہ کو بالآخر ہوش آیا۔اُس نے کمپنی کو لگام دی اور آخر کار مشرق میں کمپنی کی حکومت ختم کر کے اُس خطے کو براہ راست تاجِ برطانیہ کے تحت دے دیا۔(واضح رہے کہ برٹش انڈیا کمپنی مصالحہ جات کی تجارت کے لیے سال 1600 میں ملکہ ایلزبتھ اول کے ایک شاہی فرمان کے تحت قائم کی گئی تھی)۔

ہندوستان میں دیسی فوجی دستوں کی سنگین بغاوت کے باعث 1859 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی نے برطانوی سلطنت سے الحاق کرلیا۔''ہندوستان کی بہتر حکومت کے لیے ایک اقدام'' کے عنوان سے گورنر جنرل کے' وائسرائے بننے کا واقعہ ہوا، جو خود مختار تھا۔کمپنی کی جگہ ہندوستان میں سیکرٹری برائے حکومت نے لی جو براہِ راست برطانوی مجلس قانون ساز کو جواب دہ تھا۔1877 میں لارڈ بیکنس فیلڈ نے کمپنی کی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور اُس کی ترغیب پر ملکہ وکٹوریہ اب ہندوستان کی ملکہ بھی بن گئی۔اُس کے بعد اس منطقے کی منڈیاں محض ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ہی مخصوص نہ رہیں بلکہ یہ انگلستان کے سارے صنعت کاروں کے لیے کھل گئیں۔حکومت برطانیہ نے یہاں ہندوستان میں اپنا ایک وائسرائے (نائب) مقرر کیا اور وہاں لندن میں ہندوستان کے امور کے لیے ایک وزیر مقرر کیا جسے ''سیکرٹری آف سٹیٹ'' کہتے تھے۔اِس سیکرٹری (وزیر) کی مدد کے لیے ایک پندرہ رکنی کمیٹی بنی جسے ''انڈیا کونسل'' کہتے تھے۔

وائسرائے نے یکم نومبر 1858ء میں الٰہ آباد میں ایک دربار منعقد کر کے ملکہ وکٹوریہ کا ایک

شاہی فرمان پڑھا' جس کی رو سے ہندوستان کی رعایا کے تمام افراد کو مساوی حقوق دیے گئے۔ ہر شخص کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی۔ دیسی ریاستوں کو متبنیٰ بنانے کی آزادی دی گئی۔ گویا ریاستوں کے الحاق کی پالیسی ترک کر دی گئی۔

.....مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھیڑیا انسان بن گیا، یا اُس نے شکار سے توبہ کر لی۔

4۔جنگِ میامی

17 فروری بروز جمعہ 1843 کو میامی (موجودہ سندھ) کے مقام پر چارلس نیپئر اور میر نصیر خان تالپور کی قیادت میں انگریز اور تالپروں کے بیچ جنگ ہوئی۔ نیپئر کے نیچے کپتان جان جیکب، ہکٹ، میجر جیکسن اور دیگر لوگ تھے۔ انہوں نے تالپور بلوچوں سے امن کا معاہدہ کر لیا اور واپس ہو گئے۔ مگر پھر معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اچانک واپس ہوئے اور بے خبر بلوچ افواج پہ حملہ کر دیا۔ تالپور فوج شہدادانی، چاکرانڑیں اور خانانی تالپوروں پر مشتمل تھی۔ دیگر بلوچ قبائل میں نظامانڑیں، باگرانڑیں، مری، جمالی، چنگ، گوپانگ، جتوئی، کورائی، رند، لاشاری، شاہوانڑیں بھرگڑی اور چلگری اس جنگ میں شامل تھے۔ ہوش محمد کمبرانڑیں (شیدی) آرٹلری انچارج تھا۔ بلوچ آرمی کا جنگی نعرہ تھا: مرویسوں پر سندھ نہ ڈیسوں''۔اس بہت بڑی، مگر مورخوں کی طرف سے بری طرح نظر انداز کردہ جنگ میں بلوچ چھ ہزار افراد کی نمیرانی (شہادت) دے گئے جبکہ انگریز کے 20 آفیسر اور 256 قبضہ گر مارے گئے۔

بہادر حکمران میر نصیر خان تالپور کو نظر بند کیا گیا اور قلعہ حیدرآباد پر برٹش حکومت کا جھنڈا نصب کیا گیا۔ نصیر خان کو دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کلکتہ میں اسی نظر بندی کے دوران میر نصیر خان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی میت حیدرآباد لائی گئی اور ''میرن جا قبا'' میں دفن کی گئی (5)۔

5-فرسٹ ماوندوار

(1859)

1859 میں مری نے خانِ کلات ھذاداث خان اور برطانیہ کی مشترک فوجوں کے خلاف جنگ کی۔

اُس زمانے میں کاہان اور ماوند ہی مری کی کچی دیواروں اور فصیلوں والے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ سارا مری ماونداور کاہان کے علاقے میں اپنی خانہ بدوشیاں کرتا تھا۔

انگریزوں کی طرف سے بلوچستان کے مشرق پہ چوتھا بڑا حملہ پھر 1859ء میں کیا گیا۔ اُس برس 21 جنوری کو انگریزوں کے ہانکے ہوئے خانِ کلات ھذاداث خان کی چار ہزار ہارس اور چار ہزار پیدل کرائے کی فوج گرجتی، ہنہناتی بھاگ اور ڈیرہ بگٹی کے راستے مری کے پہاڑوں میں آئی۔ فرمائش کرنل جان جیکب کی تھی۔ اور اُس کی افواج کی سنگت کی تھی میجر ہنری گرین نے۔ اے ڈبلیو ھیوگز نے اس مہم کے بارے میں لکھا: ''یہ نہ سمجھا جائے کہ خان نے خود ہی مریوں کی سرکوبی کے لیے اتنی بڑی فوج اکٹھی کر لی تھی۔ اصل میں میجر ہنری گرین نے ریاست کی ساری طاقت اپنے گرد جمع کر لی تھی۔ اور اس نے خان اور اس کے سرداروں کو بھی اس پر متحد کر لیا تھا.....اس ساری مہم کی کامیابی کا سہرا اُسی کے سر جاتا ہے'' (6)۔ ہیوگز نہ بھی لکھتا تو ہم کو یہ سب کچھ معلوم ہے اس لیے کہ ہم نے گذشتہ تین سو برسوں سے یہی کچھ دیکھا، یہی کچھ بھگتا۔

پانی کی کمی کے خطرے کی وجہ سے ساری فوج کو ایک ہی وقت بھیجنے کی بجائے فروری کی پانچ تاریخ کو فوج کا ایک حصہ کاہان قلعے کو سر کرنے بھیج دیا گیا اور باقی لوگ پیچھے رہے۔ خان کلات بھی پیچھے رہ گیا اور تین دن بعد یعنی آٹھ تاریخ کو اُس وقت کاہان پہنچا جب اُس کی اتحادی افواج بغیر مزاحمت کے پچھلے روز کاہان پر قبضہ کر چکی تھیں۔ (ایسے مواقع پر بلوچ مزاحمت کی بجائے بکھر جاتے ہیں، اور پھر اپنے لیے موزوں وقت تلاش کرنے اور پھر خود اپنی موسیقی پر رقص کرنے کا انتظار کرتے ہیں)۔

اب ''ہز ہائی نس'' بے چارہ کیا کرتا؟۔ کوئی موجود نہ تھا تو حملہ کس پر کرتا؟۔ بے کاری میں

جھنجھلا کر اس نے (یا پھر اُس کے آقا انگریز نے) قلعے کو تباہ کرنے کا حکم دے دیا۔ خون بہانے کا موقع نہ ملنے پر کفِ افسوس ملتے اِس مجبور کٹھ پتلی نے کچھ روز کاہان میں قیام کیا، سستا لیا، سپلائی ہتھیالی، کچھ مویشی آس پاس سے لوٹ لیے، غاروں میں چھپایا ہوا مریوں کا اناج لوٹ لیا۔ مکمل تاراج۔ مکمل بربادی۔

لیمبرک اس قصّے کو یوں بیان کرتا ہے: ''ہنری گرین، خان کی فوج کے ساتھ تھا، سندھ ہارس کا ایک سکواڈرن موجود تھا۔ کاہان کا قلعہ تباہ کیا گیا۔ اور فوج کی تین ٹولیاں جدا جدا اطراف کو بھیج دی گئیں۔ انہوں نے مری کی بہت سی مسلح ٹولیوں کو نقصان پہنچایا اور ہزار کے قریب مویشی جمع کر کے لائے''۔

پچھلے صفحات میں ہم نے تذکرہ کیا تھا کہ 1840 میں جنگِ نفسک میں انگریزی فوجوں سے مری نے تین توپیں چھین لی تھیں۔ مری کے لیے یہ توپیں بے کار ہونے کے باوجود فتح کی ٹرافیاں تھیں۔ ایسا اعزاز جو سامراج دشمن جنگ میں نہ صرف فخر و ناز کا سبب تھا بلکہ اِس جنگ کو جاری و ساری رکھنے کی ترغیب بھی۔ مگر کوہستانی جنگ میں اِن بیکار ہتھیاروں کو دشمن کے ہاتھ چھنوا دینا انگریز کے لیے تو ہزیمت کی نشانیاں تھیں۔ یہ انگریزوں کے دل پہ ہمیشہ سے بوجھ تھیں۔ اب چونکہ علاقہ اچھی طرح قبضے میں تھا، طاقت بھی انگریز کی برتر تھی، کمزور پر ویسے بھی مرشد کمک دیتا ہے۔ لہٰذا توپوں میں سے ایک مل گئی جو قلعے کے ایک برج پر پوزیشن سنبھالے ہوئے رکھی تھی۔ دوسری توپ قبرستان میں ایک نئی قبر کی تہہ میں رکھی ہوئی تھی۔ تیسری توپ ایک بڑی کھائی میں دھکا دے کر گرائی گئی تھی جو تلاش کرنے کے باوجود نہ ملی۔

چنانچہ بیس برس بعد انگریز کی بزدلی اور بلوچ بہادری کی اِن نشانیوں کو بازیاب کر لیا گیا۔ انگریز ایسے خوش، جیسے چرواہے کا کھویا بکرا مل گیا ہو۔ جھٹ سے تنخواہ دار سپاہیوں نے دھکے دے دے کر انہیں جیکب آباد چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ جہاں جنرل جیکب کی آنکھیں اِن توپوں کے دیدار کے لیے اندھی ہو رہی تھیں۔ وہ بے قراری سے اُن کے انتظار میں تھا لیکن نومبر 1859ء میں توپوں کے پہنچنے سے ذرا قبل ملک الموت نے اس توسیع پسند شخص کی زندگی کی وسعت ختم کر ڈالی۔ جیکب توپوں کے دیدار سے محروم ہی رہا۔ (ایک ناول، ایک فلم کے لیے کتنا خوبصورت پلاٹ ہے یہ؟)۔

بہرحال، کاہان پر اِس فاتحانہ کاروائی کے بعد گرین اور خان کلات کی مشترکہ فوج دو ٹولیوں میں بٹ گئی اور الگ الگ راستوں سے شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ ماوند جا کر یہ دونوں ٹولیاں آپس میں مل گئیں۔ جہاں جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق مری بہادر بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ مگر مری نے یہاں بھی ان کا سامنا نہیں کیا اس لیے کہ بیرونی حملہ آور کے خلاف آمنے سامنے کی جنگ اُن کی جنگی حکمتِ عملی میں کبھی شامل ہی نہ رہی۔

انگریز نے اُس وقت کے ماوند کو مٹی کے دو قلعوں والا پایا۔

فروری کی 28 تاریخ (1859) کو مری سردار نور محمد نے ہتھیار ڈال دیے۔ (نور محمد اپنے بھائی دین محمد خان کی جگہ تمندار بن چکا تھا)۔ مری سردار نے خان کی بڑائی کو مان لیا اور اپنی نیک چلنی کی ضمانت دی۔

انگریز اور خان کی فوج نے مری سردار اور دیگر وڈیرے بحیثیت یرغمالی ساتھ لیے۔ ماوند سے ھذاداث خان کی فوج پھر دو حصوں میں بٹ گئی۔ اور آگے بڑھتی گئی۔ وہ مری کے خالی کردہ قلعے اور مورچے تباہ کرتی گئی۔ اور اُس کی فوج کرماڑی، چاکر کور اور تلی کے راستے 14 مارچ کو پہاڑوں سے باہر نکل آئی۔(7)۔

اِدھر سے فراغت پائی تو انگریز کو دُور، مغربی بلوچستان سے ایرانیوں کو ہٹانے کا خیال آیا۔ لارڈ کرزن کے بقول انیسویں صدی کے پہلے نصف میں'' مغربی بلوچستان کی بندرگاہوں پر ایران کی کسی طرح کی اتھارٹی نہ تھی۔ گیہہ، باہو اور سرباز کے سارے علاقے اپنے سرداروں کے تحت آزاد تھے''۔(8)۔

بقیہ بلوچستان کا بھی یہی حال تھا۔ یہی گرین نہ صرف خان کو راضی کر لیتا ہے بلکہ سارا وان

اور جہلاوان کے سرداروں کو بھی دانہ چگنے کا موقع دیتا ہے۔لہٰذا خراسان ومکران قربان انگریز پہ۔

6۔سیکنڈ ماوند، وار

(1862)

پچھلے حملے کے محض تین سال بعد ایک بار پھر مری قبیلے پہ غنیم کا غصہ ناقابل برداشت ہوگیا۔ خانِ کلات ''خان ھذاداث خان'' اپنی اور ہنری گرین کی انگریز فوج کو ساتھ لے کر مری قبیلے پہ ٹوٹ پڑا۔اُس کے پاس آٹھ ہزار سپاہ اور کئی توپیں تھیں۔یہ حملہ اس نے 1862ء میں کیا۔

مگر اِس بار، ایک شدید وگھمسان کی جنگ کے بعد اِن دونوں استعماری افواج نے شکست کھائی اور ایک بار پھر اپنی توپیں ماوند کے علاقے میں چھوڑ دیں(9)۔

خان ھذاداث خان سے متعلق ایک اور دلچسپ بات۔ہم حالیہ زمانوں میں بلوچستان کے منتخب وزیروں کے کرتوتوں کے بارے میں روتے رہتے ہیں جو کہ سیکرٹری کو خاص کوڈ، قلم اور مخصوص دستخط سے بتاتے ہیں کہ سائل کا کام کرنا ہے یا اُسے ویسے ہی ٹرخا دینا ہے۔مگر ہم حیران ہوئے جب معلوم ہوا کہ ہمارے حکمرانوں کی طرف سے رعیت (عوام) کے ساتھ یہ فراڈ تو بہت عرصہ سے جاری تھا۔مشہور ہے کہ خان ھذاداث خان کے پاس دو مہریں ہوا کرتی تھیں۔جس شخص کا کام کرنا ہوتا اس پر، وہ اپنی وہ والی مہر لگاتا جس پر تحریر تھی کہ:''خداداد خان را خدا دادہ است''۔اور جس کا کام نہیں کرنا ہوتا تھا تو اس پر وہ مہر لگاتا جس پر لکھا ہوتا:'' خداداد گاں را خدا دادہ است''۔

7- کلات میں خانہ جنگی

اب آیئے، ایک نظر اُن اسباب پر بھی ڈالیں جن کی بنا پر ھذاداث خان کے خلاف سرداروں اور عوام کی بغاوت رہی اور جس کے نتیجے میں 21 سال تک بلوچستان بدامنی کی آگ

میں جلتا رہا۔

1۔ خان نے قبائلی لشکر کے بجائے ایک باضابطہ فوج رکھی۔اس فوج کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے جو عوام ہی کو ادا کرنے تھے۔اس کے علاوہ اُس کی حکومت معمولی باتوں پر عوام سے بڑے بڑے جرمانے وصول کیا کرتی تھی۔

2۔ خان ھذاداث خان نے ہزاروں کی تعداد میں اونٹ، گھوڑے، خچر اور دنبے پال رکھے تھے۔اس کے ''خان کے نوکر ڈیڑھ خان'' والے کارندے بلوچستان بھر میں ان جانوروں کو چرنے کے لیے لوگوں کی فصلوں میں کھلا چھوڑ دیتے تھے۔

3۔ خان نے اپنے ہی پالے ہوئے سرداروں اور انعام خوروں سے ''غمی'' اور دیگر انعامی اراضیوں کی سندیں طلب کرنا شروع کی تھیں۔اس لیے کہ اُسے معلوم ہوا کہ انعام خوروں نے بیشتر سرکاری اراضیات کو خرد برد کر کے اپنی جاگیروں میں ملا دیا ہے۔

4۔خان نے اپنے بے حد وحساب مویشیوں کے لیے مستنگ کے کاریزات سے سیراب ہونے والی زرخیز زمینوں پر چارے کے بطور ''ترنگڑ'' کے نام سے ایک نیا ٹیکس لگا دیا۔یہ ٹیکس ہر ایک کاریز سے ہر چار دن بعد ایک ترنگڑ کے حساب سے لیا جاتا تھا۔اس ترنگڑ کا کوئی وزن بھی مقرر نہ تھا۔خان کے کارندے اپنی مرضی کے مطابق اس ترنگڑ کا وزن بڑھاتے رہتے تھے۔کاشتکاروں اور کسانوں نے اس ٹیکس کے خلاف بار بار احتجاج کیا مگر ہر بار اُن کی یہ جدوجہد دبا دی گئی۔

5۔خان نے درہ بولان میں قافلوں کی آمد ورفت کو بڑی حد تک روک دیا تھا۔کیونکہ درہ بولان میں سے گزرنے والے قافلوں سے وصول کردہ محصول میں سرداروں کا بھی حصہ تھا۔خان نے بولان کے بجائے درہ جھالاوان (راج راہ) کو تجارتی کاروانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔اس درے کا سُنگ (محصول) خالص خان کا تھا۔

6۔ مکران میں نخل خرما پر ٹیکس کی رقم بہت بڑھا دی گئی(10)۔

قصہ کوتاہ، ھذاداث خان کی تمام رعایتیں، مصالحتیں اور مصلحتیں بیکار گئیں۔کچھ عرصہ تک تو

انگریز اپنی ڈیلومیسی اور نقد امداد کے ذریعے کام چلاتا رہا مگر جب روس نے ترکستان کی طرف پیش قدمی کی تو انگریز نے بلوچستان میں ایک ریلوے اور ٹیلیگراف لائن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے سنڈیمن آگے آیا اور اس نے کلات پہنچ کر سرداروں اور خان کے بیچ معاملات طے کروائے۔

اس کا اگلا خطرناک قدم ہر قبیلے کو اس کے اپنے سردار کے ذریعے کنٹرول کروانے کا تھا۔ یہ گویا ''بالواسطہ حکمرانی کا سنڈیمنی نظام'' بن گیا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ انگریز نے افغانستان اور انڈیا کے ساتھ ہمارے تجارتی حقوق' خان سے 30 ہزار روپے سالانہ کے عوض خرید لیے(11)۔

قبیلوں کے سردار، انگریز ''تنخواہ داری'' میں اپنے قبیلے کو پرامن رکھتے تھے اور اپنے قبیلے کی ذیلی شاخوں کے بیچ آپسی جھگڑوں کا جرگوں کے ذریعے تصفیہ کرتے تھے۔ مگر جرگوں کے فیصلوں پر آخری ''ویٹوئی'' دستخط انگریزی افسر کے ہونے لازم تھے۔ یوں بلوچ مرکزیت توڑ دی گئی اور ہمارا ہر قبیلہ ایک الگ خودمختار ریاست بن گیا۔ بلوچ کی اجتماعیت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ خان کی پھننے خانی ختم ہوگئی۔ اب وہ کسی پر حملہ کرنے کے قابل نہ رہا۔ اُس کی حیثیت بس ایک دعا گو کی رہ گئی۔

16 مارچ 1863 کو اُس کے خالہ کے بیٹے شیر دل نے تلوار مار کر ھذاداث خان کو زخمی کر دیا۔ شیر دل خان بن گیا۔ مگر ایک سال کے اندر اندر خود اُسے قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ، نصیر آباد میں خاموشی سے جلاوطن ھذاداث خان دوبارہ خان بنا۔ (معلوم نہیں لوگ نظام کی پوری مشینری کو ایک فرد سے کیوں جوڑتے ہیں اور اُسے فرد واحد ہی سے ختم ہو جانے کی امید کیوں رکھتے رہے ہیں!!)۔

یوں ایک سال کے وقفے کے بعد ھذاداث خان دوبارہ حکمران بنا، یعنی 1864 میں۔

8- غلام حسین بگٹی کی یلغار

بلوچ اُن چند اقوام میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنے وطن پہ قابض انگریزوں کو کبھی قرار میں ٹکنے نہ دیا۔ ہمارے ہاں بلکہ کمال کاروائی ہوئی۔ اگر انگریز کے خلاف اپنی لڑائی لڑ کر کوہِ سلیمان ذرا سا سستانے بیٹھ گیا تو جھلاوان نے ہتھیار اٹھا لیے، وہاں وقفہ آیا تو ساحلی بلوچ نے انگریز کو بلبلا اٹھنے پہ لگائے رکھا۔

اور وہاں خاموشی ہوئی تو دالبندین و چاہ بہار اُس پہ ٹوٹ پڑے۔ اور ایسا بغیر کسی مرکزی کمان میں ہوتا رہا۔ ہر قبیلہ خود ایک آرگنزم تھا، آزادانہ عمل کرتا ہوا ایک مشین۔ اور جب یک نقاطی قومی ایجنڈہ نو آبادکار کو نکالنا ہو تو پھر جرگہ جلسہ کیسا، میٹنگ کیسی؟۔ جس کو جب اور جہاں موقع ملا، وار کر دیا۔

26 جنوری 1867ء کو غلام حسین بگٹی نے بارہ سو (پندرہ سو) مری بگٹی اور کھیتر ان آزادی پسندوں کے ساتھ ہڑند پر حملہ کر دیا۔(12)۔ اس نے وہاں بہت نقصان پہنچایا اور سیکڑوں مویشی لوٹ لیے۔ انگریز اس سے بہت تنگ آچکا تھا۔ لہذا اُس نے ''اپنے اعتماد والے آدمی اُس کے ساتھ کر دیے جو اس کی حرکتوں کی خبر کرتے تھے''(13)۔ یوں انگریز کو اُس کے خلاف سازشی کاروائی کرنے میں آسانیاں میسر ہونے لگیں۔

اور ایک کاری ضرب غلام حسین پہ لگا ہی لی۔ ہوا یوں کہ بگٹی قبیلہ کے سردار نے راجن پور میں متعین انگریز ''میجر پیگٹ'' کو خبر کر دی کہ غلام حسین آفت بن کر ہڑند پر حملہ آور ہوا۔ ہڑند پر یہ یلغار صبح کے وقت کی گئی۔ چاروں طرف اس تباہ کاری کی خبر پہنچی اور گورشانی سردار غلام حیدر نے 350 لڑاکا جمع کر دیے اور ہڑند کی راہ لی۔ زبردست جنگ ہوئی۔ غلام حسین کے ساتھ 258 بلوچ شہید ہو گئے۔ ان میں سے 93 بگٹی بہادر تھے، 70 میریں مری تھے' اور 95 سرفروش کھیتران تھے۔ اس جنگ میں 24 مہان بلوچ گرفتار ہوئے۔ (کاش اس ''کربلا'' کا تذکرہ بلوچی شاعری کی صورت میں کہیں موجود ہو، اور ہمیں دستیاب ہو جائے۔ ہمیں غلام حسین بگٹی

جیسے بڑے سامراج دشمن قہرمان کو تاریخ کے گرد کے حوالے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

بروس کی کتاب میں غلام حسین شہید کی موت کا ذکر انتہائی بھیانک اور اندوہناک انداز میں موجود ہے: ''جب سنڈیمن ہڑند کی طرف جا رہا تھا تو ایک گورشانی سوار بہت ہیجانی انداز میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف آیا۔ اُسے بولنے میں بہت مشکل ہو رہی تھی۔ بس، وہ اس قدر ہکلا سکا: ''یہ ہے غلام حسین کا سر'' اور اس نے اپنے گھوڑے کا توبرا الٹ دیا۔ ایک آدمی کا سر نیچے زمین پر لڑھکنے لگا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ مجھے خدشہ تھا کہ میرے اس دعویٰ پر کوئی بھروسہ نہیں کرے گا کہ غلام حسین کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔ اس لیے میں اُس کا سر کاٹ کر ثبوت کے بطور لایا ہوں'' (14)۔

اس عظیم کارنامے پر انگریز نے جمعدار امام خان کو خلعت دی۔ سردار غلام حیدر گورشانیوں کو بھی اس کی مزدوری کا معاوضہ یوں ملا کہ انگریز نے اُسے اس کی ضبط شدہ زمینیں دوبارہ دے دیں ۔

اس لڑائی میں سات انگریز مر گئے اور ساٹھ زخمی ہو گئے ۔ اُس وقت سنڈیمن ،ڈیرہ غازیخان کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے سندھ کے حاکم ہنری گرین سے ایک خط میں زوردار طریقے سے درخواست کی کہ خان کلات سے اِس نقصان کا تاوان وصول کرے اور مشرقی قبائل کو لگام دینے کو کہے۔ مگر گرین نے جواب میں اُسے بتایا کہ یہ قبائل برائے نام خان کی رعیت ہیں۔ اور یہ اس کے کنٹرول میں نہیں ہیں۔ تب سنڈیمن نے دوسرا طریقہ نکالا۔ اس کے پاس جو قیدی تھے اس نے ان کے ذریعے سرداروں سے اطاعت کروائی اور کچھ لوگ تو سرکاری نوکر بھی بن گئے (15)۔

مشرقی قبائل کو لیویز میں بھرتی کرنے کا کام 1867ء میں ہڑند کے حملے سے شروع ہوا۔ سنڈیمن نے ہمارے قبائلی نظام کو سب سے زیادہ سمجھا اور اُس کو بہترین طور پر استعمال کیا۔ اس نے ہمارے رواج، سردار کی اتھارٹی اور ہمارے عوام کی نفسیات کو سمجھنے کے بعد اُس سب سے خوب کھیلا۔ مرتے ہوئے قبائلی نظام کو دوبارہ زندگی عطا کرنے اور اسے اگلے دوسو سال تک توانائی اور آکسیجن بخشنے کا واحد ذمہ دار سنڈیمن کا ابلیسی ذہن تھا۔ اسی نے ڈیرہ غازی خان میں سرداروں کو نوکریاں دینا شروع کیا تھا۔ وہیں پر اس نے قبائلی رواج کو دوبارہ مسلط کرنے کی پہل کاری شروع کی تھی۔ مری اور دریشک ومزاری کے درمیان بہت پرانی لڑائی جاری تھی۔ سنڈیمن نے اس کا فیصلہ قبائلی رواج کے مطابق کیا۔ اس نے مری کے سردار سے اصرار کیا کہ صُلح کے لیے دریشک اور مزاری سرداروں کو اپنی بھتیجی ''بیٹی'' کے بطور دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا (16)۔ (میں نے تو کسی این جی او کو سنڈیمن کی مذمت کرتے نہیں سنا!!)۔

جیسے کہ ذکر ہوا سنڈیمن، بلوچستان پر حاکمیت کو ادارتی شکل دینے والوں میں سے اہم ترین شخص تھا۔ ''فاتحِ بلوچستان''، سنڈیمن 25 فروری 1835ء میں انگلینڈ کے پرتھ نامی علاقے میں پیدا ہوا۔ اس کی پہلی اور نمایاں پوسٹنگ ڈیرہ غازی خان میں ہوئی تھی۔ ہم بلوچستان کے مشرقی محاذ کے اِس ہیڈ کوارٹر کا تذکرہ عموماً کم ہی کیا کرتے ہیں۔ ہم بلوچ مورخوں نے ہمہ وقت خوانینِ کلات کو بلوچستان سمجھ کر اُسی کا تذکرہ کیا ہے۔ یوں مغربی، جنوبی اور مشرقی بلوچستان کی تفصیلات شامل ہونے سے رہ گئیں۔

ڈیرہ غازی خان کا پہلا انگریز ڈی سی، کورٹ لینڈ تھا جو 1849ء سے 1859ء تک اس عہدے پر رہا۔ اُس سے کپتن پولاک نے چارج سنبھالا۔ پھر گر اہم، پولاک، منرو، منچن، سنڈیمن، شارٹ، سنڈیمن، گلیڈ سٹون، فرائر، بلیکٹ، فرائر، رابرٹ، تھاربرن، ٹکر، فرائر، میسی، فرائر، پلاؤڈن، ڈیمز، لوئیس ڈیمز اور تھام سن 1896ء تک علی الترتیب بلوچستان کے اِس اہم مشرقی ہیڈ کوارٹر کے ڈی سی رہے۔

دراصل کوہِ سلیمان وہ اولین قبائلی بیس کیمپ رہا جہاں سے بلوچ عوام بیرونی سانڈوں پر چھاپے مارتے تھے اور پھر تیزی سے واپس اپنے پہاڑوں کی لڑی میں جا گھستے تھے، جیسے بچہ ماں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ یہ حالت 1865ء تک جاری رہی۔ مگر، 1866 میں، جب سنڈیمن

آیا تو اس نے سارا منظر نامہ ہی بدل ڈالا۔ اس نے یہ بنیادی فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی حاکمیت کو بہر صورت آزاد قبائل تک وسعت دے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اِن مشرقی قبائل کو خانِ کلات کے بار بار کے اس بیان کے حوالے کرنے سے انکاری تھا کہ اُس کا حکم ان قبائل پر نہیں چلتا۔ اس نے کچھ سرداروں کو اپنی تھالی چاٹنے والا بنا ڈالا اور پھر اُن سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے انہیں خوب استعمال کیا۔ اور ایک واحد شخص سے ایسے ایسے کام لیے جن کے لیے ایک پوری رجمنٹ کی ضرورت پڑتی تھی۔ سردار امام بخش مزاری اس کا اولین شکار بنا۔ کوّا صفت سنڈیمن نے اس کے قبیلے کے افراد کو ملیشیا میں بھرتی کیا۔ زمین، جائیداد، پیسہ، سرمایہ.....

زبردست نتائج دیکھے تو اُس نے اپنا یہ کامیاب حربہ دوسرے قبائل پہ بھی استعمال والے کیا اور وہاں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کیا۔ اس نے قبائلی سرداروں کو اہلیت اور جمہوری انتخاب کے مسلمہ اور جاری اصول کی باقیات کچل ڈالیں۔ اور اُس کے بجائے سرداری کو موروثی بنانے میں لگ گیا۔ اُس نے سرداری نظام کو مضبوط معاشی اور سیاسی بنیادیں مہیا کیں۔

امام بخش بڑے بڑے سرداروں کو گھیر گھار کر لاتا اور انگریزوں کے آگے سجدہ ریز کراتا۔ اس کا بڑا شکار بالآخر بگٹی سردار غلام مرتضےٰ بنا۔ اس سلسلے میں واحد رکاوٹ، عظیم سامراج دشمن بلوچ جناب غلام حسین مسوری تھا۔ وہ انگریز کی ہر نئی چال کا بڑی کامیابی سے توڑ کرتا گیا۔ اور اسی نے پہلی بار مشرقی بلوچستان میں قومی آزادی کی ایک ایسی فوج کھڑی کردی جو کثیر القبائلی تھی۔

سنڈیمن کمال کا تیز شخص تھا، جوڑ توڑ کا بادشاہ۔ وہ لومڑی اور گیدڑ کی طرح مکار تھا۔ مثلاً اس کے باوجود کہ جمال خان لیغاری انگریز اور بلوچوں کے درمیان واسطہ بنا ہوا تھا۔ پھر بھی سنڈیمن نے بروس کو لکھا ''میرے عزیز! جمال خان پر اس وقت تک ہاتھ پھیرتے رہو جب تک کہ ہم اُسے اور اُس کے کھیل کو ختم نہ کردیں اس لیے کہ اُس کے بغیر نہ تو ہم ضلع میں کوئی کام کرسکتے ہیں اور نہ سرحدی قبائل کے اندر''۔

1866ء میں جب سنڈیمن نے کپٹیں منچن سے چارج لیا تو اُس زمانے میں ضلع کے مغربی جانب سارے قبائل ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے۔ پہاڑوں پر سے میدان کے علاقے پر حملے ہوتے تھے۔ مری، بگٹی، کھیتران، بزدار، اور کیسرانڑیں مکمل طور پر خودمختار اور آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں قبائلی تنظیم مجموعی طور پر روبہ زوال تھی۔ سردار، اور معتبرین کی اتھارٹی کم ہوتی جارہی تھی۔ چھوٹا معتبر بڑے سے ناراض تھا اور بڑا سردار، خانِ کلات کے ساتھ لڑا ہوا تھا۔ سنڈیمن ایک مکار شکاری کی طرح اس صورتحال کو ناپ رہا تھا، تول رہا تھا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ وہ مینڈک کی طرح ہر چھلانگ کے بعد رکتا، غور کرتا اور دوسرا اقدام سوچتا۔

یہاں اُسے قبائلی سرداروں کے موروثی اثر میں بے پناہ قوت کا عنصر نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس قوت کو کسی طرح برقرار رکھا جائے اور اپنے زیر اثر رکھا جائے تو یہ انگریزوں کے بڑے کام آسکتا ہے۔ اسی مناسبت سے اُس نے اپنی توجہ سرداروں کے بیچ موجود اُن جھگڑوں کا تصفیہ کرنے اور تمندار کی پوزیشن اور وقار کے دوبارہ قائم کرنے پہ مرکوز کردی۔ یہ چال بلوچ قومی شاہراہ میں بدقسمت اور ظلمت بھری اتھاہ گہرائیوں کی جانب موڑ ثابت ہوا۔ اور آج تک آنے والا ہر حکمران سنڈیمن کی اسی مکروہ پالیسی کی پیروی کرتا رہتا ہے۔

کوہستانی بلوچوں کے حملوں کو روکنے کی سخت ضرورت تھی۔ سنڈیمن نے بالآخر کوہِ سلیمان پہ ڈیرے ڈالنے کا سوچا۔ اُس نے 1867 میں اناری مول اور ماڑی دراگل پہ بنگلے تعمیر کرائے اور وہاں ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ یہ افسروں کے لیے سرد اور صحت مند جگہ بھی تھی۔

اس نے ملتان کے کمشنر کرنل منرو کے نام پر اُس کا نام فورٹ منرو رکھا۔ یہ مقام برطانوی علاقہ سے 25 میل دور واقع تھا۔ آپ کبھی فورٹ منرو جائیں تو آپ سنڈیمن کی لومڑی گیری پر حیران ہوجائیں گے۔ جگہ کا اُس کا انتخاب زبردست تھا۔ واقعتاً یہ جگہ مری، بگٹی، کھیتران، لیغاری اور بزدار جیسے بڑے قبائل کا مشترکہ قریب ترین مقامی تھا۔ یہاں دفتر بنا کر اِن سارے قبائل پر انگریز کا اثر بڑھانے کی کارروائیاں کی جاسکتی تھیں۔ اسی راستے سے وہ تل چوٹیالی کے راستے پنجاب و بلوچستان کے درمیان قدیم تجارتی شاہراہ کو دوبارہ کھول سکتا تھا۔

ایک اور واقعہ نے کوہِ سلیمان پر انگریزی راج کو مستحکم کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یہ 1869ء میں سردار کوڑا خان قیصرانڑیں کی گرفتاری کے سلسلے میں موسیٰ خیل تک انگریزی مارچ تھا۔ واضح رہے کہ سردار کوڑا خان نے ایک بدتمیز انگریز افسر لیفٹیننٹ گرے کو اغوا کر کے یرغمال رکھا تھا۔ خانہ کچھی سے چند ہی کلومیٹر آگے پہاڑ میں ایک غار ہے جسے ''گری جُڈّ و'' کہتے ہیں یعنی گرے کا غار۔ اسی ''جڈ و'' میں کوڑا خان نے لیفٹیننٹ گرے کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ انگریز نے کوہِ سلیمان کے دیگر سرداروں اور تمنداروں کو کوڑا خان کے خلاف استعمال کیا۔ لیغاری، کھوسہ، بزدار، نتکانڑیں، گورشانڑیں کے علاوہ استرانہ اور موسیٰ خیل قبائل بھی اس مہم میں شامل ہوئے۔ چنانچہ 3220 افراد پر مشتمل لشکر کوڑا خان کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ اس لشکر کو متحرک و منظّم کرنے والا بستی عظیم کا سید مہر شاہ تھا جسے انگریزوں نے اس کارنامے کے صلے میں 19665 ایکڑ اراضی عطا کی۔ کوڑا خان نے مجبور ہو کر گرے کو آزاد کر دیا اور خود درہِ درگ عبور کر کے موسیٰ خیل میں پائند خان کے قلعے میں پناہ لی۔ لیکن پائند خان نے مہمان کو انگریزوں کے حوالے کر دیا(17)۔

اس مہم میں انگریز کی امداد کرنے والے قبائل کو انعام سے نوازا گیا۔ مجموعی طور پر 3220 افراد کو دس ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔ ہر فرد کے حصے میں تین روپے آئے۔ اس مہم پر 15000 روپے خرچ ہوئے جو قیصرانڑیں قبیلہ سے بطور جرمانہ وصول کیا گیا۔(18)۔ واضح رہے کہ سردار کوڑا خان کے زمانے میں ڈیرہ غازی خان کے تمام شمالی علاقے، ڈیرہ اسماعیل خان میں شامل تھے۔ مذکورہ علاقے 1862 کے بعد، ڈیرہ اسماعیل خان سے الگ کر کے ڈیرہ غازی خان کی انتظامی حدود میں شامل کئے گئے۔(19)۔

***

زیرک و مکار سنڈیمن نے انگریزوں کے لیے حکمرانی کے رہنما اصول وضع کیے تھے۔ سنڈیمنی نظام کے اصول یہ تھے:

1- کسی مخالف قبیلہ کے بارے میں یہ رائے نہ بناؤ کہ وہ غلطی پر ہے جب تک کہ پرسکون دل اور انصاف کے ساتھ اچھی طرح یقین نہ کر لو۔ تحقیق کرنے سے عموماً معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بہت سی باتیں برحق ہیں۔ اُن کی حق رسی کرو اور اُن سے اچھا سلوک کرو۔

2- قبائل بلا معاوضہ آپ کی خدمت نہیں کریں گے۔ اُن کے سرداروں کو پیسہ دینے کے لیے اپنے ہاتھ کھلے رکھو۔

3- قبائلی افراد، سرداروں اور معتبروں کی عزت کرو اور ان کے سارے معاملات کو جرگہ سے حل کرو۔

4- جب تک ممکن ہو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرو۔ اثر ڈالنے کی کوشش کرو، مگر مداخلت کی کوشش نہ کرو۔

5- خان کے مالیہ دینے والے علاقوں میں مداخلت نہ کرو۔

6- ہر سردار کو اُس کے قبیلہ کے اندرونی معاملات میں آزاد چھوڑ دو۔ لیکن سردار کو اس کے قبائلی افراد کے برے کاموں کا ذمہ دار بناؤ۔

7- خان کے مالیہ دینے والے افراد اور قبائلی آدمیوں کے آپسی جھگڑوں، یا خان کے ملازم اور قبائلی افراد کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ سرداری جرگوں سے کرواؤ۔

8- سردار رئیسانی کو سرِ سردارانِ سراوان اور سردار زرک زئی کو سرِ سردرانِ جہلاوان کے عہدوں پر برقرار رکھو۔(20)۔

9- گولڈ سمتھ لائن

نصیر خان اول جب فوت ہوا (1805) تو کلات کی مرکزی خودمختاری بہت ابتر

صورتحال سے دوچار ہوئی۔ دور دراز مغربی صوبوں کے بلوچ حاکموں اور سرداروں نے اس کشتی سے چھلانگ لگانے میں پہل کردی۔ اور ہر ایک اس سے الگ ہوتا گیا۔ ان میں اہم ترین علاقے ''دزّک''، ''پہرہ'' (ایران شہر)، ''بمپور''، ''باہو دشتیاری''، ''گہہ''، ''سرباز''، ''کسرکند'' شامل تھے۔ ''سرحد'' اور ''بشکرد'' کے سرداروں نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کیا۔

سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم پوزیشن پہرہ کے موروثی ناروئی بلوچ حاکموں کی تھی اور ناروئی خاندان کی یہ مستحکم حکمرانی 1849 تک قائم رہی۔ شاہ محراب خان ناروئی بلوچ کے دور میں مغربی بلوچستان ایک آزاد مملکت تھی اور اس کے حکمران کو ''دیزک'' (جو کہ ''بزمان'' کے جنوب مشرق سے لے کر شمال میں ''کرمان'' کی سرحد تک پھیلا ہوا) تک تسلیم کیا جاتا تھا۔ مگر 1849 میں فارس کے ایک لشکر کو ''کرمان'' میں بلوچ حملہ آوروں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ اس لشکر نے بلوچوں کو شکست دیتے ہوئے ''بمپور'' پر قبضہ کرلیا جو بلوچوں کا ایک اہم تاریخی، سیاسی وثقافتی مرکز تھا۔(21)۔

اِس ''گجر'' توسیع پسندی میں اُس وقت مزید تیزی آ گئی جب 1861 میں انڈو یورپین ٹیلیگرام لائین کو کراچی سے لے کر گوادر تک اور پھر مغربی بلوچستان کے ساحلی علاقہ ''جاسک'' تک پھیلایا گیا۔ یہ ٹیلیگرام لائین 70-1869 میں مکمل ہوئی۔ اس دوران فارس کے لشکروں نے ''سرباز'' کے ساحلی علاقوں اور بمپور تک پیش قدمی کی۔ ان پیش قدمیوں کو برطانیہ کی خاموش مدد وتعاون حاصل تھی تاکہ وہ فارس اور افغانستان کو برطانیہ کی فارورڈ پالیسی کے تحت بفرسٹیٹ کا درجہ دے دے۔ اور اس طرح روس کی سینٹرل ایشیا اور خاص کر بحیرہ عرب اور بحرۂ بلوچ تک رسائی کو روکا جاسکے۔ برطانیہ نے اپنے ٹیلیگرام لائن اور تنصیبات کو محفوظ بنانے کے لیے آزاد اور خودمختار سرحدی حدود کو نظر انداز کردیا اور مختلف حکمرانوں سے مختلف اوقات میں الگ الگ معاہدے کیے۔ فارس کے بادشاہ کے ساتھ 1858 میں معاہدہ کیا۔ سلطان عمان (مسقط) سے 1865 میں اور مغربی بلوچستان کے ''باہو دشتیاری''، ''گہہ'' اور ''جاسک'' کے سرداروں کے ساتھ 1869 میں معاہدہ کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارس کی حکمرانی ان علاقوں پر نہیں تھی۔ ان کی اپنی ایک آزاد حیثیت تھی۔

لیکن جوں ہی برطانیہ کی ٹیلیگرام لائین مکمل ہوگئی اور اس کے تحفظ کو بلوچ حاکموں کی طرف سے یقینی بنایا گیا تو برطانیہ نے پینترا بدل دیا۔ اُس نے فارس کے حق میں اپنی غیر جانبدار پالیسی کا دکھاوا کیا۔ اور اس کو بلوچ علاقوں میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ فارس کے فوجی دستوں نے پہلے ''سرباز'' کی طرف پیش قدمی کی۔ پھر اچانک اس نے ''کرمان'' کے وزیر کو سرکاری طور پر مغربی بلوچستان کا بااختیار سردار مقرر کردیا۔ مقصد یہ تھا کہ مغربی بلوچستان کو کرمان کے صوبے میں ڈال دیا جائے اور اسے کرمان کے گورنر کے ماتحت کردیا جائے۔ پرشین توسیع پسندی میں اُس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب اس نے انگریزوں کے ساتھ مل کر 1871 میں گولڈ سمتھ لائین کے معاہدے پر دستخط کردیے۔ یوں متحدہ بلوچستان کو اپنے مفادات کے پیش نظر عملاً مشرقی اور مغربی بلوچستان میں تقسیم کیا جو آج بھی پاکستان، ایران اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد کے طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد فارس کو برطانیہ کی مکمل آشیر باد حاصل ہوگئی۔ اس نے اپنی طاقت کو مزید بڑھاتے ہوئے 1872 میں بلوچ علاقہ ''کوہک'' پر قبضہ کیا۔ اور پھر مسقط کے عربوں کو ''چاہ بہار'' پورٹ سے بے دخل کیا جو 1789 سے ان کے قبضہ وتصرف میں تھا۔

اُس نے بزورِ شمشیر آزاد بلوچ ریاست ''بشکرد'' کو 1874 میں اپنی حدود میں شامل کیا اور پھر بتدریج ''سرحد'' کی طرف بڑھتے ہوئے شمالی بلوچستان کو تحویل میں لے لیا۔ لیکن ان تمام فوجی یلغاروں کے باوجود مغربی بلوچستان پر گجر کی حکمرانی حقیقی معنوں میں قائم نہ ہوسکی۔ اس کا دائرۂ اختیار بمپور تک ہی محدود تھا جو اُس زمانے میں بلوچ ریاستوں کا دارالخلافہ کہلاتا تھا۔ باقی علاقے یا مکمل آزاد تھے یا نیم آزاد حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھے۔ البتہ ان کو لگان یا سرکاری مالیہ وصول کرنے کے بہانے پریشان کیا جاتا تھا۔(22)۔

1869 میں ایران نے کلات کی خانی میں دست اندازیاں شروع کیں۔ 1869ء میں بمپور کے ایرانی افسر ابراہیم خان نے کیچ مکران کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ اس کے مقابلے میں سردار فقیر محمد بزنجو ایک لشکر کے ساتھ آیا اور خان کلات کا داروغہ عطا محمد بھی۔

انگریز فارس کے مفاد میں بلوچستان کو اس لیے تقسیم کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے پڑوسی وسطی ایشیا میں 1860 کی دہائی کے اواخر میں مرو کی طرف روس سبک رفتار توسیع کر رہا تھا۔ 1866 میں روس نے بخارا فتح کرلیا اور 1869 میں سمرقند لے لیا۔ جنوبی ایشیا میں موجود برطانیہ اِن سب کو اپنے مفاد کے لیے بہت خطرہ سمجھنے لگا۔

برطانیہ کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق 1871 کے بلوچستان کو ''مغربی بلوچستان'' اور ''مشرقی بلوچستان'' میں تقسیم کیا گیا۔ چنانچہ مغربی بلوچستان کی حدود کا تعین اس طرح کیا گیا : شمال میں صحرائے ''لوط'' اور ایرانی صوبہ خراسان، جنوب اور شمال مغرب میں خلیج عمان اور بحرِ عرب ''آبنائے ہرمز'' سے لے کر گوادر کی بندرگاہ تک، مغرب میں صوبہ کرمان اور گولڈ سمتھ لائین جو پاکستانی اور افغانی بلوچستان کو مشرق میں جا کر آپس میں جدا کرتی ہے۔ لسانی بنیادوں پر جغرافیائی حدود اس طرح بیان کیے گئے کہ مرکز اور شمال مغرب میں جازموریان ضلع کا طاس، شمال میں سرحد کی پھیلی ہوئی وسیع زمین، مشرق میں ماشکیل کا نشیبی علاقہ اور سراوان کا زرعی نخلستان، جنوب میں مکران کا ساحلی علاقہ اور مغربی اضلاع ''بیابان'' اور ''بشکرد''۔ اس میں ہم ہلمند کی پریشان حال خلط ملط لسانی آبادی کو بھی شامل کرسکتے ہیں جو بلوچی اور سیستانی زبان بولتی ہے(23)۔

چنانچہ مغربی بلوچستان میں فارس کی توسیع برطانوی رضا اور مدد کے بغیر ناممکن تھی۔ یہ تو خود لارڈ کرزن نے میں لکھا کہ: ''موجودہ شکل میں ایرانی بلوچستان پچھلے تیس سال کی تخلیق ہے اور ایک بڑی حد تک برطانوی حکومت کی مداخلت اور تسلیم کرنے کی وجہ سے ہے (کرزن ، 1892۔صفحہ 253)۔

اسی زمانے میں انگریزوں نے بھی اپنے اثرات گوادر بندرگاہ تک بڑھا دیے تھے۔ اور خان کلات حذا اداث کو(جو 1865ء کے معاہدے کی بنیاد پہ جاسک و گوادر ٹیلیگراف لائن کی تعمیر میں شامل ہوا تھا) یہ امید تھی کہ انگریز مغربی بلوچستان میں اس کے حق میں ایران کا راستہ روکے گا۔ بمپور کے مسئلے کے حل کے لیے انگریزوں نے گولڈ سمتھ کی ڈیوٹی لگا دی کہ اس معاملے کو دیکھے اور سفارشات دے۔

گولڈ سمتھ ایران و خان کلات کے درمیان بمپور کے واقعہ کے بارے میں مصالحت کنندہ مقررہ ہوا۔ وہ وہاں کے لیے روانہ ہوا۔ 1870 میں گولڈ سمتھ اور کیپٹن ہیریسن، خان کلات کے نمائندہ داروغہ عطا محمد، اور سردار فقیر محمد بزنجو، بمپور کے مقام پر یکجا ہوئے۔ ایران کی طرف سے وزیر خارجہ مرزا معصوم خان آیا۔ انہوں نے ابراہیم خان کی طرف سے بلوچ دیہاتوں پر قبضہ کرنے کا مسئلہ اٹھایا۔ مگر ایرانی نمائندوں نے نہ صرف ان دیہاتوں کو خالی کرنے کی بات نہ مانی بلکہ سارے بلوچ علاقے کی ملکیت کا دعویٰ بھی کر دیا۔ بمپور کانفرنس ناکام ہوگئی لیکن گولڈ سمتھ نے گوادر میں ایک اجتماع منعقد کیا جس میں ہیریسن، خان کلات کا نمائندہ داروغہ عطا محمد، سردار فقیر محمد بزنجو، کیچ کے سردار میر بائیان گچکی اور پنجگور کے سردار گاجیان شامل ہوئے اور ایک معاہدے پر دستخط کرلیے۔

گولڈ سمتھ کا نقشہ منظور ہوا اور اس پر دستخط ہوئے۔ اس طرح بلوچ علاقے جو کہ بعد میں ایرانی بلوچستان کے نام سے مشہور ہوئے، ایران کو دیے گئے۔

اسی لیے بلوچ مسلسل انگریز اور قاچار حکمرانی کے خلاف بغاوتیں کرتے رہے۔ جونہی 72-1871 میں فارس و بلوچ سرحدی کمیشن کا کام ختم ہوا تو 1873 میں جاسک میں گڑ بڑ شروع ہوئی جہاں بیابان علاقہ کے حاکم میر عبدالنبی نے بغاوت کی اور برطانوی ٹیلیگراف تاریں کاٹ دیں۔(حسین بر، صفحہ 82)۔

اس معاہدے کو بعد میں خان کلات کے دستخطوں کی شرفیابی بھی حاصل ہوگئی اور یوں

بلوچوں کا جسم کاٹ کر آدھا کر دیا گیا۔ بقیہ بلوچستان کو بھی اندرونی طور پر کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔

اب ہمارے ٹکڑے کردہ وطن کے حصے بخرے یہ تھے:

1- ھڑند اور داجل (ڈیرہ غازی خان) کے خالص بلوچ علاقہ کو پنجاب میں شامل کیا گیا۔

2- خان گڑھ اور اس کے گردونواح کے بلوچ علاقے کو جیکب آباد کا نام دے کر سندھ کے ساتھ ملا دیا گیا۔

3- مری بگٹی، کھیتر انڑ اور چاغی کے بلوچ علاقوں کو قبائلی علاقے قرار دیا گیا۔

4- نصیر آباد، بولان، شال اور نوشکی کی بلوچ تحصیلوں کو خانِ کلات سے اجارہ پر لے لیا گیا اور پھر ان تمام علاقوں کو معاہدہ گنڈ مک اور ڈیورنڈ لائن کے تحت افغانستان سے حاصل کیے ہوئے علاقوں کے ساتھ ملا کر بلوچستان کا ایک صوبہ بنایا گیا اور جسے برٹش بلوچستان کا نام دیا گیا اور اسے خان کے بجائے براہ راست بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے ماتحت رکھا گیا۔

5- لسبیلہ اور خاران کے بلوچ علاقوں کو جداگانہ ریاست اور خاص علاقہ قرار دے کر ایک علیحدہ نظام کے تحت پولیٹیکل ایجنٹ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

6- اس قطع و برید اور تقسیم در تقسیم کے بعد بلوچستان کے جو اجزا یعنی سراوان، جہلاوان، کچھی اور مکران کے جو ضلعے بچ گئے ان کے مجموعے کو کلات کا نام دے کر میر محمود خان کی حکمرانی کے حوالے کیا گیا۔ اُس کی حکومت صرف محل (میری) تک محدود تھی۔

بلوچستان کو تقسیم کرنے کے وقت سے لے کر بیسویں صدی کے دوسرے نصف تک ایرانی بلوچستان میں کوئی منظّم اور ہمہ گیر تحریک نہ اٹھ سکی۔ سرداروں کی خودرو اور الگ تھلگ بغاوتوں کے واقعات ہی ہوتے رہے جو وہ ایرانی استبداد کے خلاف کرتے رہے۔ اور ان بغاوتوں کو اس انداز میں کچلا جاتا رہا کہ نہ تو حکومت منظّم طور پر علاقے کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتی تھی اور نہ ہی باغی سردار اس قابل ہوتے کہ ظالم ایرانی حکومت کو ظلم و جبر سے روک سکتے۔

واضح رہے کہ ایران میں انیسویں صدی کا دوسرا نصف نصیر الدین قاچار کی بادشاہی میں گزرا۔ اس کا دربار عیاشی کا دربار تھا۔ ٹیلیگراف، سڑکیں، سمندری نقل و حمل، تیل کی باربرداری، بینکاری اور ماہی گیری خارجیوں کے سپرد کی گئیں۔ بڑے بڑے قرض، ٹیکس، محصول اور مالی امور خارجی استعماریوں کے سپرد تھے۔ اور بڑے پیمانے پر یہ کوشش جاری تھی کہ ایران محض زراعتی خام مواد کی پیداوار والا علاقہ ہی رہے اور سرمایہ دار ملکوں کے لیے خام مواد مہیا کرتا رہے۔ اس طرح ایران عملاً ایک نیم مستعمرہ علاقہ بن گیا۔

وہاں کے بلوچستان کے اندر زراعت میں فیوڈل ازم کے پیدواری رشتے قائم تھے۔ خانہ بدوش قبائل میں پدرسری فیوڈل نظام کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ بادشاہ وسیع فیوڈل ملکیتوں کا مالک تھا، دربار سے وابستہ فیوڈلوں اور ملاؤں کا زمین اور آبی وسائل (ندیوں، نہروں اور کاریزوں) پر وسیع طور پر قبضہ تھا۔ ایران نامی استبدادی فیوڈل نظام والے ملک کے اندر وہاں کا بلوچستان سب سے پسماندہ اور غریب علاقہ تھا۔ ایرانی حکومت بلوچ کسانوں اور خانہ بدوشوں پر ناروا مالیہ اور ٹیکس لگاتی، اور توپوں اور فوجوں کے ذریعے یہ مالیہ وصول کرتی۔

اس پس منظر میں مئی 1844 میں شیراز کے میرزا علی محمد نے اپنے ''باب'' ہونے کا اعلان کر دیا۔ باب اُس دروازہ کو کہتے ہیں جہاں سے پوشیدہ امام اپنے وفاداروں سے رابطہ کرتا ہے۔ بابی تحریک کے اس بانی نے مذہبی پیشواؤں کی کوتاہیوں کے خلاف تبلیغ کرنی شروع کر دی۔ اس نے تصور پیش کیا کہ کرۂ ارض پر حق و انصاف کی مملکت ہوگی۔ اس نے حکمران اور ملاؤں کی ناانصافیوں اور ظلم و استبداد کو بے نقاب کیا۔ اس نے عورتوں سے بہتر برتاؤ کرنے کی وکالت کی۔ اسی لیے عورتوں کی بڑی تعداد اُس کی پیروکار بنی۔ اس نے عدالتی سزاؤں کو کم سخت بنانے کے لیے دلائل دیے، اور بچوں کے ساتھ اچھے سلوک کی حمایت کی.....

باب کی تعلیم کے بموجب حق و انصاف کی حکومت یوں تو ساری دنیا میں قائم ہونی تھی مگر سب سے پہلے اُسے ایران کے پانچ صوبوں میں قائم ہونا تھا۔ اس حکومت میں عام مساوات پر

عمل کیا جانا تھا۔ اور مردوں عورتوں کو مساوی حقوق ملنے تھے۔ اس کی تعلیمات فیوڈلزم کی زبردست مخالفت کرتی تھیں۔ اُس کے یہاں عوام الناس کی آرزوؤں کی زبردست عکاسی موجود تھی۔ لیکن ان میں سوداگر طبقات (بازارگان) کا اور بھی زیادہ نمایاں طور پر خیال رکھا گیا۔ باب کا اپنا تعلق بھی سوداگروں ہی کے طبقے سے تھا۔ چنانچہ بابی مملکت میں شخصی، املاکی اور رہائشی حقوق ناقابلِ تنسیخ تھے۔ کاروباری خط و کتابت کو سرکاری جانچ پڑتال کی زد سے محفوظ رکھا جانا تھا۔ قرضوں کی ادائیگی لازمی تھی، قرضوں کی رقم پر سود لینا جائز تھا اور کاروباری سرگرمیوں کی غرض سے سوداگروں کو ''بابی مملکت'' کی سرحدوں سے باہر بھی سفر کرنے کا حق حاصل تھا۔

میرزا علی محمد باب کا خیال تھا کہ شاہ اور اس کے درباری بھی اُس کے پیرو ہو جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ اس کے برعکس اُس کے مسلک کو کاریگروں، کسانوں اور دینی رہنماؤں کے نچلے حلقوں نے قبول کیا۔ حکمرانوں نے بابیوں کے خلاف اقدامات شروع کر دیے۔

1848 میں باب اور اُس کے پیروکاروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ باب اصل میں وہ دروازہ نہیں جہاں سے پوشیدہ امام اپنے عقیدہ تمندوں سے رابطہ کرتا ہے۔ بلکہ وہ تو خود ہی پوشیدہ امام ہے.....اس دعوی سے شیعہ ملاّ اُس کے مخالف بن گئے اور باب جلد ہی گرفتار ہو گیا۔ (24)۔

جیسا کہ ذکر ہوا، کسانوں نے زبردست طور پر بابی تحریک کا اثر قبول کیا۔ اس تحریک کے راہنماؤں میں قراۃ العین طاہرہ کا نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ نہایت بلند پایہ عالمہ بھی تھی۔ اور ایک زبرست مقررہ بھی۔ وہ ملاؤں اور جاگیرداروں کی سنگین مخالف تھی۔ طاہرہ عورتوں کے حقوق کی علمبردار تھی۔ باب کی طرح اُسے بھی قید و بند کی صعوبتیں دی گئیں۔ اُس کے بعد اُس کا گلا دبا کر اُسے ہلاک کر دیا گیا۔

1848 میں مازندران کے صوبے سے ان لوگوں نے بغاوت کا آغاز کیا۔ محمد علی برفروشی کی قیادت میں انہوں نے ''مملکتِ حق و انصاف'' کے قیام کے لیے لوگوں کے اندر اپنی بنیادیں استوار کرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے ساری جائیداد کے مشترک ہونے کا اعلان کر دیا۔ مقامی

حکمرانوں نے کوشش کی کہ ''بابی مملکت'' کے اس مرکز کو کچل ڈالیں، مگر وہ اس میں ناکام رہے۔ اسی طرح دارالحکومت سے شاہ کے بھیجے ہوئے فوجی دستوں کو پسپا کر دیا گیا۔ مازندران کے صوبے میں اس کامیابی نے دوسرے علاقوں میں بھی زبردست اثر ڈالا اور متعدد شہروں میں مسلح جدوجہد کی تیاریاں کی گئیں۔

1849ء کے شروع میں شاہ نے زوردار حملہ کیا۔ بابیوں نے گرمیوں تک شاہ کی سات ہزار فوج کو روکے رکھا۔.....مگر پھر شکست کھائی۔ ان میں سے ایک ایک کو چن کر نہایت وحشیانہ بے رحمی سے تہہ تیغ کر دیا گیا۔ 1850 کے شروع میں باب کو پھانسی دی گئی۔ اور 1852 میں شاہ نصیرالدین پر قاتلانہ حملے کی کوشش پہ 28 بابیوں کو پھانسی دی گئی۔

اس بڑی بغاوت کے تمام سلسلوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک بھر میں فیوڈلوں کے خلاف تحریک ابھی کاریگروں، چھوٹے تاجروں اور کسانوں کی الگ تھلگ، خودرو اور بے ساختہ بغاوتوں کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہی کیفیت بلوچستان کی تھی۔ اور اگر دیکھا جائے تو اُس زمانے میں پورے ایشیا میں جاگیرداری کے خلاف کسی متحدہ تحریک کی رہنمائی اور تنظیم کرنے کی صلاحیت رکھنے والے طبقے ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے۔

جس طرح کہ ماضی میں ہر عوامی تحریک کے ساتھ ہوتا چلا آیا، بابی تحریک کو بھی رفتہ رفتہ اندر سے کھوکھلا کیا گیا۔ اس تحریک کے اوائل میں اس کے اندر موجود کسانوں اور شہری غریبوں نے آزادی اور مساوات کے اپنے تصورات شامل کرنے کی کوشش کی تھی، بعد میں انہیں اس تحریک میں سے حذف کر دیا گیا۔ صاحبِ جائیداد طبقوں نے باب کے شاگردوں میں سے بہاءاللہ نامی ایک شاگرد کے ذریعے اس کے مرشد کی تعلیمات میں تبدیلیاں کرائیں۔ اور اُن تمام اصولوں کو نکال باہر کر دیا جو فیوڈلزم کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں تھے۔ اب اس تحریک کا نام ''بہائی تحریک'' پڑ گیا، جس میں عوام الناس کی حمایت حاصل کرنے کی خوبیاں موجود نہ تھیں۔ اور یہ آگے چل کر سوداگروں کے اُس طبقے کے نظریات سے زیادہ قریب ہو گئی جو غیر ملکی سرمایہ کی

خدمت انجام دیتے تھے۔

چنانچہ فیوڈل ازم زور وشور سے جاری رہا۔ مالیہ اور ٹیکس بڑھتے رہے۔ فوجیوں کو بندوقیں دے کر ٹیکس جمع کرنے بھیجا جاتا تھا۔ لوگوں کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ چنانچہ 1879ء میں ایران بھر میں ظالم حکومت کے خلاف ایک بار پھر بغاوتیں ابھریں۔ بلوچستان میں سراوان، سرحد اور بمپور کے اندر کسانوں کی ایک شاندار بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کی سربراہی حسین خان ناروئی کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اور دوسرے قبیلوں کے سرداروں کی نمائندگی میں کرمان کے والی کو اطلاع کر دی کہ بلوچ یہ طاقت نہیں رکھتے کہ اپنی پیداوار کا تیسرا حصہ سرکار کو بطور ٹیکس دے دیں۔ اس نے مطالبہ کیا کہ کاشتکاروں پہ مالیہ پیداوار کا دسواں حصہ مقرر کیا جائے۔ کرمان کے والی نے مالیہ کم کرنے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ چنانچہ بغاوت ابھری۔ یہ بغاوت انتہائی سرعت کے ساتھ بمپور، کاردیان، دیزک، سرباز، لاشار اور بمپوشت تک پھیل گئی۔ حسین خان ناروئی نے چار ہزار افراد کی سربراہی کرتے ہوئے بمپور، فارج، برفان اور دیگر چھوٹے سرکاری گیریزنوں کا محاصرہ کیا۔ اور بہت تھوڑے وقت میں مغربی (ایرانی) بلوچستان کا اچھا خاصہ علاقہ قبضہ کر لیا۔ دوسرے کسان اور کاشتکار بھی اُن سے ملتے گئے۔ ایرانی سرکار نے نئی افواج بھیجیں، مگر انہیں بلوچ کسانوں نے شکست فاش دی۔ یہ بغاوت تقریباً تین سال تک جاری رہی۔ (25)۔

سرداروں نے کسانوں کی اس بغاوت کے صدقے یہ اختیار بھی حاصل کر لیا کہ مالیہ خود اکٹھا کریں اور جمع کردہ مالیے کا ایک حصہ ایرانی مرکزی حکومت کو دے دیں۔ اس طرح ایرانی مرکزی حکومت بڑے فائدے میں رہی کہ اب اُسے مالیہ اکٹھا کرنے کیلئے اپنی فوج بھیجنے سے چھٹی مل گئی۔ (عوامی تحریکوں کو ہائی جیک کرنے کا سلسلہ بہت قدیم وقتوں سے چلا آ رہا ہے)۔

قاچار ناروائی پالیسیوں نے بلوچ تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے۔ آج تک بلوچ ''ایران'' کی بجائے نفرت سے ''قاچار'' کہتے ہیں، اِس قاچار کو مزید نفرت سے ''گجر'' کہا جاتا ہے۔ لارڈ کرزن نے بالکل صحیح لکھا کہ ''سیاسی طور پر بلوچ کے ہاں دو احساسات موجود ہیں:

قبائلی آزادی کا شدید جذبہ، اور برملا پارسیوں سے ناپسندیدگی جنہیں وہ ''گجر'' کہتے ہیں۔ (کرزن صفحہ 259)۔

10۔ فارورڈ پالیسی

1893 سے لے کر 1931 تک مغربی اور جنوب مغربی بلوچستان پر خان محمود خان کی حکمرانی رہی۔ حکمرانی کیا ہوگی کہ ایک تو وہ خود لاابالی اور غیر سنجیدہ شخص تھا۔ پھر انگریز اور سردار باہم ایک ہو چکے تھے، چاروں طرف سے اُسے سازشوں، رشوتوں، اور جاسوسیوں نے گھیر رکھا تھا۔ تصور کر لیں کہ اُس کے اپنے ہاتھوں زبردستی اپنے باپ کو معزول کروا کر اسے تخت نشین کروایا گیا تھا۔

بلوچستان کے موجودہ حکمرانوں کی طرح جن کا حکم سریاب کے اُس پار چلتا ہی نہ ہو تو رنگیلا بننا تو مقدر ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ حکمرانوں کے طرز وطور کے حوالے سے انیسویں صدی کا اواخر اور اکیسویں صدی کا اوائل بلا کی مماثلتیں رکھتے ہیں۔ اگر محمود خان بے شمار دُم کٹے گھوڑے رکھتا تھا، تو یہ لوگ عجب ہیئت کی موٹر سائیکلیں موٹریں رکھتے ہیں۔ وہ بھنگ اور معجونِ فلک سَیر استعمال کرتا تھا تو یہ شیشہ وشراب سے شغل فرماتے ہیں۔ وہ حرم کلات میں رکھتا تھا، تو اِن کے عیاشی اڈے اسلام آباد، کراچی یا اور دبئی میں ہیں۔ وہ بھی ظرافت کی پلجھڑیاں بکھیرتا تھا یہ بھی ادنیٰ لطیفوں کے انبار مہیا کرتے ہیں۔ وہ بھی عجب عجب شکل بناتا اور لباس پہنتا تھا، یہ بھی بیوٹی پارلرز کی ورائٹی بڑھاتے ہیں۔ بلوچستان سے ''اصل'' حکمران کیا کر رہے ہیں یہ نہ 1901 کے خان کو تکلیف دیتی تھی نہ اکیسویں صدی کی پہلی نصف کے وزیر اعلیٰ کو۔

تذلیل کا یہ سفر کوانٹٹی میں شروع ہوا تھا اور پھر دھیرے دھیرے یہ صفتی سفر میں بدلتا گیا جس کی اب تکمیل ہو چکی ہے۔

کسی بھی ملک پر قبضہ کر کے اُسے کالونی بنانا بذاتِ خود ڈپلومیسی بھی ہے اور فوجی قوت کا استعمال بھی ۔ یوں بلوچستان پر انگریز کی آمد کا اولین قدم فوجی قوت اور ڈپلومیسی دونوں کے ذریعے اٹھایا گیا۔ ہاں، یہ تو ہوا کہ کبھی ڈپلومیسی پیچھے ہوجاتی اور فوجی قوت فیصلہ کن ضرب لگاتی ۔ اور کبھی فوجی قوت اور طاقت کو رعب بنا کر ڈپلومیسی سے کام لیا جاتا ۔مگر کوشش یہ رہی کہ انگریز قوت کا استعمال کم سے کم کرے ۔

بلوچستان میں ڈپلومیسی کی بالادستی سنڈیمن کے عہد میں شروع ہوئی ۔

مشرقی بلوچستان میں 1871 میں قبائل کے انتظامی معاملات پر غور وفکر کرنے کے لیے ایک میٹنگ طے تھی ۔ اس میں گورنر پنجاب ولیم میری ویدر، کرنل فائر اور سنڈیمن کے علاوہ لیفٹیننٹ گورنر میجر جنرل سر ہنری ڈیورنڈ کو بھی شامل ہونا تھا۔مگر وہ ٹانک کے دورے پر تھا جب وہ ہاتھی سے گر گیا اور مر گیا۔اس لیے میٹنگ نہ ہوسکی اور یہ میٹنگ 3 فروری 1871 کو کوٹ مٹھن میں ہوئی ۔اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ کیپٹن سنڈیمن ڈی سی تو پنجاب کا رہے گا مگر بلوچ قبائل (جن کا کچھ حصہ پنجاب اور سندھ میں ہے) کے معاملات میں وہ حکومت سندھ کا عہدیدار ہوگا اور جیکب آباد کے پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ فرنٹیئر کی ماتحتی میں کام کرے گا۔اسی فیصلے نے بلوچ قبیلوں کی گردنوں تک اِس ڈائن کے پنجے کی براہِ راست رسائی ممکن بنادی ۔ بدبختی کے کالے بادل ہمارے سروں سے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔

اسی دوران سرداروں نے خان اور سنڈیمن سے بغاوت کر کے مری کے پہاڑوں میں پناہ لی ۔مریوں نے ایک برطانوی اتھارٹی کو دوسرے کے خلاف بھڑا دینے میں خود کو ماہر دکھایا اور سنڈیمن نے مان لیا کہ اس کا اثر مری سردار کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ مریوں کی طرف سے بولان میں افغان تاجروں کے لوٹے ہوئے سامان کو واپس کر دے ۔میری ویدر نے امیر افغانستان کی شکایت پہ خان سے تاوان طلب کیا۔خان آپے سے باہر ہوگیا اور کیپٹن ہیریسن کو بے عزت کر دیا ۔۔۔ میری ویدر نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ خان کو تخت سے اتار دیا جائے اور مریوں کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے ۔مگر حکومت ہند نے یہ تجویز مسترد کر دی اور سنڈیمن کی یہ تجویز منظور کر لی کہ وہ مری سردار کے پاس ایک دوستانہ دورہ کرے ۔

مری سردار نے 1872 ء میں سنڈیمن کے سامنے بیان دیا۔۔۔" تنہا میرے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں کوئٹ منڈاہی کے مریوں کو روک سکوں ۔ پہلے تو کوئٹ منڈاہی کے مری اس لیے قابو میں تھے کہ خان کلات مری تمندار کی امداد کرتا تھا اور سردار کے خاندان کا ایک فرد سردار کے نمائندے کے بطور منڈاہی میں قیام پذیر ہوتا تھا۔اس کی ڈیوٹی یہ ہوتی تھی کہ خان کے نام پر علاقے کی حفاظت وامن کا انتظام کرے ۔مثلاً میں اپنے چچازاد گامنڑ خان کا نام دے سکتا ہوں جس نے اسی طرح خان کی مدد کی ۔خان نے مری سردار کو سالانہ بارہ ہزار روپیہ کا اختیار دیا تھا کہ وہ چھوٹے سرداروں کو ملازم رکھ لے تا کہ وہ قبیلہ کے اندر اپنی حیثیت کے مطابق امن برقرار رکھیں ۔اس کے علاوہ خان نے "تتیا" کا گاؤں جاگیر کے بطور سردار کو دے رکھا تھا۔ سارے انتظامات خان کے نام سے کیے جاتے تھے، اور بہت اچھی طرح کیے جاتے تھے، اس لیے کہ وہ اس ملک کا والی ہے" (26)۔

بہرحال سنڈیمن نے اُس وقت تک خود کو یرغمال کے بطور مری کے پہاڑوں میں رکھا جب تک کہ مری معتبر سردار گزین خان کے ہمراہ گمشدہ جانوروں کو ساتھ لے کر جیکب آباد معافی مانگنے گئے اور گرفتار ہوئے بغیر خیر خیرت سے واپس آگئے ۔

اسی طرح، 1875ء میں کلات مشن پر روانگی سے قبل سنڈیمن کو بالخصوص مری علاقہ جانے کی ہدایت کی گئی تا کہ:

مری بگٹی کے آپسی ، یا اُن کے اور پشتونوں کے درمیان جھگڑوں اور لڑائیوں کے بارے میں اطلاعات اکٹھی کر کے جلد از جلد اُن کا تصفیہ کرائے ۔جن جھگڑوں کا تصفیہ نہ کر سکے ان کی تفصیلی رپورٹ حکومت کو پیش کرے ۔ نیز مری بگٹی قبائل اور خان کی حکومت کے مابین تعلقات کی رپورٹ بھجوا دے ۔حکومت نے سنڈیمن کو یہ معلوم کرنے کی بھی ہدایت کی کہ آیا بولان کے

راستے تجارت کی حفاظت ممکن ہے؟۔اور اگر ہے تو کیسے؟۔کیا کارروانوں کے لیے متعین کردہ چنگی کا کوئی نظام وضع کیا جاسکتا ہے؟۔انگریز قندہار کی طرف تجارتی کاروانوں کے لیے ایک متبادل راستے کی تلاش میں بھی تھا جو بولان سے بھی آزاد ہواور کلات کے اثر سے بھی آزاد ہو۔ چنانچہ سنڈیمن کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ تل چوٹیالی سے قندھار تک کی قدیم تجارتی شاہراہ کو کھولنے کی لیے قابل عمل اقدامات کرے۔

واضح رہے کہ بولان درہ تاریخی طور پر بلوچوں کے ایکتا کی ضامن رہا ہے۔صدیوں سے بالائی ساراوان اور کچھی کے میدانوں سے رابطے کی سب سے بڑی اور اہم شاہراہ یہی رہی ۔ سردیوں اور گرمیوں میں موسم کی شدت اور چراگاہوں کا تعاقب بلوچ خانہ بدوش مویشی بانوں کو ہزاروں کی تعداد میں، بولان راستہ دیتا تھا۔

بہرحال،سنڈیمن 18 نومبر 1875 کوڈیرہ غازیخان سے روانہ ہوا۔اس کے پاس کیولری تھی ، ڈاکٹر تھا۔سنڈیمن کے ساتھ غلام حیدر گورشانڑیں بمع 60 سوار اور 40 پیادہ، میر خان دریشک (90 سوار 40 پیادہ)، غلام حیدر لنڈ (110 سوار 80 پیادہ)، امام بخش مزاری (200 سوار)، (اُسے 1888 میں Knight کا خطاب ملا)(27) مسوخان تنکانڑیں ،سکندرخان کھوسہ (70 سوار 90 پیادہ)، مزارخان لُنڈ (20 سوار) ، جمال خان لیغاری (200 سوار 90 پیادہ)، مرتضے خان بگٹی (72 سوار)، بلوچ خان کھیتران (60 سوار)، مہراللہ خان مری (180 سوار) اور قادربخش کھیترانڑ (44 سوار) تھے۔دفتری کارروائی کے لیے منشی ہتو رام اور گھنڑ پترا (گنپت رائے) ساتھ تھے۔۔

سنڈیمن نے ہڑند سے سرحد پار کی۔''میرے ساتھ بلوچ سرداروں کی بڑی تعداد تھی۔عام آدمی بھی بہت تھے ۔ اپنی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ تھا۔آگے چل کر لوہارانڑیوں اور بجارانڑیوں کے وڈیرے اور معتبر آن کر میرے ساتھ مل گئے ۔ پھر بگٹی اور کھیترانڑ کے، اور بعد میں کاہان پہنچنے پر مری کے سردار گزین خان نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا''(28)۔

وہ 31 دسمبر 1875 کو کلات پہنچا۔سنڈیمن مذکورہ بالا افراد کے ساتھ اپنی ہی سازش کے تحت خان کے خلاف باغی کردہ سردار بھی لے گیا۔تاکہ خان کے ساتھ ان کا راضی نامہ کرادے۔ ان میں ملا محمد خان رئیسانڑیں، اللہ ڈنہ کوڑد، شادی خان بنگلزئی، سید خان محمد شہی، جندہ خان شہوانڑیں، میر ہزار خان مری، گل محمد خان مری، کرم خان مری، نہال خان مری، گہنور خان پسر تمندار بگٹی، ہیبت خان بگٹی، فتح خان بگٹی، روکھ خان بگٹی اور بجار خان بگٹی شامل تھے۔

خان کلات، جمال خان لیغاری اور امام بخش مزاری سے ملنے کے لیے نیم ایستادہ ہوا۔یہ اعزاز صرف انہی دو بلوچ سرداروں کو حاصل ہوا۔اُن سے خان نے علیحدگی میں بلوچی سلطنت کی بقا کی خاطر کام کرنے کی استدعا کی مگر اُن دونوں سرداروں پر تو حرص قابض ہوچکی تھی۔انہوں نے ملکی وملی مفاد کو پس پشت ڈال کر تمام گفتگو سنڈیمن کو بتادی۔سنڈیمن نے ان دونوں کو اپنی قوم کے مفادات کو نظر انداز کرنے پر نوابی کا خطاب دیا۔(یہی وہ لیغاری سردار تھا جس نے مست توکلی کو بہت پریشان کیا تھا۔1881ء میں جمال خان لیغاری حج سے واپسی پر ڈیرہ غازیخان میں فوت ہوا)(29)۔

اسی زمانے میں (یعنی انیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائیوں میں) کپٹلزم'' سامراجیت''میں بدلنے لگا۔ مارچ 1874 میں ڈیز رائیلی ، برطانیہ کا وزیراعظم بنا اور لارڈ سالسبری ہندوستانی معاملات کا سیکرٹری۔اس نئی حکومت نے فارورڈ پالیسی کے نظام کے تحت ممالک کے امور میں مداخلت کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس پالیسی کا مطلب ایران ، افغانستان اور بلوچستان تک انگریزوں کی وسیع انتظامی پیش قدمی تھی۔1875ء میں سنڈیمن کا نمودار ہونا اور 1877ء میں کلات میں پولیٹیکل ایجنسی کی تشکیل اسی کی کڑیاں تھیں۔مگر اسی دوران وسطی ایشیا کی فیوڈل ریاستوں نے روس کے ساتھ الحاق کرنا شروع کیا تھا۔انگریز دربار میں سمجھو ہل چل مچ گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے بلوچستان کو اپنے فوجی اڈے میں تبدیل کردیا۔اور اس کی

فوجیں بلوچستان کے شمالی حصے میں جگہ جگہ پھیل گئیں۔

بلوچستان کی طرف اسی خطرناک توجہ کے نتیجہ میں 1876ء میں انگریز نے کوئٹہ کو خان کلات سے چھین لیا اور اُسے فوجی اڈہ میں بدل دیا۔ وہاں اتنی بڑی فوج جمع کر دی کہ بہ یک وقت کلات کو بھی سنبھالا جا سکتا تھا، اور کندہار کو بھی۔

درہ بولان اور دیگر اہم تجارتی راستوں کی حفاظت کے لیے سردار گزین خان کی رضامندی سے خان کے گھڑ سوار کاہان بھیج دیے گئے تا کہ وہ مری کے حملوں سے انہیں بچانے میں مدد کریں۔ 24 اپریل 1876 کو منعقدہ ایک دربار میں بولان کے سارے قبائل (کوڑد، مزارانڑیں مری اور منڈاہی کے مری، مینگل اور دومڑ) نے درہ بولان کو کھولنے کی خواہش کر دی۔

لیکن جس وقت سنڈیمن، خان سے ملا اور اس نے بولان کے راستے کو تجارت کے لیے کھول دینے کی بات شروع کی تو خان نے بولان کے بجائے مولا کے راستے کو استعمال کرنے کی تجویز دی جس کی کہ وہ حفاظت کر سکتا تھا۔ اس بات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سردارانِ قبائل بہت حد تک آزاد تھے اور اُن کی اپنی سالم حکومتیں قائم تھیں جہاں ان کا اپنا حکمران طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ مگر خان پھر بھی سنڈیمن کے بجائے اپنے آپ کو پورے بلوچستان کا حاکم اعلیٰ تصور کرتا تھا۔ اور جب سنڈیمن نے باقی قبائل کے ساتھ اُس کی صلح کرانے کی بات کی تو خان نے جواب دیا کہ ''یہ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے، آپ اس سے غرض نہ رکھیں'' (سنڈیمن دل میں کتنا ہنسا ہوگا!)۔

بہر حال مذاکرات، پیغام رسانی اور گفتگو کے بعد خان اور سن من (سنڈیمن) کے درمیان 12 جولائی 1876 کو مستنگ میں معاہدہ ہوا۔ جس میں دوستی کی آڑ میں، ''کلات کی آزادی کا احترام'' جیسی لفاظی کے علاوہ یہ شق بھی شامل ہوگئی کہ حکومت کلات کا نمائندہ حکومت ہند کے پاس مقیم ہوگا اور کلات میں ایک انگریز مسلح دستہ رہے گا جس کا کمانڈر انگریز ہوگا۔ کلات میں یہ انگریز نمائندہ، خان اور قبائلی سرداروں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔ انگریز کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ علاقہ کلات میں، جب چاہے فوج متعین کر دے (30)۔

واضح رہے کہ 21 فروری 1877ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے بلوچستان ایجنسی قائم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ مگر مری اور بگٹی علاقے خان کی راجدھانی سے دور رکھے گئے۔ اور سنڈیمن نے خود ہم سے نمٹنے کی ٹھان لی۔

ہند یورپ ٹیلیگراف لائن کی حفاظت بھی انگریز کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس طرح کا پہلا معاہدہ جون 1862 میں کلات سلطنت میں شامل جام لسبیلہ (میر خان) کے ساتھ ہوا۔ اُسے لائن کی حفاظت کرنے کے عوض 8400 روپے سالانہ دینے کا معاہدہ ہوا۔ اسی سال کیچ میں خان کلات کے نائب (میر فقیر محمد بزنجو) کے ساتھ گوادر سے کلمیر تک ٹیلیگراف لائن کی حفاظت کے سلسلے میں معاہدہ ہوا۔ 1869ء میں مکران کے حکمران گاجیان گچکی سے اسی طرح کا معاہدہ ہوا۔ یاد رہے کہ انگریزوں نے خان کے ساتھ معاہدے میں یہ اجازت لے رکھی تھی کہ وہ خانِ کلات کے علاقے میں جہاں چاہیں ٹیلیگراف لائن لے جا سکتے ہیں۔

اسی دوران 1876ء میں زرکونوں پر بگٹی قبائل نے حملہ کر کے انہیں تقریباً مکمل طور پر کوہلو سے نکال دیا۔ مری نے یہاں تجاوز کر کے وادی کے جنوبی حصے پر قبضہ کر لیا اور فوراً یہاں دو بستیاں آباد کیں۔ زرکون شمالی حصے تک محدود ہو گئے۔ گو کہ انہیں وہاں بھی امان نہ تھی مگر انہوں نے برطانوی حکام سے تحفظ کی اپیل کی۔ (یوں کوہلو کا جنوبی علاقہ 1876 کے بعد مری قبیلے کا بن گیا)۔ کوئٹ منڈاہی اور بادرہ کی وادی گزین ہی کے دور میں مری نے قبضہ کی تھی۔

دوسری طرف سردار گزین کو انگریز نے ملازمت دے دی۔ انگریز نے اس کے 20 گھڑ سوار بھی ملازم رکھے تا کہ ''کاہان اور ڈیرہ غازیخان کے مابین انگریز افسروں کے آنے جانے میں امن و امان برقرار رکھا جا سکے''۔ گزین (سردار نور محمد کا بیٹا) 1876ء کو انتقال کر گیا۔ چونکہ گزین لاوارث تھا، لہٰذا اس کے بھائی مہراللہ نے سرداری سنبھال لی۔

آیئے ہم ایک بار پھر حملہ آور برطانیہ کے اندر جھانکیں۔ وہاں 1870 کا اوائل دراصل وہ زمانہ تھا جب انگلینڈ صنعتی ترقی میں بے نظیر کامیابیاں حاصل کر چکا تھا۔ یہ واقعتاً ''دنیا کی فیکٹری''

کا درجہ پا گیا تھا۔ یہ اُس دھائی میں سخت کوئلہ، پگ آئرن اور کپاس کا عالمی لیڈر تھا۔ برٹش بحری جہاز بنانے والی صنعت دنیا بھر میں اول نمبر پر تھی۔ لندن سب سے بڑا کریڈٹ مرکز تھا۔ عالمی تجارت میں برطانوی حصہ دو تہائی تھا۔ برطانوی بورژوا معاشی کی وسعت بے حدوحساب تھی۔(31)

1876 کے دسمبر میں وائسرائے لارڈلٹن جیکب آباد آ گیا ۔اِس لارڈلٹن نے ملکہِ برطانیہ کولکھا'' خان کلات میرے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوگیا ہے جس کی شرائط ہمیں عملاً کلات کا مالک بنادیں گے''۔اس مذکورہ معاہدے پر 8 دسمبر 1876 کو جیکب آباد میں دستخط ہوگئے (32)۔خان اور لارڈ کا معاہدہ یوں تھا:

1۔خان ھذا داث خان انگریز کے دشمن کو اپنا دشمن تصور کرے گا (لاحول ولاقوت)۔

2۔خان' برطانیہ کی ماتحتی مانے گا۔

3۔انگریز کی اجازت کے بغیر ریاست کے باہر کوئی خط وکتابت نہیں کرے گا۔

برطانیہ اس بدلے میں:

i۔کلات کی خودمختاری تسلیم کرتا ہے۔

ii۔ بیرونی حملے کی صورت میں خان کے اقتدار کی حفاظت کے لیے مناسب مدد کرے گا۔

انگریز نے ریلوے اور ٹیلیگراف لائنوں کے بچھانے کے اختیار بھی حاصل کیے۔اسی طرح اُس نے اپنی شاہرگ یعنی ''فریڈم آف ٹریڈ'' کی ضمانت بھی حاصل کرلی۔

مگر یلغار گر تو نہ مانتا ہے کسی معاہدے کو، نہ جانتا ہے لفظ دوستی کو۔ چنانچہ 1877 میں انگریز نے کوئٹہ لے لیا۔کوئٹہ جو قلات کا متبادل بن کر بلوچ کو بھی قابو رکھے گا اور دوسری طرف افغانستان کو بھی روسی حلقہِ اثر میں گھسنے نہ دے گا۔

اس معاہدے کے بعد وائسرائے نے تین لاکھ روپے خان کو عطا فرمائے ۔اور خان نے مہمان نوازی کے جوش میں پورا خان گڑھ اُسے بخش دیا۔ جو بعد میں جیکب آباد کہلایا۔

لارڈلٹن نے خان پر یہ عظیم احسان بھی کر دیا کہ سنڈیمن کو اُس کے دربار میں AGG بنا دیا۔سنڈیمن کو تین پولیٹیکل ایجنٹ اور ایک میڈیکل آفیسر پر مشتمل سٹاف دیا گیا۔آئزک بروس اس کا خاص معتمد اور کوئٹہ کا پولیٹیکل ایجنٹ بنا۔ رینالڈ (دوئم معتمد) کو جیکب آباد ملا' اور کیپٹن وائی لی (سوئم معتمد) کلات میں متعین ہوا۔اور ڈیوک بطور میڈیکل آفیسر۔

ان میں سے صرف بروس، بلوچی جانتا تھا۔اس نے 1875ء میں اس زبان کی ایک مختصر سی درسی کتاب بھی لکھی تھی جسے حکومتِ پنجاب نے شائع کرایا۔جس کے فوراً بعد بلوچی کو اُن زبانوں میں شامل کیا گیا جن میں امتحان پاس کرنا پڑتا تھا اور حکومتِ ہند انعام اور تیس روپے الاؤنس دیتی تھی۔ بروس نے افسرانِ بالا کو لکھا کہ میں بلوچی زبان میں امتحان دینا چاہتا ہوں۔مگر چونکہ بروس کا امتحان لینے والا بلوچی میں کوئی تھا ہی نہیں اس لیے لارڈلٹن نے اُسی درخواست پر لکھ دیا:''مسٹر بروس کے بارے میں سمجھا جائے کہ اس نے امتحان پاس کرلیا''۔اس کی بنا پر کئی سال تک اُسے سو روپیہ ماہوار دیا جاتا رہا(33)۔

بروس ہی وہ پہلا یورپین تھا جس نے (کوئٹہ سے امرتسر جاتے ہوئے) سانگان، بادرہ اور ماوند دیکھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اکتوبر 1877ء کے اس سفر میں اس کے ساتھ کوئی فوج نہ تھی۔ اور صرف کچھ مری اور بگٹی معتبرین کے ساتھ وہ درہ بولان میں بی بی نانی کے مقام پر دوسری طرف مڑ کر سانگان تک چلا گیا۔اور وہاں سے بادرہ' کوٹ منڈاہی، ماوند، کاہان اور شم سے ہوتا ہوا ہڑند پہنچا۔اس زمانے میں ان علاقوں میں بآسانی مارخور، اوڑیال اور ایک چھوٹا کالا ریچھ (جسے مقامی لوگ مم کہتے تھے) مل جایا کرتے تھے۔یہ انگریز بتاتا ہے کہ شم پھیلاوغ بوڑ کے علاقے میں پہاڑی ہرن بھی ملتا تھا۔

***

گو کہ خان ساری ریاست کلات کی صدارت کرتا تھا' سرداروں کے علاقوں کی اپوئنٹ منٹ

کا برائے نام اختیار بھی رکھتا تھا،اور کچھی اور جہلاوان کے سرداروں کی تنخواہیں بھی دیتا تھا۔مگر اُسے سرداروں کے معاملات حتیٰ کہ ایک سکول اور ایک ہسپتال کی تعمیر تک کی منظوری دینے کے اختیارات بھی حاصل نہ تھے۔ یہ سارے اختیارات انگریزوں نے اپنے پاس رکھے تھے جنہیں اُن کا پولیٹیکل ایجنٹ استعمال کرتا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ ایک طرف سرداروں اور عوام کے مابین جھگڑوں کا تصفیہ کرتا، تصفیہ کیا کرنا تھا وہ سردار کے حق میں اقدام کرتا تھا۔ مثال کے طور پر 93...1892 میں مری سردار اور عوام کے درمیان تضادات ابھر کر سامنے آئے۔ مہراللہ خان اول بوڑھا ہو چکا تھا اور قبیلہ پر اس کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی اور میر ہزار خان گزینی نے اُس کے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کیا تھا۔

لوگ ناراض ہو کر افغانستان چلے گئے جن میں مہراللہ کا بیٹا خان بہادر خیر بخش (اول) بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر انگریز نے اپریل 1898 میں انہیں زیارت بلا کر اُن کی صلح کرادی۔لیکن سہراب خان (سردار کا بیٹا) کوئٹ منڈاہی میں فوت ہوگیا۔ سردار نے میر ہزار پر الزام لگایا۔ بہرحال انگریز نے فیصلہ کیا کہ میر ہزار کا مری علاقے میں اب وزیری کرنے کا کوئی کام نہیں ہے ۔اور سرکار اُسے ایجنسی سے باہر نوکری دے گی(34)۔

29اپریل 1898ء کو سات مری بلوچستان سے قندہار پہنچے۔ انہوں نے وہاں بتایا کہ 1500 دیگر مری قندہار پہنچنے والے ہیں(35)۔

6 مئی 1898 کو 30 دیگر مری وہاں پہنچے۔ انہوں نے قندہار کے گورنر سے امداد دینے کی درخواست کی تا کہ وہ 2000 دیگر مری افغانستان لاسکیں۔لیکن ان کی درخواست مسترد کی گئی۔ مئی کو امیر نے مریوں کے پہلے افغانستان پہنچنے والے سربراہ کے لیے 40 روپیہ سالانہ کا الاؤنس منظور کیا۔قندہار میں مریوں کے مسلسل آنے کی وجہ سے غلہ کی قیمت بڑھ گئی(36)۔

اس سال دسمبر تک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہاں یہ باتیں عام ہوجاتی ہیں کہ کچھ مری مہاجر اس ملک کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ لہٰذا وہ واپس برطانوی علاقہ چلے گئے۔ باقی بھی ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں(38)۔

15 مارچ 1902 کو مہراللہ اول فوت ہوگیا جو کہ گزین کا بھائی تھا۔اس کا بیٹا خیر بخش اول سردار بن گیا۔

11-اینگلو مری وارز، سکینڈ راؤنڈ

کوچیالی پر مری آزادی پسندوں کا حملہ

سامراجی قبضہ گر اور غلام کے بیچ معاہدات طاقت کے قانون کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔ انگریز طاقتور ہوتا تو بزورِ قوت ہم سے اپنے من پسند معاہدوں پر دستخط کرواتا، مگر جب ہمارا پلڑہ بھاری ہوتا تو ہم اُن معاہدوں کے الفاظ عبرت کا نشان بنا کر غنیم کے منہ پر دے مارتے۔ خسارے میں ہیں وہ محقق جو بلوچستان کی سامراج دشمن تحریک کا تعین تحریری معاہدوں سے کرتے ہیں۔

ہم یہ لنگڑی لولی دلیل استعمال کرتے ہیں کہ ''انگریز کی گزرگاہ مری قبیلہ کے قرب و جوار سے گزرتی تھی اس لیے زیادہ مزاحمت بھی اسی قبیلے کی تھی۔ چنانچہ اِس سارے دور میں انگریز کے خلاف مری نے اپنی کاروائیاں برقرار رکھیں۔اور برطانوی کمک کاروانوں پر حملے جاری رکھے''۔

سخت حفاظتی انتظامات کا منہ چڑاتے ہوئے مری نے چھ اگست 1880 کو ایک انگریزی دستہ کی کانوائی پر کوچیالی کے قریب حملہ کر دیا۔ اُس کارواں کے 42 افراد قتل کر دیے اور ایک لاکھ 25 ہزار روپے قبضہ کر لیے۔ یہ حملہ اُس کے باوجود ہوا کہ کوچیالی کے حملے سے صرف دس روز قبل (یعنی 27 جولائی 1880 کو) ماوند تباہ ہوگیا تھا۔(38)۔معاملات اور واقعات سمجھ میں آجانے کے لیے ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ، سردار مہراللہ خان (اول) کا دور تھا جس کے ہم عصر

معتبر مری قبیلے میں یہ تھے: مٹھا اور پاندھی سالارانڑیں، شادی ہان سومرانڑیں، پیرورامکانڑیں، شیر ہان کلوانڑیں، پلیہ کنگرانڑیں، کرم خان قلندرانڑیں اور ڈیوا پوادی۔

پھر جب انگریز کو چیالی کے صدمے سے سنبھل گیا تو مہراللہ نے سنڈیمن کو ایک خط میں اعتراف کیا کہ ''چھاپہ ماروں نے میرے بیٹے کو 400 بیل' 50 روپے نقد، اور ایک خیمہ ''سردار کے حصے'' کے بطور دینے کی پیش کش کی۔

انگریز بہت طاقتور تھا۔اس نے مری سرکشی کی بیخ کنی کی ٹھان لی۔چنانچہ اس نے 3070 کی افواج کے ساتھ مری قبیلے پر حملہ کر دیا۔انگریز کمانڈر کا نام تھا میک گریگز (39)۔فوج درہِ سمبھار، تل اور کوہلو کے راستے گئی اور کاہان پر قبضہ کرلیا۔مری سردار مہراللہ خان (اول) انگریز کے ہاں سلامی ہوگیا۔انگریز نے قبیلے پر دو لاکھ روپے کا تاوان ڈال دیا۔مہراللہ خان (اول) نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ اُسی وقت ادا کر دیے اور 50 ہزار روپے کی جگہ کوئٹ منڈاہی کا علاقہ بطور رہن انگریز کے حوالے کر دیا۔سرکار اِس علاقہ سے بٹائی لینے لگی۔

مگر آٹھ سال کے اندر اندر انگریز کو مہراللہ خان اوّل کو 1889 میں نواب کا خطاب دینا پڑا۔ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ مری کے صرف دو سرداروں کو ''نواب'' کا خطاب ملا تھا: مہراللہ اول، اور، خیر بخش اول۔اُس کے بعد کسی بھی شخص کو نواب کا خطاب نہیں ملا۔نواب کا خطاب موروثی نہیں تھا۔چنانچہ بعد میں مہراللہ (دوم)، خیر بخش (دوئم) نواب نہ تھے، بلکہ ہمارے معزز سردار تھے۔اسی طرح لفظ نوابزادہ جو استعمال ہوتا جارہا ہے حال میں، وہ بھی غلط ہے)۔

***

1891 میں زرکون نے مری کی دست اندازی کے خلاف اپیل کی اور برطانوی حفاظت کی درخواست کی۔سرکار نے یہ کیس جنوری 1892 میں مرنج کے مقام پر بلوچ پنجاب سرداروں کے جرگے کے حوالے کر دیا: (اپنے حوالے کر دیا)۔چنانچہ فیصلے کے دفعات یہ طے پائے۔

1۔برطانوی سرکار کو ہلو وادی کو اپنے قبضے میں لے لے اور پیداوار کا چھٹا حصہ بطور ریونیو حاصل کرے۔

2۔جو ابتدائی سند سنڈیمن نے مریوں کو 24 اگست 1878 کو دی تھی' اس کی تجدید ہوگی۔

3۔مری سے تعلق رکھنے والی زمین کے ریونیو کا آدھا حصہ سردار مری اور دیگر مری وڈیروں کو دیا جائے گا۔

4۔کوہلو وادی میں چراگاہ ٹیکس لگایا جائے گا مگر مری صرف نصف ٹیکس دیں گے۔

5۔ریونیو نقد کے بجائے جنس کی شکل میں لیا جائے گا۔

6۔ایک اور لیوی کی نوکری بہ عوض 195 روپے ماہوار مری کو دی جائے گی۔

چلتے چلتے ایک سامراج دشمن بڑے انسان کا تذکرہ کرتے چلیں۔یہ شاہ جہاں جوگیزئی تھا جس نے 1879 میں سنجاوی کے قریب بغاؤ میں انگریز کو شکست دی۔شاہ جہاں کی آخری لڑائیاں 1883 اور 1884 میں تل چوٹیالی میں ہوئیں (41)۔

******

سنڈیمنی نظام کا بانی سنڈیمن، انفلوئنزا کی مختصر بیماری میں مبتلا ہوکر 29 جنوری 1892 کو مرگیا۔وہ اس وقت لسبیلہ میں کیمپ لگائے ہوئے تھا (41)۔

سنڈیمن چودہ سال تک یہاں اے جی جی رہا۔اور نائنا سوائڈلر کے بقول ''لیویز'' اور ''جرگہ'' نامی دو ادارے تخلیق اور بالغ کر کے مرا (42)۔

12-ھذاداث خان کی چھٹی

ھذاداث خان کی دو بار کی حکمرانی کا کل عرصہ تقریباً 35 سال تھا۔اسے برطرف کرنے کا طرز دلچسپ ہے جو ہم کہیں اور بیان کریں گے۔فی الحال تو ہم آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ سنڈیمن کی موت کے ایک سال بعد یہ واقعہ ہوا۔یہ جیمز براؤن کا دور تھا۔

انگریز نے 1893 میں اِس بے کار، دعا گو پرزے کو نکال ہی دیا۔ اِس سامراج کو اب ایک اور مزاحیہ کردار مل گیا تھا: محمود خان۔ (یہ بہت دلچسپ ہے کہ سامراجی لوگ ایسے لوگوں کو اپنا اتحادی بناتے ہیں جو رنگیلے ہوں، عیاش ہوں، لطیفے باز ہوں اور بھرپور سنجیدگی کے ساتھ غیر سنجیدہ ہوں!!)۔

اب آپ انگریز کا تیار کردہ ڈرافٹ دیکھیے جسے ھذا داث خان کے استعفیٰ کا نام دیا گیا تھا۔ اس جبری استعفیٰ کا متن یہ ہے:

''میں خان خدائیداد خان امیر بلوچستان، المعروف بہ خان کلات بہ سلامتی ہوش وحواس خمسہ' بلا جبر واکراہ' روبروئے جنرل سر جیمز براؤن اے جی جی، ومیجر ٹمپل پی اے کلات، مسٹر سٹیٹ سیکرٹری ٹو دی ایجنٹ گورنر جنرل نیٹو اسسٹنٹ ہتو رام، سردار اسد خان رئیسانی سرِ سردارانِ سراوان اور شہزادہ میر محمود خان، کلات کے تخت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ چونکہ میری عمر 55 برس کو پہنچ چکی ہے۔ میں بوڑھا اور حکومت کا بارگراں اٹھانے سے قاصر ہوں اور میری قوم مجھ سے ناخوش ہے۔ اس لیے میں برضا ورغبت خود اپنے بڑے بیٹے اور ولی عہد شہزادہ میر محمود خان کے حق میں تختِ کلات سے دستبردار ہوتا ہوں'' (43)۔

زور آور کا پانی چڑھائی کی طرف بھی بہتا ہے۔ ورنہ دنیا میں کون حکمران ہوا جو لکھ کر دے گا کہ ''میری قوم مجھ سے ناخوش ہے''۔

نائنا سوائڈلر نے سبی گزیٹر صفحہ 282 کے حوالے سے لکھا کہ مریوں نے 1890 کی دہائی میں کئی ریلوے ملازموں کو قتل کر دیا جس کے جرم میں چھ قبائلیوں پر مقدمہ چلا اور پھانسی لگا دی گئی۔ (44)

13-جنگِ گوخ پروش

گوخ پروش تربت کے شمال کی طرف 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک درہ (pass) ہے۔

بلوچستان کے علاقہ مکران میں 1898 میں بلوچ خان نوشیروانڑیں اور محراب خان لچکی، (سردار کیچ) کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف ایک عمومی بغاوت ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خان کلات کا حکم واقتدار پہلے کی طرح مضبوط نہ تھا۔ ہماری طرف کے مکران اور ایران کی سرحدوں میں واقع بلوچ قوم انگریزوں کے مکروفریب میں کا شکار ہو چکی تھی۔ ایرانیوں اور بلوچوں کے درمیان جھگڑوں میں انگریز غیر جانبدار نہ تھا۔ بلوچ آہستہ آہستہ اپنے خلاف انگریز کی ریشہ دوانیاں سمجھنے لگے تھے۔ انگریز اُس وقت تک بلوچستان کی بڑی بندرگاہوں گوادر، پسنی، جیونی اور اورماڑہ پر قبضہ کر چکا تھا اور اس نے اپنا نمائندہ کیچ میں بھی مقرر کیا تھا۔

خانِ کلات ھذا داث کی چُھٹی کے بعد برائے نام خان کلات محمود خان نے اوڈھو داس کو یہاں کا ناظم مقرر کیا۔ یہ ناظم ٹیکس لگانے کا بڑا شوقین نکلا۔ اس نے کھجور کا دسواں حصہ بطور ٹیکس لینا شروع کیا۔ پہلے سے بدحال خلقت مزید فاقوں کا شکار ہونے لگی۔

اس سے قبل 1884 میں مند کے رندوں اور خانِ کلات کے درمیان بڑی لڑائی ہوئی۔ خان کلات کا اصرار تھا کہ وہ لوگ میر جوہر کو مالیہ دیں۔ اور یہ کہ حکومت مند میں اپنا ایک نمائندہ بٹھائے گی۔ انگریزوں نے ان اختلافات سے فائدہ اٹھایا۔ سنڈیمن کو مکران بھیج دیا گیا جس نے ان اختلافات کو مزید بھڑکا دیا۔

تب میر بلوچ خان نے تلوار اٹھالی اور 1898 میں انگریز کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے تربت کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ انگریز کے گماشتوں کو گرفتار کر کے سزا دی۔ کلاتک کے پہاڑوں میں بورن نامی انگریز کپتان کے اوپر حملہ کر دیا، کچھ کو قتل کیا، کچھ کو گرفتار۔ کیچ میں خان کے مقرر کردہ ناظم دیوان اوڈھو داس کو گرفتار کر لیا گیا اور تربت کا قلعہ قبضہ کیا گیا۔ کچھ لوگ سمندر کی طرف گئے اور پسنی کو لوٹ لیا اور پسنی اور گوادر کے درمیان ٹیلیگراف لائن کا بڑا حصہ تباہ کر دیا۔

انگریزوں نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے کرنل مین (Mein) کو 400 نیوی فوجی اور دو توپیں دے کر کراچی سے روانہ کر دیا۔ کرنل مین کی روانگی سے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ ناکس پہنچ چکا تھا اور مزید فوج 27 جنوری 1898 کو پسنی پہنچنے والی تھی۔ ان کے پہنچتے ہی انگریز دستے کیچ کی طرف بڑھے۔ راستے میں کوئی مزاحمت نہیں ملی۔ بلوچوں نے ایک ہزار کی تعداد میں وطن دوست اکھٹے کیے۔ تمپ سے مراد اور شگر اللہ گچکی، مند سے حیاتان رند، بلیدہ سے محراب خان نوشیروانی اور مہیم خان نوشیروانڑیں، کلانچ سے مبارک اور مراد واڈیلہ اپنے دستوں کے ساتھ بلوچ آرمی میں آن موجود ہوئے۔

بلوچوں نے فیصلہ کیا کہ فرنگی کے تربت پہنچنے سے پہلے اُس کے ساتھ دو دو ہاتھ کیے جائیں۔ چنانچہ بلوچ خان نے گوخ پروش کے پہاڑوں میں مورچے سنبھال لیے۔

انگریزوں نے پہلے تو جنگ سے گریز کرنے کی کوشش کی اور اِدھر اُدھر کی لالچیں دے کر بلوچوں سے معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر بلوچ نہ مانے۔

تب انگریز آگے بڑھنے لگا۔ کہیں کہیں لڑائی ہوئی۔ دلچسپ بات ہے کہ کچھ بلوچوں نے شب خون کی تجویز دی مگر کمانڈر بلوچ خان نے چُھپ کر لڑنے سے انکار کیا کہ لوگ طعنے دیں گے۔

30 جنوری 1898 کو تربت سے جنوب میں پندرہ میل کے فاصلے پر **گوخ پروش** سلسلہِ کوہ کے مقام پر انگریز سے لڑائی ہوئی۔ انگریز حملہ آور افواج کی سربراہی ناکس اور میجر جیکب کر رہے تھے۔ جبکہ بلوچ سپاہِ آزادی میر بلوچ خان نوشیروانڑیں اور میر محراب خان گچکی کی قیادت میں وطن کا فاع کر رہی تھی۔ بلوچ بہت بہادری سے لڑے۔ مگر اُن کے پاس محض تلواریں تھیں اور لاٹھیاں تھیں۔ جبکہ انگریز کی فوج تربیت یافتہ فوج تھی۔ جنگی داؤ پیچ میں یکتا تھی۔ اُسے کسی طعنہ وغیرہ کا سامنا نہ تھا۔ اُس نے تو کسی نہ کسی طرح جنگ جیتنا تھی۔ توپوں کی نعمت انہیں حاصل تھی۔ جبکہ بلوچوں نے کسی طرح کی جنگی داؤ پیچ اپنانے کو بزدلی قرار دے کر مسترد کر دیا اور آمنے سامنے کی روایتی جنگ کا فیصلہ کیا۔ شریف لوگوں نے اپنی فوج کو ٹکڑوں میں بھی نہیں بانٹا تا کہ جمگھٹے میں توپ کے نقصان سے بچا جا سکے۔ یوں ہمیں دشمن کے توپ خانے نے بھون ڈالا۔ میر بلوچ خان نوشیروانڑیں، میر رستم خان، محراب خان نوشیروانڑیں، میر شکر اللہ خان گچکی (تمپ)، میر حیاتاں رند (وکائی) گل محمد نوشیروانڑیں (بلیدہ)، 150 وطن کے دوسرے جاں نثاروں کے ساتھ شہید ہو گئے۔ انگریز کے چار سپاہی مارے گئے اور بارہ زخمی ہو گئے (45)۔

سردار محراب خان گچکی (کیچ) جنگ کے میدان سے پسپا ہو کر پرشت سے تربت قلعہ پہنچا اور انگریزوں نے اس کا تعاقب چربک قلعہ تک کیا مگر وہ ایران فرار ہو گیا (46)۔

یہ بلا شبہ ایک بہت بڑی جنگ تھی مگر بلوچوں کو من حیث القوم اِس کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس جنگ کا آفشل شاعر (ملک دینار) جاندار شاعری نہ کر سکا تھا۔ اس لیے یہ جنگ بلوچ دلوں میں اچھی طرح رپورٹ نہ ہو سکی۔ یہ جنگ دراصل بلوچ ساحلوں پر انگریزی فوج اتارنے اور کے خلاف بلوچ مزاحمت کی جنگ تھی۔

ہمارے قومی قرض ادا کرنے والے شاعر، ہمارے فخر و شناخت میر گل خان نے دو طویل شیئر ''گوخ پروش'' جنگ کے متعلق لکھے۔ بس ایک کا آخری ''ٹوٹا'' ہی دے پاؤں گا:

مرتنت مزں نامیں کہار
میریں بلوچ خان و سغار
نوشیروانی نر مزار
میریں مہم خان جلوہ دار
روستم گوں محراب خان اوار
گل محمد ئت وش پیدوار
کپتغنت پڑا مرد سر مچار

کرتنت جہانا سوگوار
گچکی مزن نام و توار
شیر محمد خان بوت بے مئیار
شکر اللہ زحمانی ککار
و پتگ پڑا، تو پئے دپار
رندئے حیاتاں شاسوار
وشنام بیتگ بے مئیار

14-جنگِ نوذر

مغربی بلوچستان پہ نظر ڈالیے تو اُس دور میں میر شاہنواز نوشیروانڑیں اور میر عیسیٰ خان نوشیروانڑیں کو عام معافی دی گئی۔ اس کے بعد مکران میں کلات کی طرز حکمرانی کی بنیاد رکھی گئی۔اور دیوان اوڈھو داس کی جگہ سردار میر مہراللہ خان رئیسانڑیں کو کیچ کا ناظم بنا کر بھیجا گیا۔

باغی 28 اکتوبر 1901 میں نودز کے قلعہ پر قابض ہوگئے جو تربت سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اور دسمبر کی 20 تاریخ تک اُسے قبضے میں رکھا جس کی وجہ سے کلات کے پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن شاورس (Showers) گوادر پہنچا۔

اس وقت کلات کی طرف سے کیچ میں ناظم الحکومت مہراللہ خان رئیسانڑیں نے 1300 کا ایک لشکر لے کر اُن کا پیچھا کیا۔مگر وہ محاصرے کے باوجود اُس قلعہ کو آزاد نہ کرسکا۔چنانچہ اس نے انگریزوں سے مدد مانگی اور انگریزی فوج پسنی کے راستے کرنل ناکس کی کمان میں توپوں کے ساتھ آئی اور یوں نودز قلعہ کو توپوں کے ذریعہ مسمار کردیا اور دست بہ دست لڑائی میں محمد علی خان نے سترہ آدمیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔تقریباً 89 افراد قیدی بن گئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔شیران داد کریم گوڈی شدید زخمی تھا' اس کا علاج کیا گیا۔ناظم مہراللہ رئیسانڑیں نے جرگہ کے ذریعہ جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو سزائیں دلوائیں۔شیران کو پھانسی کی سزا دی گئی جو اب زخموں سے صحت یاب ہوگیا تھا۔ایک خاص قاصد کے ذریعہ جرگے کی سفارشات تصدیق کے لیے 23 دسمبر 1901 کو پولیٹیکل ایجنٹ کلات کو بھجوادی گئیں اور خان کلات کی تصدیق کے بعد شیران کو 4 فروری 1902 کو تربت میں پھانسی دی گئی اور اس کی جائیداد ضبط کرلی گئی۔(ہم بلوچوں کو اپنی تاریخ سے بے پرواہی کی سزا مل رہی ہے۔نہ ہمیں شیرانِ شہید کا نام معلوم ہے۔نہ ہمیں اُس سے متعلق تفصیلات کا پتہ ہے۔ایسا تھوڑا ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے)۔

15-شاہِ بلوچستان

وائسرائے لارڈ کرزن 1903 کے آخر میں پسنی آیا۔اُس نے پنجگور کو اپنا ابلیسی ہیڈکوارٹر بنادیا۔وہاں ایک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا۔''مکران لیویز'' قائم ہوئی اور انگریزوں نے یہاں ''خانِ کلات کی اتھارٹی'' قائم کردی۔(یعنی اپنی اتھارٹی قائم کی)۔

اُدھر مغربی بلوچستان کے مغربی سرے پر میر بہرام خان باراں زئی نے ایک تحریک کی سربراہی کی اور بلوچستان کے لوگوں کو ایک منظّم حکومت بنانے کا سنہرا موقع مل گیا۔میر بہرام خان باراں زئی نے بلوچستان کی پہلی آزاد حکومت قائم کی۔بمپور اُس کا دارالخلافہ بنا۔جرمن اور ترک حکومتوں نے اسے اتحادی جان کر اُس کی امداد شروع کردی۔ بہرام خان نے خود کو ''شاہ بلوچستان'' اور ''شیرِ جہان'' کہلوایا۔یوں وہ بلوچستان کے اُس حصے پر حکومت کرنے لگا جسے ہم آج کل ''ایرانی بلوچستان'' کہنے پر مجبور ہیں۔اسی دوران جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو بہرام خان نے انگریزی علاقہ مند پر حملہ کردیا اور آگے تمپ اور کیچ تک چلا گیا۔بہرام خان عالمی جنگ

کے خاتمے کے بعد 1921 میں لاولد فوت ہوگیا تو اُس کا بھتیجا میر دوست محمد بادشاہ بن گیا۔ مگر اب تو چیزیں بدل گئی تھیں۔ رضا خان اب رضا شاہ پہلوی بن گیا تھا، جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ چنانچہ انگریز کی شہ پر ایرانی فوج نے بمپور پر حملہ کر دیا۔ میر دوست محمد اپنی افواج کے ساتھ بڑی بے جگری سے لڑا مگر شکست کھائی، گرفتار ہوا اور ساتھیوں سمیت فائرنگ سکواڈ کے سامنے شہید ہوگیا(47)۔

(ہم غوری، پرتھوی، ایوبی، اور ٹیپو کے بارے میں رٹہ لگانے پر لگا دیے گئے ہیں۔ اس لیے ہمارے بچوں کو بہادر دوست محمد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ۔ کفارہ ادا کرتے کرتے کتنی صدیاں بیت جانے دیں گے، ہم؟!!)۔

جب 1928 میں ایران کے بادشاہ رضا شاہ نے برطانیہ کی مدد سے بلوچستان کے بڑے حصے یعنی مغربی بلوچستان پر قبضہ کر کے بلوچستان کے حاکم سردار امیر دوست محمد بارانزہی کو شہید کیا۔ اس کے بعد اس نے اکثر و بیشتر بلوچستان کے شہر اور گاؤں کے پرانے بلوچی نام تبدیل کر کے فارسی نام رکھے یا اپنے تلفظ اور لہجے کے ساتھ رکھے۔ بلوچستان کے پرانے بلوچی شہر اور گاؤں کے ناموں کی فہرست درج ذیل ہے (یہ فہرست محمد کریم بلوچ نے ایک فارسی تحریر میں ساتھ تیار کیا ہے):

بلوچی	فارسی
پہرہ	ایرانشہر
بُن پور	بم پور
پنوچ یا پنوز	فنوج
چامپ	چانف
چَھبار	چہار بہار۔ چاہ پھار
کنزک	کنارک
پیشَین	پیشین
ایرکشان	ایرافشان
مہ گس	مہرستان۔ زابلی
شستون	شہستان۔ سراوان
دِزّک	داور پناہ
جالک	جالق
کووَگ	کوھک
ڈمّن	دامن
واش/گواش	خواش۔ خاش
اِیراپ، دزپ	زاھدان
شہدراج	شہردراز
آزناباد	ازمن آباد
سرادان	سرای دان
بشکرد	بشاگرد
گنداوگ	قصرقند
سِب (چِب)	سیب
نیلگوک	نیلگوں
تیگاپ	تیغ آب
نسکنت	نسقند۔ نص قند
ہوشاپ	خوش آب

چانلی (نلی چاه)	چاه علی!
گورکه	گوهرکوه
سرسورگ	سرسوره
بگدانی	بغدانی، بغدانیه
ھیت	حیط
ھُڑنگ	خُشَنک !
زِہ آپ	ذھاب
مُک رحمت (مَچ رحمت)	مغ رحمت
کُنٹگی	کنتا کی
دپ تو لگ	دفتو لک
مهترآباد	محترم آباد
مُھت	مخت
گِہ	نیک شهر
نگرآپ	حق آباد
گندآپ	قندآب
ناوَگ	ناھوک
حسین آباد، نصرآباد	زابل
بخش غربی نیمروز	سیستان
جاشک، بنگلان	جاسک
دوست محمد	ھیرمند
دپتان، تپتان	تفتان

بکشاں	بخشان
اپشاں	افشان
آپ گورانڈان	آب گوراندان
زِہ لمپان	زھلفان
دولاپوکاں	دولابکان
چاه شوروک	عاشقان حسینی !
گوناپشکاں	گونفشگان
جُگریں بیٹ	جغری بیت
گرمیں بیٹ	گرم بیت
کئورسر	کوثر
آپریچ	سرباز
کلاگنج	قلعہ گنج
گامبرون	بندرعباس

****

سال 1908 معزول و سابقہ شدہ خانِ کلات، ھذا داث خان کی موت کا سال بھی ہے۔ وہ انگریز کی طرف سے قید کی حالت میں پشین جیل میں فوت ہوگیا۔ مگر یہی سال ایک نئے عہد کی نوید سنانے والا سال بھی تھا۔ اسی سال جنوری میں جنوبی بلوچستان میں میر یوسف علی خان مگسی پیدا ہوا اور اسی سال ہاشم خان غلزئی کی کوئٹہ میں ولادت ہوئی۔

اُس وقت بلوچستان کی عمومی صورتحال یہ تھی: 1911 کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق پورے بلوچستان کے ایسے قبائلی یا ملکی اشخاص کی تعداد جو لکھ پڑھ سکتے تھے، دو ہزار ایک سو اکیس تھی جن میں سے 1544 فارسی میں اور 555 اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

کتابیات

1۔بلوچ۔سردارخان۔پلنگ وبلوچ۔صفحہ 40۔

2۔بلوچ۔سردارخان۔پلنگ وبلوچ صفحہ۔42۔

3۔لیمبرک،ایچ ٹی۔''جان جیکب آف جیکب آباد''۔1975۔آکسفورڈ پریس دہلی،صفحہ نمبر 286

4۔نقوی ، عارف، انقلابِ 1957اور ہمارا ضمیر۔ ماہنامہ قومی زبان کراچی۔ جنوری 2021۔صفحہ 19۔

5۔عباس،مرزا عباس علی بیگ۔دیوانِ جعفری۔1981۔حسن تالپورا کیڈمی،لطیف آباد،حیدر آباد۔صفحہ 14۔

6۔ہیوگز،اے ڈبلیو،''The country of Balochistan''۔صفحہ نمبر222۔

7 - گرین، ہنری ۔ میجر ۔ پولیٹیکل ایجنٹ دربار عزت مآب خان آف کلات ، 26مارچ1859۔

8- کرزن،Persia-2۔صفحہ 235۔

9۔تھارنٹن،ٹی ایچ،''سرراابرٹ سنڈیمن''1989،نساءٹریڈرزکوئٹہ۔صفحہ نمبر65۔

10۔آغا'نصیرخان،جلدششم،صفحہ نمبر387۔

11۔ Aitchison۔صفحہ 18-215

12۔تھارنٹن،''سرراابرٹ سنڈیمن''صفحہ نمبر32

13۔بلوچستان ایڈمنسٹریٹور پورٹ1886،صفحہ نمبر11

14۔بروس،رچرڈاسحاق''The forward Policy and its Results'' گوشہ ادب ،کوئٹہ،1977،صفحہ نمبر62

15۔لیمبرک،ایچ ٹی،''جان جیکب''صفحہ نمبر386

16۔تھارنٹن،''سرراابرٹ سنڈیمن''صفحہ نمبر34

17-۔برمانی،عباس۔ڈاکٹر۔طلسماتی وادیاں۔2008سنگ میل پبلیکشنز لاہور۔صفحہ 97

18۔لیغاری حصہ دوم،صفحہ 24

19۔قیصرانی،سعداختر،''کوڑاخان قیصرانی''صدائے بلوچاں،لاہور،نومبر1990،صفحہ 10۔

20۔بلوچ،عنایت اللہ''The Problems of Greater Balochistan''غیرمطبوعہ مسودہ،صفحہ نمبر216

21- ظفر،عبدالرحیم۔آزادی کا سفر۔2014۔بلوچیہ پبلی کیشنز کوئٹہ۔صفحہ 70۔

22- ظفر،عبدالرحیم۔آزادی کا سفر۔2014۔بلوچیہ پبلی کیشنز کوئٹہ۔صفحہ 72۔

23- ظفر،عبدالرحیم۔آزادی کا سفر۔2014۔بلوچیہ پبلی کیشنز کوئٹہ۔صفحہ 69۔

24۔ایکسوردی،میخائل۔2008۔اے ہسٹری آف ایران۔بیسک بکس۔نیویارک۔صفحہ 188

25۔رسالہ آریانا،کابل1361،شمارہ3،4،صفحہ نمبر137

26۔ایڈمنسٹریٹو رپورٹس1990-91''صفحہ نمبر58

27۔مزاری،شیرباز A Journey to disillusionment۔1999۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ XXIII

28۔تھارنٹن،صفحہ نمبر36۔
29۔لیغاری،حصہ دوئم،صفحہ 46
30۔ایضاً،صفحہ نمبر162
31۔حبیب جالب۔۔۔صفحہ 124
32-رومیش دت : دی اکانومک ہسٹری آف انڈیا۔جلدنمبر2۔1960۔وزارت اطلاعات حکومت ہند۔صفحہ نمبر3
33۔بروس کوثر،انعام الحق۔بلوچستان فارورڈ پالیسی اور نتائج۔نساٹریڈرز کوئٹہ۔صفحہ 110۔
34۔ایڈمنسٹریٹور پورٹ آف بلوچستان ایجنسی برائے90-1889۔صفحہ 8
35۔قندہار نیوز لیٹر،جلد چہارم ۔1990۔ڈائریکٹر آف آرکائیوز،حکومت بلوچستان کوئٹہ۔صفحہ 87
36۔ایضاً۔صفحہ 75
37۔ایضاً۔صفحہ 97
38۔ایڈمنسٹریٹور پورٹ۔1886۔صفحہ 103
39۔http://en.wikipedia.org/wiki/anglo-marri wars
40۔غور،عبدالرحمٰن،ہماری جدوجہد۔1954۔ادارہ ادب بلوچستان۔صفحہ 13
41۔تھارنٹن،''سرراابرٹ سنڈیمن''صفحہ 27
42-سوائڈلر،نائینا۔Remotely Colonial۔2014۔آکسفرڈ۔صفحہ 76
43۔نصیرخان،آغا۔جلدششم۔صفحہ 387،صفحہ نمبر568۔
44۔سوائڈلر۔Remotely۔صفحہ نمبر219
45-بلوچ،حکیم۔بلوچ قومیت۔خانیت وسرداریت۔2007۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 63
46- گزیٹیئر آف بلوچستان،مکران،دوسرا ایڈیشن،1986 گوشہ ادب کوئٹہ،صفحہ نمبر55۔اور Frontier and Overseas Expedition From India۔بک ٹریڈرز لاہور، صفحہ 250
47۔بلوچ،حکیم۔بلوچ قومیت۔۔۔۔صفحہ 71

چیپٹر چہار

بلوچ سماج میں تبدیلیاں

مجموعی طور پر انگریز کا نیا متعارف کردہ نظام اس قدر اطمینان بخش تھا کہ انڈیا کو تو دوسری عالمی جنگ سے قبل، پہلا آئین دیا گیا تھا۔ مگر سائمن کمیشن کی نصیحت پر بلوچستان کو اس نئے بندوبست سے کامیابی کے ساتھ باہر رکھا گیا۔

سنڈیمنی نظام نے بلوچستان میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں مسلط کر دیں۔

1۔ اس نے خانِ قلات اور سرداروں کو تاج برطانیہ کے تنخواہ خور ایجنٹوں میں بدل دیا۔

2۔ اُس نے خانِ قلات کے رول میں ایک بنیادی تضاد متعارف کیا: وہ یہ کہ حالانکہ خان ساری ریاست قلات کی صدارت کرتا تھا، سرداروں کے علاقوں کی اپوئنٹ منٹ کا برائے نام اختیار بھی رکھتا تھا۔ اور کچھی اور جھلاوان کے سرداروں کی تنخواہیں بھی دیتا تھا۔ مگر اُسے سرداروں کے معاملات حتیٰ کہ ایک سکول اور ایک ہسپتال کی تعمیر تک کی منظوری دینے کے اختیارات بھی حاصل نہ تھے۔ یہ سارے اختیارات انگریزوں کے پاس تھے جنہیں اُن کا پولیٹیکل ایجنٹ استعمال کرتا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ ہی سرداروں اور خان کے درمیان سارے جھگڑوں کی بھی ثالثی کرتا تھا اور سرداروں کے اپنے بیچ جھگڑوں کی بھی۔

1۔ جرگہ سسٹم

3۔ سنڈیمن انتظامیہ نے جرگہ کے کردار کو یکسر بدل دیا، جو کہ ماضی میں کمیونل کورٹ تھا اور شرکتی انصاف مہیا کرتا تھا۔ اُس نے اس کی جگہ ایک شاہی جرگہ متعارف کرایا جس میں صرف سردار اور ارسٹوکریٹ بیٹھ سکتے تھے۔ اس سے انگریزوں کو اپنے خلاف بغاوتوں کو کنٹرول کرنے کا ایک مضبوط ہتھیار مل گیا۔ اس نے خالص قبائلی خصوصیت والے باقی ماندہ اداروں کو توڑ دیا، اور بالائی طبقاتی نظام کو مزید مضبوط کیا۔ اس نے سرداروں کے ہاتھ عوام کی جان و مال کے بے پناہ اختیار دے دیے۔ نیا جرگہ صرف جائیداد پر ہی نہیں بلکہ محنت پر بھی ٹیکس لگا سکتا تھا۔ اور یہ عورتوں کو ضبط بھی کر سکتا تھا۔ ان فیصلوں پر نظر ثانی صرف پولیٹیکل ایجنٹ کر سکتا تھا۔

ایسے مقدمات کو سہولیت سے فیصلہ کرنے کی غرض سے سنڈیمن پہلا انگریز افسر تھا جس نے سرداروں کا جرگہ یعنی پنچایت مقرر کیا تا کہ وہ لوگ اپنی اقوام کے مقدمات اپنے ملک کے رواج کے موافق فیصلہ کریں۔ اس تجویز کو جملہ اقوام بلوچ نے بالاتفاق پسند اور منظور کیا اور اُس کے موافق کاربند ہونے لگے۔ پیشتر ازیں ضلع ڈیرہ غازیخان میں انعقاد جرگہ کا کوئی دستور نہ تھا اور نہ لوگ جانتے تھے کہ جرگہ کس کو کہتے ہیں۔ بلکہ لفظ جرگہ کا انہوں نے کبھی سنا بھی نہ تھا غالباً پشاور کی طرف یہ کارروائی عرصہ سے زیرِ عمل تھی۔ مگر بلوچستان میں اس کا موجد سنڈیمن تھا(1)۔

ہم سنڈیمن کا ذکر بار بار کرنے پر مجبور رہیں گے۔ اُس نے اپنے آقاؤں کی بڑی خدمت کی۔ اُس نے بلوچ کو میٹھا زہر دے کر اُس کی بیڑی ڈبودی۔ اُس کے بعد سے آج تک بلوچستان میں دو سو سال سے اُسی کا نظام جاری و ساری ہے۔ سنڈیمن نے ایک جرگہ سسٹم متعارف کیا جس میں صرف سردار اور ارسٹوکریٹ بیٹھ سکتے تھے۔ جرگہ سسٹم کو 1876ء میں انگریز، خان اور سرداروں کے ایک معاہدے میں قانونی درجہ دیا گیا۔ اسے اس نے 1882 میں سبی میں میلہ مویشیاں کے موقع پر شاہی دربار میں متارف کرایا۔

انگریزوں نے جو جرگہ سسٹم قائم کیا۔ اُس کا ڈھانچہ یوں تھا:

الف۔شاہی جرگہ

اس نے جرگہ کو شاہی دربار سے جوڑ دیا۔جس کے بہت ہی وسیع مقاصد تھے ۔ یہ شاہی جرگہ اور سبی کا سالانہ دربار دراصل عوام پر سرداری راج کو مسلط رکھنے اور سامراجی اقتدار کے فروغ اور نمائش کے لیے شروع ہوا۔دربار میں بلوچستان کے تمام والیانِ ریاست،سردار،شاہی جرگہ کے ارکان ، ملک اور معتبر مدعو کیے جاتے ۔ بلوچستان میں گورنر جنرل کا ایجنٹ (لاٹ صاحب) دربار سے خطاب کرتا۔جس میں برطانوی حکومت کی پالیسیوں اور اہم سرکاری امور کے بارے میں اعلانات ہوتے ۔دربار کے بعد خلعتیں اور خطابات تقسیم کیے جاتے ۔سرداروں کو لفافوں میں بند مخصوص رقوم سے نوازا جاتا۔ ہر سردار برسرِ دربار لاٹ صاحب کو سلامی دیتا اور نہایت مودب انداز سے جھک کر لاٹ صاحب سے ہاتھ ملاتا اور ملفوفہ رقم حاصل کرتا۔رقم وصول کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر جانے سے پہلے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ سلام تشکر پیش کرنا لازمی تھا۔سرداروں کو دربار کے جملہ آداب ومراسم کی تربیت ایک روز پہلے دے دی جاتی تھی۔ یہاں برطانوی سامراج کے مفاد میں بہترین خدمات سرانجام دینے والے سرکاری افسروں،سرداروں،ملکوں اور شاہی جرگہ کے ارکان کو بڑے بڑے اعزازات وخطابات سے نوازا جاتا۔یہ خدمات عموماً انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کو کچلنے،بدیسی حکومتوں کے خلاف مخبری کرنے والوں،اور حریت پسندوں کو دھوکے سے گرفتار کرانے اور انہیں قتل کرانے سے متعلق ہوا کرتی۔ ایسے دوسرے برطانوی خطابات انگریز سامراج سے وفاداری اور اس کی مخلصانہ خدمات کے اعتراف کی شرمناک علامات ہیں(2)۔

شاہی جرگہ ایسے معاملات کو نمٹاتا تھا جو دو، یا زیادہ قبیلوں ، یا دو یا زیادہ اضلاع کو متاثر کرتے تھے ۔شاہی جرگہ اِن مسئلوں کو بھی حل کرتا تھا جن کا لوکل یا جوائنٹ جرگہ میں فیصلہ غیر اطمینان بخش ہوتا تھا۔

یہ شاہی جرگہ سردیوں میں ڈھاڈر وسبی اور گرمیوں میں فورٹ منرو اور کوئٹہ میں منعقد ہوتا تھا۔

ب۔بین الصوبائی جرگہ

ڈیرہ غازی خان اور سبی اضلاع کے قبائل کے درمیان معاملات اور دیگر قبیلوں کے سخت معاملات کوئٹہ اور سبی کے شاہی جرگوں تک ملتوی نہیں رکھے جاسکتے تھے۔اس لیے فورٹ منرو میں ستمبر کے ماہ میں یہ جرگہ ہوتے تھے۔اس کے ممبر مشہور قبیلوں کے چیف ہوا کرتے تھے ۔

مگر ایک بات کی وضاحت سخت ضروری ہے۔اور وہ یہ ہے کہ بلوچستان کی ساری تاریخ عام بلوچ کی تاریخ رہی ہے۔بالخصوص،انگریز کے وقت (ماسوائے خیر بخش مری اول کی عمر کے اواخر کے) سارے سردار ایک طرف تھے اور بلوچ عوام دوسری طرف۔مثال کے طور پر تاج برطانیہ ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر ڈیرہ غازی خان کے رئیسوں اور سرداروں کی طرف سے ایک عرضداشت پیش کی گئی۔جس سے ان جاگیرداروں کی انگریزوں سے وفاداری کا ثبوت ملتا ہے جس میں آنریبل نواب سرامام بخش مزاری (کے،سی آئی)،ای،سردار بہرام خان مزاری' میاں لطف حسین خان سرانڑیں،سردار دوست محمد خان مزاری،سردار اللہ یار خان کھوسہ، سردار دریہنڑ خان دریشک،سردار جلب خان گورمانڑیں،سردار محمد حسین خان بزدار،سردار فضل علی خان قیصرانڑیں،سردار مسو خان لُنڈ،سید میر شاہ غرشین،سردار تگیا خان لیغاری،سردار اللہ بخش سدوزئی،اللہ داد خان کھیتران،ٹلو خان مزاری،محمد خان تنکانڑیں،سائیں گنج لال،بھائی درباری لال،کنیا لعل،حکیم بالا رام،میوہ خان گورشانڑیں،خواجہ بخش شاہ،میاں سلطان علی تنیا،امام بخش خان ملغانڑیں،عزیز محمد پیتافی،خان بہادر قادر بخش خان ابدالی،سید جاگن شاہ،اور رحیم خان کھوسہ شامل تھے۔اس عرضداشت کا متن دیکھیا ور پھر عام بلوچ کے بلند مقام پہ غور کیجیے۔آپ کو عام آدمی بہت بلند نظر آئے گا:

''عرضداشت گر قبول افتد زہے عز وشرف''

''بعد عرض فیض عرض باریافتگان پایہ سر پر سلطانی ظلِ یزدانی آیت دولت جاودانی' عدل وانصاف اور جہانبانی کے مصدر ومنبع اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالی جاہ، عالم پناہ والا بارگاہ، خدیو گیہان منصف دوران، سلیمانِ زمان، جمشیدِ جہاں، جناب معلیٰ القاب فیض مآب، معدلت انتساب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، اللہ ان کے اقبال اور شان وشوکت کو تاابد قائم ودائم رکھے۔

''بے حد عجز وانکساری کے اظہار وتسلیماتِ بے اندازہ وتعظیماتِ بے شمار کے بعد ہم ساکنان ضلع ڈیرہ غازی خان صوبہ پنجاب ملک ہندوستان یعنی بلوچی سرداران، ملازمان، رئیسان، میونسپل کمشنران اور دیگر رعایا بہ ادب و نیاز پایہ تخت اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ منبع فیوض وبرکات کو بوسہ دیتے ہوئے بادشاہ سلامت کی تاج پوشی کے جشن پر پُر خلوص ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے لیے یہ جشنِ سعید ہے کہ شہنشاہ برطانیہ کلاں اور قیصر ہند کی تاج پوشی کے باعث ہم جانثار اور وفادار بندوں کو اس پرمسرت موقع پر بے حد خوشی اور سرور حاصل ہوا۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہم سلطنتِ عظمیٰ کے دوسرے ممالک میں بسنے والوں کا مقابلہ علوم وفنون کی تحصیل اور تجارت وزراعت کی ترقی میں کسی طور پر نہیں کرسکتے۔ مگر ہم اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ ہم برطانیہ عظمیٰ کے تخت کی تابعداری اور فرمانبرداری میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ہم بصد عقیدت واحترام حضرت ملکہ معظم مغفور ومرحومہ قیصرِ ہند کی ذات والاصفات کے مداح ہیں جو ہمارے لیے گنجینہ فیوض وبرکات تھیں۔ وہ بے شمار اوصافِ حمیدہ کی حامل تھیں جنہیں حیطہ تحریر وتقریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ ممدوحہ مغفورہ نہ صرف عدل پرور اور کرم گستر ملکہ تھیں بلکہ ہندوستان کی رعایا کے لیے شفقت ومہربانی کے لحاظ سے مادر بھی تھیں۔ اس ملک میں ولی عہدی کے زمانہ میں حضور پرنور کی تشریف آوری اب تک ہمارے لیے انتہائی مسرت وطمانیت کا باعث ہے۔ ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ حضورِ انور شہنشاہِ اکبر اپنے عہد حکومت میں انہی خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرماتے ہوئے اس دور افتادہ علاقہ کے باسیوں کو حسبِ معمول اپنے شاہانہ اور کریمانہ الطاف وعنایات سے نوازتے رہیں جن کے پیشِ نظر حضور نے اس سرزمین کو وقار بخشا تھا۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال شہنشاہ بااستقلال اور عالم پناہ باکمال کے اقبال اور اجلال کو ہمیشہ عروج بخشے اور سایہ ہما پایہ فیض گنجور حضرت ملکہ معظمہ کے فیوضات کا ظہور اہل جان کی پیشانی پر تا ابدا قائم و دائم رہے۔ اقبال و اجلال شہنشاہ بااستقلال وعالم پناہ باکمال را پیوستہ بہ عروج دارا وسایہ حضور فیض گنجور حضرت ملکہ معظمہ صفالین ظہور برمفارق عالمیان تابقائی جہاں دائم و قائم داراد بحرمت النون و الضاد آمین یا الہ العالمین!''(3)۔

اللہ کا صد شکر کہ مندرجہ بالا عرضداشت جیسی ذہنیت کو بلوچ عوام الناس نے کبھی شرف و قبولیت نہ دی۔ انگریز کے یہ اعزاز یافتگان عرضداشتیں لکھ رہے تھے اور بلوچستان کے بیٹے بیٹیاں اپنے سروں کی بازی لگا کر انگریز کی بڑی انتظامیہ کو زخمی زخمی کررہی تھیں۔

برٹش بلوچستان تھا جو مستقل طور پر گورنر جنرل کے تحت تھا۔ اس کا مرکز کوئٹہ تھا۔ برٹش بلوچستان کے بھی دو حصے تھے:۔

پہلا حصہ کوئٹہ، نوشکی، بولان اور نصیر آباد پر مشتمل تھا۔ یہ علاقے خان کلات اور برطانیہ کے مابین اُن معاہدوں کی رو سے انگریز نے ہتھیا لیے تھے جو 1883، 1893 اور 1894 میں ہوتے رہتے تھے)۔

دوسرا حصہ قبائلی علاقہ پر مشتمل تھا جس میں مری، بگٹی، لورالائی، سبی، چاغی، ژوب، پشین اور چمن ایجنسی شامل تھے۔

2۔ سردار کو مضبوط کیا

سنڈیمن سے قبل انگریز حکومت کسی فرد یا افراد کے گروہ کے کسی جرم کا فیصلہ اس قبیلے کے

سردار کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعے کرتی تھی۔ مگر اب نئے سنڈیمن نظام کے وضع ہو جانے کے بعد پورا قبیلہ مجرم ٹھہرایا جانے لگا۔ اس نظام نے قبیلوں اور ریاستوں کے حکمرانوں کو پیسہ دینا شروع کیا اور قبیلوی ملیشیا (لیویز) کو تنخواہ دینی شروع کر دی۔ یہ لیویز انگریز کے مخالف قبیلوں کے خلاف جنگ کرنے کی پابند تھی۔ خود سردار اس لیویز کو بھرتی اور منظّم کرتا تھا۔ وہ ان کی تنخواہ سے جتنی چاہتا رقم کاٹ لیتا۔ اس رقم کو بلوچی میں ''کاٹ'' کہتے تھے۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ انہیں کچھ بھی نہیں دیتا تھا اور اُس کی ساری تنخواہ اپنی جیب میں ڈالتا۔ مگر وہ خود انگریز سے بے انتہا پیسہ لیتا تھا۔ سردار کا بیٹا یا بھتیجا اس لیویز فورس کا رسالدار بن جاتا۔ اس طرح انگریز نے ایک طرف تو پورا قبیلہ خرید لیا اور دوسری طرف ایک ایسا فیوڈل طبقہ پیدا، مضبوط اور مستحکم کر دیا جو اُس کی حکمرانی کو دوام دینے کے قابل بنا۔

انگریز نے اس طبقے کو صرف لیویز اور پیسہ کے ذریعے ہی مستحکم نہ کیا بلکہ اس نے زمین کے سلسلے میں بھی اس فیوڈل کو بہت مضبوط کیا۔ اس نے قبیلوی اراضی سے متعلق جھگڑوں کو اسی طبقے پر مشتمل لوگوں کے جرگوں کے حوالے کر دیا جو پولیٹیکل ایجنٹ کی منظوری سے یہ فیصلے کرتے تھے۔ انگریزوں کی پولیٹیکل ایجنسی کا دفتر خود سنڈیمن کی سربراہی میں کوئٹہ میں قائم تھا۔ یہ پولیٹیکل ایجنسی محض خان کی سرگرمیوں کو کنٹرول نہیں کرتی تھی بلکہ سراوان اور جھلاوان کے قبائل کی نگرانی بھی اس کے فرائض میں شامل تھی۔ مشرقی قبائل کو ''تل چوٹیالی'' سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

انگریز کے نئے نظام نے فوجی مقاصد کی خاطر انگریزوں کی موجودگی اور سردار کو نظم وضبط کا ڈھانچہ منظّم کرنے کی گارنٹی دی۔ مثلاً 8 اگست 1901 میں کمشنر سبی، خان بہادر خیر بخش خان مری، مری کے مقدم اور گزینی عملداراروں نے ایک دستور العمل بنایا جس میں مری سے متعلق معاملات کی بات کی گئی۔ اس دستور العمل کے مطابق بارکھان، کوہلو اور دکی کے، مری تھانوں کے انچارج سردار کے خاندان یعنی گزینی عملداروں کو مری سردار کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ جب کسی مری سے جرم سرزد ہو تو اس علاقے کے تھانے کا انچارج گزینی عملدار پابند ہوگا کہ ملزم کے علاقہ میں موجود ہونے کی صورت میں اُسے چھ دن کے اندر اندر گرفتار کرے اور علاقے سے باہر جانے کی صورت میں دس دن کے اندر اندر پکڑ لے۔

اس نے سرداروں کو تاج برطانیہ کے تنخواہ خور ایجنٹ میں بدل کر بھی اُن کی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔

پولیٹیکل ایجنٹ اور انگریز فوج کی طرف سے حدود نافذ کر کے سردار کی اُس اہلیت کو محدود کر دیا گیا جس کے تحت وہ اپنا اثر اپنے علاقے سے باہر بڑھاتا تھا۔ اُس کی اپنی کمیونٹی میں اس کے مقام کو بہت اونچا کر دیا گیا۔ سردار کو آزادانہ طور پر پیسے دیے جاتے اور اُسے ایسے اختیارات دیے گئے جو اس سے قبل اس کے پاس نہ تھے۔ اسے شاہی جرگہ اور لیویز کے ذریعے دولت بٹورنے کے سارے وسائل وہتھیار مہیا کر دیے گئے۔

قبائل کی طرف سے سردار کو دی جانے والی رضا کارانہ امداد، نذر اور عطیات اُس وقت سردار کا حق بن گئے جب انگریزی حکومت نے اُن سب عطیات کو سرداری ٹیکس کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ اب سردار کے لیے یہ ٹیکس لیویز والے لیا کرتے تھے۔ انگریز کی یہ لیویز فورس گویا سرداروں کی ایک قسم کی سرکاری فورس بن گئی (4) (آج اکیسویں صدی میں بھی سرکاری لیویز سردار کی اسی طرح کی خدمات کے لیے موجود ہے)۔

چنانچہ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ انگریز نے سرداری نظام کو صرف رسمی اور روایتی طریقوں سے مضبوط نہ کیا بلکہ اصل میں سرداری کے ادارہ کو نئے سرے سے زندہ کر دیا (5)۔ اس حد تک کہ 1931 کی مردم شماری میں (مری) سردار کے بھائی کو سنسس آفیسر مقرر کر دیا۔ (6)۔ المختصر، انگریز نے سرداری نظام کو خوب سہارا دیا، خصوصاً اُس وقت جب یہ نظام مر رہا تھا۔

بروس نے ایک بار کہا تھا: ''سردار اور لیویز ہماری انتظامیہ میں ریڑھ کی ہڈی ہیں''۔ (اور یہی دونوں دراصل بلوچ کے لیے غلامی کی بیڑیاں بنے رہے آج اکیسویں صدی کے پہلے نصف تک)۔

انگریز نظام نے سردار کے اختیارات میں یہ وسعت بھی دی کہ وہ اپنے علاقے میں جو بھی نئے ٹیکس چاہتا' لگا سکتا تھا۔

3۔ایک تضاد پیدا ہوا

چنانچہ، برطانوی کالونیل عہد کے اندر ہم بلوچ معاشرے میں موجود طبقاتی ساخت میں بہت تیزی سے تبدیلی دیکھتے ہیں۔ایک بنیادی تضاد اِس تشکیل پذیر قومیت اور اُس بیرونی قوت انگریز کے درمیان تو موجود رہا ہی جسے سامراج کہا جاتا ہے۔

مگر اس تضاد کے ساتھ ساتھ اب ایک اور تضاد بھی پیدا ہوا: عوام اور سردار کے بیچ تضاد۔ ایک طرف سردار تھے جو کہ برطانوی سامراج کے سرمائے کے چوکیدار و محافظ تھے اور دوسری طرف بلوچستان کے عوام تھے۔انگریز نے قبائل کے افراد کا حقِ انتخاب چھین کر سردار کو خود سر بنا دیا، اور اس کو ایک حد تک وراثتی صورت دے دی۔

سردار اور عوام کے درمیان یہ تضاد اس لیے بھی ایک اہم تضاد بن گیا کہ انگریز بالواسطہ ایسی حکمرانی رکھے ہوئے تھے۔جس میں اُس کا نظر آنے والا مہرہ سردار تھا۔ساری معاشی زائد پیداوار سردار (نیم فیوڈل ارسٹوکریسی) کے قبضہ میں تھی۔اس لیے فوری تضاد بلوچ عوام کا اِس زائد پیداوار کے قبضہ گر کے ساتھ بنا۔معیشت میں جمود آیا، سیاسی انحطاط میں اضافہ ہوا۔انگریز سامراج، سرداری نظام کو فعال طور پر فنانس کرنے لگا اور نیم خانہ بدوش کسانوں کے استحصال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس سارے نظام میں سرفوں، دیہاتی اجرتی مزدوروں، اور نیم خانہ بدوش مویشی پالوں کو دوہرے استبداد کا سامنا تھا.....

چنانچہ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ بلوچ عوام انگریز کے خلاف لڑ کر فیوڈل کے خلاف لڑ نہیں سکتے تھے۔لیکن اگر وہ فیوڈل کے خلاف لڑتے تو دراصل وہ فیوڈل اور انگریز دونوں کے خلاف لڑ رہے ہوتے۔فیوڈل کا استبداد فوری تھا، فیوڈل قابل رسائی تھا اور اس کی موجودگی خود سامراجی قبضہ کا ثبوت تھی۔

بدقسمتی سے پوری تاریخ میں ہماری سامراج دشمن جدوجہد کبھی بھی بہ یک وقت موثر قسم کی فیوڈل دشمن جدوجہد نہ رہی۔اسی لیے تو اس سامراج دشمن جدوجہد سے صرف فیوڈل کے ہاتھ ہی مضبوط ہو سکتے تھے اور یہ جدوجہد شاید بلوچ عوام کو آزادی نہیں دلا سکتی تھی۔نتیجہ یہی نکلا کہ بلوچستان میں فیوڈل مضبوط تر ہوتا گیا۔

انگریز سامراج نے ہمارے سماج کو ایک نئی تبدیلی سے بھی دوچار کر دیا۔جولائی 1899 کو حکومت برطانیہ نے خانِ کلات سے نوشکی کا علاقہ 9 ہزار روپے سالانہ کے حساب سے اجارہ پر لے لیا۔پھر اُس نے نصیر آباد کا علاقہ 1903 میں ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے سالانہ ٹھیکہ پر لیا گیا۔اس طرح جب مستقل اجارے کا عمل پایہِ تکمیل کو پہنچا تو خان کلات کو گھر بیٹھے بیٹھے کوئٹہ سے 25 ہزار، بولان سے 30 ہزار، نوشکی سے 9 ہزار اور نصیر آباد سے ایک لاکھ پندرہ ہزار کی رقم ملنے لگی۔(18)۔(عجیب قسم کا مالکِ مکان، اور عجیب قسم کا کرایہ دار!)۔کرو کچھ نہیں۔بس پیسہ آتا رہتا اور کاہلی مسلط ہوتی رہتی۔حاکم کے پاس اصل چیز اختیارات ہوتے ہیں۔پیسہ تو سود خور مہاجن کے پاس بھی بہت ہوتا ہے۔۔۔۔اور اختیار اب خان کے پاس کچھ نہ تھا۔

برطانوی سامراج نے خان کلات کے رول میں ایک بنیادی تضاد متعارف کیا۔ وہ یہ کہ حالانکہ خان ساری ریاست کلات کی صدارت کرتا تھا' سرداروں کے علاقوں کی اپوئنٹ منٹ کا برائے نام اختیار بھی رکھتا تھا، اور کچھی اور جھلاوان کے سرداروں کی تنخواہیں بھی دیتا تھا۔ مگر اُسے سرداروں کے معاملات حتیٰ کہ ایک سکول اور ایک ہسپتال کی تعمیر تک کی منظوری دینے کے اختیارات بھی حاصل نہ تھے۔یہ سارے اختیارات انگریزوں نے اپنے پاس رکھے تھے

جنہیں اُن کا پولیٹیکل ایجنٹ استعمال کرتا تھا۔

4۔ریلوے لائن کا آغاز

فرنگی سامراج نے بااثر بلوچ فیوڈل حکمران طبقے کو مضبوط بنانے میں خوب مدد دی، اور پھر اُسی کی مدد لے کر، اپنی استعماریت کو زبردست فائدہ اور کامیابیاں بخشیں۔ واضح رہے کہ موجودہ سبی، سنڈیمن آباد ہوا کرتا تھا (موجودہ سبی 1878 کے دوسرے برطانوی حملے کے بعد تعمیر ہوا) اور اسی سبی کو سردیوں میں کالونیلزم کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہیں ہمارے فیوڈلوں کے بنگلے (اوطاق) تعمیر ہوئے۔ اُن کے ٹیکسوں کے سالانہ حساب کتاب ان کے منشی یہاں لاکر انہیں دینے لگے اور اسی شہر تلے بلوچ کی طبقاتی درجہ بندی بڑی تیز رفتاری سے مضبوط ہوتی گئی۔

سبی بلوچستان کے عوام کے لیے ظلم واستبداد کا ویسا ہی ہیڈ کوارٹر تھا جس طرح کہ 1973 کے بعد کوئٹہ بن گیا ہے۔ ستمبر 1879 میں سندھ سے سبی تک 132 میل ریلوے لائن ایک سو ایک دن میں مکمل ہوگئی اور 14 جنوری 1880ء کی سہ پہر کو دھواں اگلتا ہوا اولین سٹیم انجن سیوی میں داخل ہوا(7)۔

یوں اِس سامراجی ڈاکو نے بلوچ کو سائنس کی ایک زبردست ایجاد سے متعارف کرادیا۔ ظاہر ہے کہ ہم نے ریل کا انجن پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس انقلابی دریافت کے سارے فضائل تو ہمارے ذہنوں میں آگے چل کر کھلنے تھے۔ اب تو ہم بقول مست توکلی ''قدرت وکمالات کے مالک، خدا کے اِس دھمال والے دُھودُھو کو دیکھ رہے تھے۔ یہ، جو بادشاہوں کے کمالِ فن کا نمونہ تھی، عجیب آوازوں بھری مشین جس کے بند بند سے شرار آمیز دھواں بلند ہوتا تھا، جو صیقل شدہ نعلوں پہ پھسلتی ہوئی آتی ہے، فوجی دستوں کی طرح جھپٹتی ہے، تیز رفتاری سے پنکھ چلاتے اڑتے اڈ آتی ہے، اپنے نپے تلے پہیوں پہ لڑھکتی آتی ہے۔ سیاہ پستان والی یہ عورت تیز چلتی آتی ہے، یہ ساون کے بادلوں کی طرح اڈتی آتی ہے''۔

سبی کے بعد انگریز نے ریلوے کو ناڑی گارج میں سے ہرنائی کے روٹ پر چھپر اور کوئٹہ تک لے جانے کی منظوری دی۔ یوں جیکب آباد کوئٹہ ریلوے بن گئی۔ کوئٹہ چمن ریلوے بعد میں قائم ہوگئی۔ اور پھر سپیزنڈ زاہدان سیکشن اور بوستان ژوب سیکشن قائم ہونے کے بعد تو بلوچستان میں ریل کا جال سا پھیل گیا۔ تصور کیجئے معدنی دولت کی لوٹ کس قدر آسان ہوگئی!۔

اِس دور اندیش سامراج نے مری قبیلے کے بشمول اُن سارے قبیلوں سے حفاظتی معاملات طے کیے جن کے علاقے سے یہ لائن گزرتی تھی۔ لائن کے ساتھ ساتھ مختلف مقامات پر لیویز پوسٹ قائم کی گئیں۔

1900 کے بعد انگریز نے ریلوے کے علاقوں میں اپنا کنٹرول بڑھانے، اور اخراجات کی وصولی کے لیے انہی راستوں سے لوگوں اور مال کی آمدورفت بڑھانے کی کوشش کی۔ اس غرض سے اس نے ریلوے سٹیشنوں پر ڈپو اور ویئر ہاؤس بنائے۔ اس سے فوری کامیابی ہوئی۔ اونٹ کاروان کے مقابلے میں ریل کم پیسہ، کم وقت اور کم نقصان پہ میسر ہوگیا۔ یوں ساری تجارت بدل گئی۔ افغانستان کے لیے شُتر کارواں کے ذریعے تجارت والی بندرگاہیں غیر اہم ہو گئیں۔ اور اب کراچی اہم شہر اور بندرگاہ بن گیا۔

یہ نتیجہ بھی نکلا کہ شتر کاروانوں والے پرانے روٹ کے قبائل کی اہمیت کم ہوگئی، اُن کی آمدن گھٹ گئی اور وہاں اونٹوں کی پرورش کم ہوئی۔ اس طرح اُن کی پوری معیشت تبدیل ہوکر رہ گئی۔ اونٹ کاروانوں والی تجارت کی جگہ ریل کی تجارت چل پڑنے کے نتیجے میں، سب سے زیادہ نقصان کلات اور سومیانی کا ہوا۔ یہ دونوں شہر سمجھو ویران ہوگئے۔

یہ ریلوے سٹیشن، محض سیکورٹی پوسٹ نہ تھے بلکہ تجارتی اڈے بھی تھے اور انتظامی شہر بھی۔ لہٰذا کوئٹہ سب سے بڑا قصبہ بنا جو چند سالوں کے اندر اندر ٹریڈ، ٹرانسپورٹ، ایڈمنسٹریشن اور کلچرل مرکز بن گیا(8)۔

1885 میں ریل کی لائن ہرک تک، اور 1886 میں کوئٹہ تک بچھا دی گئی۔ اور 1905 میں کوئٹہ نوشکی ریلوے لائن کے افتتاح کے ساتھ بلوچستان ریلوے لائن کی لمبائی 481 میل ہوگئی ۔1906 میں نوشکی سے زاہدان تک ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی۔

5۔ نئے شہر قائم کیے

انگریزوں نے اٹھارہ نئے شہر بسائے۔ یہ شہر بلوچستانی الاصل 26 شہروں کے علاوہ تھے۔ اور یہ نئے اٹھارہ شہر اُس کی بنائی ہوئی تجارتی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بارکھان کو میر حاجی سے قریب ہی 1884 میں بنایا گیا۔ ژوب، اپوزئی کے قریب 1889 میں بنایا گیا (9)۔ 1880 کے بعد شہروں کی تفصیل یوں تھی:

1- برطانوی نوآبادیاتی شہر (نئے شہر)۔ پشین، کوئٹہ، سبی، نوشکی، کلات، خاران۔

2- برطانوی نوآبادیاتی شہر (پرانے شہر کے ساتھ نیا شہر)۔ ژوب، موسیٰ خیل، قلعہ سیف اللہ، ہندوباغ، قلعہ عبداللہ، لورالائی، رکھنی، بارکھان، ہرنائی، مچ، دالبندین اور نوکنڈی۔

3- اینگلو بلوچستانی شہر: گوادر، پسنی، تربت، پنجگور، اوتھل، بیلہ، خضدار، گنداواہ، بھاگ۔

4- بلوچستانی شہر: کاہان ماوند، لہڑی، ڈیرہ بگٹی، حاجی، جھل، سوراب، اور ماڑہ۔

5- بلوچستانی شہر تنزل میں: سومیانی، میر حاجی کوٹ، مینہ بازار۔

یوں یہ نئے شہر مارکیٹ بنتے گئے۔ پہلی بار شہر خانہ بدوشی کی زندگی پر حاوی ہونے لگے ۔اب ریل کے ساتھ ساتھ موجود شہروں میں کارواں سرائے، نئے بازار، مارکیٹ ہال اور ڈپو بن گئے۔ ریل اور ٹرک سے ٹرانسپورٹ کو ریگولر بنایا گیا۔ اس طرح یورپ سے اشیاء منگائی گئیں اور بلوچوں میں انہیں مقبول بنایا گیا۔

نئے نئے شہر بسانے سے آس پاس زراعت کو فروغ ملا جس سے قبائل اپنی ضرورت سے زائد اور منڈی کی خاطر پیداوار کرنے پر راغب ہوئے۔ اس طرح قبائل شہروں کے لیے مال پیدا کرنے لگے اور خود بھی ہینڈ میڈ کے بجائے فیکٹریوں سے تیار شدہ مال استعمال کرنے لگے۔ وہ ماچس سے لے کر پیٹرومیکس تک، سائیکل سے لے کر ریڈیو تک، اور درزی والے کپڑوں سے لے کر باورچی خانے کے برتنوں تک نئی نئی چیزیں استعمال کرنے لگے۔

بڑے بڑے سردار گھرانوں کے افراد اپنے دیہات کے بجائے شہروں میں کشش محسوس کرنے لگے۔ وہاں اُن کے بیٹے سکول جانے لگے۔ نیز وہاں وہ بجلی، اور جدید ہاؤسنگ وغیرہ سے آشنا ہوئے اور برطانوی درآمد کردہ سماجی زندگی (کلب) سے بھی واقف ہوئے۔ وہ وہاں معاشی اور سیاسی طور پر متحرک ہوئے۔ وہ وہاں بنکاری کے ذریعے، اور ہندو تاجروں، ملٹری اور برطانوی اہلکاروں کی مدد سے قبیلے سے باہر ایک بالکل ہی نئے سماج میں پرورش کر سکتے تھے ۔(10)۔

شہروں میں دیہات کے برعکس پانی کی ترسیل کی ضمانت ہوگئی، روزگار کے مواقع تھے ۔اس لیے بڑے لوگ وہاں مکان بنا کر معزز بنے۔ اِس نئی ریل پیل سے شہر تعداد اور حجم دونوں میں بڑھتے گئے۔ سال 1900 کے بعد کی دو دہائیوں میں ان شہروں میں سردار آئے، کلرک آئے، سپاہی آئے اور بیروزگار آئے۔ سبی میں، کوئٹہ میں، مچ، لورالائی اور مستنگ میں ۔(11)۔

سڑک، ریل اور قصبہ کی تعمیر میں قبائلیوں کو کھپایا گیا۔ اسی طرح انتظامیہ میں نچلی نوکریاں انہیں ملیں۔ نیز بہت سے بلوچ، انگریز آرمی اور لیوی میں سپاہی بھرتی ہوئے۔ آبپاشی اور شجرکاری کی سہولتیں ملیں۔ (مثلاً یہ دیکھیے کہ 1880 میں ایک ''ٹری کمیٹی'' بنائی گئی جس نے تربوز، سبزی اور انگور کی نئی قسمیں درآمد کیں، 1881 اور 1882 میں کندہار سے ساٹھ ہزار سفیدے اور بید کے درخت، اور لندن سے آلو بخارا، سیب اور خوبانی کے 200 درخت منگوائے گئے۔ درختوں کی نرسریاں قائم کی گئیں۔ 1902 میں یہاں ایک لاکھ دس ہزار نہال موجود تھے (12)۔

6۔ زمین کی سٹیلمنٹ

انگریز نے آکر ہماری زمین کو مشترکہ ملکیت رہنے نہ دیا۔ بلکہ اسے نجی ملکیت میں تقسیم کیا۔ اس سے ہمارا پورا سماجی ڈھانچہ بدل کر رہ گیا ۔

بیسویں صدی کے اوائل میں نئے وائسرائے لارڈ کرزن نے اس وطن کی تشکیل اس طرح سے کی تھی کہ یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا:

الف: ایک طرف تو ریاستی بلوچستان تھا۔ جو یوں تھا:

1۔ ریاست کلات۔ کلات خضدار مستنگ۔ یہاں خان کلات کی حکمرانی تھی۔

2۔ ریاست مکران۔ آواران پنجگور، اور تربت۔ اسے گچکی نواب چلاتے تھے۔

3۔ ریاست لسبیلہ: جام آف لسبیلہ چلاتا تھا۔

4۔ گوادر مسقط کے تحت تھا۔

5۔ ریاست خاران۔ خاران، ماشکیل۔ یہاں نوشیروانڑیں نواب حکمران تھا۔

اوران کا مرکز کلات شہر تھا۔ خانِ کلات برائے نام سربراہ تھا۔ یہاں ایک عدد وزیراعظم بھی ہوتا تھا، جسے خان نہیں بلکہ انگریز کا اے۔ جی۔ جی مقرر کرتا تھا۔

ب:۔ دوسری طرف برٹش بلوچستان تھا جو مستقل طور پر گورنر جنرل کے تحت تھا اور اس کا مرکز کوئٹہ تھا۔ برٹش بلوچستان کے دو حصے تھے۔

(i) پہلا حصہ کوئٹہ، نوشکی، بولان اور نصیر آباد پر مشتمل تھا۔ (یہ علاقے خان کلات اور برطانیہ کے مابین اُن معاہدوں کی رو سے انگریز نے ہتھیا لیے تھے جو 1883، 1893 اور 1894 میں ہوتے رہتے تھے)۔

(ii) دوسرا حصہ قبائلی علاقہ پر مشتمل تھا جس میں مری، بگٹی، لورالائی، سبی، چاغی، ژوب، پشین اور چمن ایجنسی شامل تھے۔

یہ ایک زبردست انتظام کاری تھی۔ ساتھ ہی انگریز نے بہت منظّم طور پر فیوڈلوں کو لالچ کے نہ ختم ہونے والے نرغے میں ڈال دیا۔ اُس نے انہیں زمینیں دیں اور اُن کی خوب مالی مدد کی۔ جن علاقوں کو برٹش بلوچستان میں ڈال دیا گیا وہاں کے لوگوں کو عمومی طور پر ہندی اور، اِس طرح عالمی منڈی کی دُم سے باندھ دیا گیا۔

مگر جس تیز رفتاری کے ساتھ کیپٹل ازم کو جاری ہونا تھا وہ نہ ہوا۔ انگریز نے پورے علاقے میں مالیہ کا نیا نظام نافذ کیا جو کہ ہند کے دوسرے صوبوں میں بھی موجود تھا۔ سرکاری زمین کے ساتھ ساتھ یہاں فیوڈل نجی ملکیت کی مضبوطی کے لیے بھی قوانین بنائے گئے۔ پانی پر ''آبیانہ'' لگایا گیا مگر فیوڈل طبقہ کے لوگوں سے کسی طرح کا مالیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

انگریز سے قبل بلوچوں میں ہر قبیلے کی زمین ایک معین وقت کے لیے تقسیم ہوتی تھی۔ وہ عرصہ گزر جاتا تو ایک بار پھر زمین نرینہ زندہ لوگوں کے حساب سے دس بیس سال کے لیے تقسیم ہوتی تھی۔ مری قبیلے میں زمینوں کی پہلی تقسیم 1840 میں سردار دودا خان کے دور میں ہوئی۔ پھر دوسرے قبائل سے قبضہ کردہ یا بنجر زمینوں کو آباد کرنے کے سبب علاقے میں وسعت آجاتی تھی۔ اُس وجہ سے اُن کے درمیان ہر دس پندرہ برسوں میں ایک بار زمین کی تقسیم ہوتی تھی۔ بگٹی میں بھی تقسیم شدہ زمین ایک معین عرصہ بعد پھر اجتماعی بنا دی جاتی۔ اور اُسے زندہ نرینہ انسانوں کی تعداد کے حساب سے دوبارہ بانٹ دیا جاتا۔ دس پندرہ سالوں بعد ایک بار پھر زمین قبیلے کی مشترکہ ملکیت بن جاتی اور پھر زندہ نرینہ لوگوں کی تعداد کے مطابق دوبارہ تقسیم ہوتی تھی۔

یہ باری باری والی تقسیم ساری پڑوسی قوموں میں موجود تھی۔ بلوچوں کے علاوہ پشتونوں، ازبک، ترکمن اور وسطی ایشیاء کی ساری قوموں میں یہ نظام مروج تھا(13)۔

بہت بعد میں جا کر چند قبیلوں نے اپنی زمین کو مستقل طور پر تقسیم کر دیا۔ مثلاً بگٹی میں ایک دو قبیلے رہ گئے جو مری کی طرح ہر دس سال بعد زمین تقسیم کیا کرتے تھے۔ جبکہ بگٹی کی باقی زمین مستقل طور پر سات حصوں میں تقسیم ہے۔ جھل مگسی کے علاقے ''کنارا'' میں بھی اجتماعی زمین 1980 کی دہائی میں مستقل تقسیم ہوئی۔ خاشک دریا سے آنے والا پانی ابھی تک ہر سال

نئے سرے سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ کانک، مستنگ اور چاغی میں ''بوتار'' نظام رائج ہے جس میں زمین مشترکہ ملکیت ہے۔ اُسے کاشت کرنے کی خاطر موروثی بزگروں کو دیا جاتا ہے۔ بوتار نظام میں بزگر کو زمین کی جزوی ملکیت کے حقوق حاصل ہیں۔ وہ پانچویں حصے سے لے کر آدھے حصہ تک زمین کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مستقل پانی رکھنے والی زمینوں کے قبیلے پابند تھے کہ پانی کے نالے کی صفائی کرتے رہیں۔

آبی زمینوں میں پانی بہر حال زمین سے زیادہ اہم اور قیمتی ہوتا ہے۔ اسی لیے پانی والے علاقوں میں اجتماعی طور پر کاشت کی جانے والی زمین کی پیداوار طائفے کے ارکان کے مابین زمین کے حصوں کے بجائے پانی کے حصوں کو اہم گردانا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پانی کے حصوں کو رہن رکھنے اور فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح پانی کے حصے قبیلے کے وڈیروں اور پیسے والوں کے ہاتھوں مرکوز ہوتے گئے۔

ملاّ، سید، اور اسی طرح کے دیگر کام نہ کرنے والے لوگوں کے اخراجات کسان برداشت کرتے تھے۔ انہیں زکواۃ اور نذرانہ کے بطور اناج دیا جاتا تھا۔ ہل اور دیگر اوزاروں کی مرمت کرنے والے کو بھی فصل تیار ہونے پر پیداوار سے مخصوص حصہ ملتا تھا۔

ہم ریلوے کی بات کر چکے ہیں۔ مگر ایک بات اہم ہے۔ وہ یہ کہ بلوچ زرعی معیشت میں اُس وقت بڑی تبدیلی آئی جب 1885 میں ریل کی لائن ہرک تک، اور 1886 میں کوئٹہ تک بچھا دی گئی۔ اور 1905 میں کوئٹہ نوشکی ریلوے لائن کے افتتاح کے ساتھ بلوچستان ریلوے لائن کی لمبائی 481 میل ہوگئی۔ 1906 میں نوشکی سے زاہدان تک ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی۔

یہ ریلوے لائن بلوچستان کے زرعی علاقوں میں سے گزرتی تھی جس سے معیشت میں بہت بہتری آئی۔ مگر چونکہ زراعت کی ملکیت فیوڈلوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس ریلوے لائن سے فیوڈل طبقے کو ہی فائدہ پہنچا۔ اُن کے ساتھ ساتھ تاجروں کی لوٹ کھسوٹ کو بھی تقویت ملی جس سے کسانوں کی غریبی اور مفلسی بڑھتی گئی۔ مثلاً مری علاقے میں گہنڑیجی (سپین تنگی) نامی ریلوے سٹیشن ہے جو دکی، ماوند، کوہلو، میختر، بارکھان اور مری کے شمال مغربی حصے کی گویا فارورڈنگ مارکیٹ تھی۔ تصور سے بھی بڑھ کر زیادہ مال یہاں اتارا لادا جاتا تھا۔ 1906 میں یہاں درآمدات 17,240 من تھے۔ (چاول، چینی وغیرہ) اور 18,500 کے برآمدات (گندم اور پشم) تھے(14)۔

انگریز کا مضبوط کردہ فیوڈل یہاں سے محنت کش کسانوں کا استحصال بہت ناترسی سے کرتا تھا۔ 1891 سے 1901 تک کسانوں سے جو مالیہ لیا جاتا تھا۔ وہ فی ایکڑ دو روپے سے لے کر 2.5 روپوں تک بڑھا دیا گیا۔ ان پیسوں سے 1.5 روپیہ انگریز لے جاتا تھا اور ایک روپیہ خان کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ خانہ بدوشوں سے چراگاہ کے استفادہ کے عوض لیا جانے والا مالیہ بھی ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکا تھا۔ مثال کے طور پر تل چوٹیالی کے علاقے کا دس سالوں (1891.....1901 تک) کا مجموعی مالیہ ایک لاکھ ننانوے ہزار روپے سے لے کر دو لاکھ ستاسٹھ ہزار روپے تک بڑھ گیا۔

7۔ معدنی دولت کی لوٹ

انگریز سے شناسائی کی بدقسمت گھڑی سے لے کر آج تک، بلوچستان کی لوٹ مار کا اہم ترین وسیلہ یہاں کی معدنیات رہی ہیں۔ (گوادر سمندر تو ابھی ہاتھ آیا)۔

مری علاقے میں کوہِ مورانی کے مشرق میں گھوڑے کی نعل نما تنگ وادی ''کٹنڑ'' واقع ہے۔ کٹنڑ ایک بلوچی لفظ ہے جس کا مطلب ہے تارکول۔ وہاں انگریز کو تیل کے آثار نظر آئے۔ یہ جگہ ببر کچھ سے سڑک کے راستے 43 میل پہ واقعہ ہے۔

اِن چشموں میں بہت سا سلفر موجود ہے، اور ان میں درجہ حرارت 102 فارن ہائیٹ ہے۔ یہاں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ پٹرول بلبلے بنا کر نکلتا ہے۔ یہ بلبلے پانی کی سطح پر نکلتے

ہیں اور یہاں ایک طشتری کی طرح تیرتے رہتے ہیں۔ جس کا رنگ کولتار جیسا ہے اور قطر تقریباً ایک انچ ہے۔

انگریز کے بقول ''اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس پٹرول کے ساتھ پانی تھا' سلفر کی آمیزش تھی اور اس کی کششِ ثقل بھاری تھی(15)۔ یہ سیاہ گاڑھا پیٹرولیم ہے۔ یہ 60 ڈگری فارن ہائٹ سے زیادہ کے درجہ حرارت میں پانی سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور اس پر تیرنے لگتا ہے۔

1883-84 کی سردیوں میں ایک ماہر ٹاؤن سینڈ، کٹڑ پہنچا۔ اس نے شراب کشید کرنے کے برتن کو استعمال کر کے کافی گھاسلیٹ کشید کیا اور اس کو کوئٹہ لے گیا اور مئی 1884 میں ایک عام سے لالٹین میں جلا کر AGG کو دکھایا۔

سرکار کو تیل کی اس فیلڈ کو مزید ترقی دینے کا سوجھا۔ وہ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے ہی تو یہاں حملہ آور ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے ٹاؤن سینڈ کو ماہروں کی بھرتی کے لیے انگلینڈ اور کینیڈا بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ کینیڈا سے چار ماہرین کے ساتھ دسمبر 1884 کو واپس سبی پہنچا۔ جلد ہی مشینری بھی پہنچ گئی۔ بورنگ شروع ہوئی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھ سوراخ نکالے گئے۔ صرف 22 فٹ کی گہرائی میں تیل مل گیا اور 28 اور 58 فٹ پہ دوسری رگیں بھی مل گئیں۔ تیل اور پانی کو پمپنگ کے ذریعے باہر نکالا گیا۔ اگلے مارچ کے شروع تک 60 بیرل یا 2000 گیلن تیل نکالا گیا۔ مگر چونکہ تیل کو سٹور کرنے کی سہولت موجود نہ تھی، اس لیے کام کو روک دیا گیا۔

انگریز نے یہ بھی دیکھا کہ مری کے علاقے میں پٹرول کے علاوہ کوئلہ بھی موجود تھا۔ نیز سنگ مرمر جیسا قیمتی معدنی خزانہ موجود تھا جو ماوند اور ہرنائی وادی میں تھا۔ اس کے علاوہ کٹڑ اور سپین تنگی کے قریب ٹُنگ کے مقام پر کافی مقدار میں جپسم بھی موجود تھی۔

کٹڑ کے اِس تیل نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ جنوری 1889 میں کوجک ریلوے کے کام کے لیے اس کی بڑی مقدار سپلائی کی گئی۔ مارچ 1890 تک کٹڑ سے 2,41,459 گیلن پٹرول بھیج

دیا گیا۔ کٹڑ میں سپرنٹنڈنٹ کا گھر ہوا کرتا تھا، ہسپتال اور اس کے اسسٹنٹ کے کوارٹر تھے۔ وازی کے پانی کا پائپ لائن تھا۔

8۔ سڑکیں

1886 میں بلوچستان اور پنجاب کو ملانے کے لیے ڈیرہ غازی خان فورٹ منرو سڑک بنائی گئی جس کو بعد میں بارکھان اور لورالائی تک وسعت دی گئی(16)۔

9۔ کوئٹہ کا جدید شہر، بلوچستان کی بربادی کا باعث

خداداد خان پر مسلط شدہ معاہدے کے تحت کوئٹہ کے قلعے اور آس پاس کے علاقے 1883ء میں برٹش انڈیا میں شامل کیے گئے۔ آج بلوچستان کا صوبائی دارالحکومت کوئٹہ، تاریخ میں کوئی خاص شہر یا مرکز کبھی نہیں رہا تھا۔ میسن پہلا یورپی باشندہ تھا جس نے 1828 میں یہ جگہ دیکھی۔ اس کہنا تھا کہ اس زمانے میں ''میری'' کے گرد 300 مٹی کے گھروں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس قصبہ کے گرد مٹی کی ایک دیوار تھی۔

جب 1839 میں انگریز فوج یہاں پہنچی تو یہ پولیٹیکل ایجنٹ کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ چالیس برس بعد 1876 میں جب انگریزوں نے شال میں کینٹ کی بنیاد رکھی تو اس وقت تک یہ ایک خانہ بدوش علاقہ تھا۔ 1877 میں لیفٹیننٹ ہیوسن کے قتل اور لیفٹیننٹ کِن ہارٹ اور کیپٹن سکاٹ کے زخمی ہو جانے کے بعد ''میری'' کو ایک اسلحہ خانہ میں تبدیل کیا گیا اور قصبہ کو آج کی موجودہ جگہ پر منتقل کیا گیا۔

انگریز فوج کی چھاؤنی کے قیام نے کوئٹہ کو قصبہ سے ترقی دے کر ایک اہم شہر بنا ڈالا۔ اب یہ ایک ''کنٹونمنٹ سٹی'' بنا۔ اس نئے شہر کی بڑی آبادی انگریز فوج کے ساتھ آنے والے کیمپ فالوئرز کی تھی۔ انگریز نے سارا کاروباری گروہ باہر سے درآمد کر رکھا تھا۔

فروٹ، سگار، عورت الغرض انگریز گیریزن کی ضرورت کی ساری چیزوں کی دکانیں، باہر کے تاجر چلاتے تھے۔ سندھی اثر یہاں زیادہ تھا۔ بلوچستان بھر کے شہری علاقوں میں سندھ کا ہندو دکاندار طبقہ بااثر تھا۔ انہی شہری علاقوں سے بلوچستان بھر کی سیاست و معیشت زبردست طریقے سے متاثر ہوئیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں کلات میں 500 بہترین گھر ہندو دکانداروں کے تھے۔ بعدازاں جوں جوں مختلف گیریزنوں کے قریب جدید شہر بننے لگے، تو پنجابی اور سندھی دکانداروں کا یہ طبقہ اُبھر کر نئی مارکیٹنگ کے مواقع پاتا رہا۔ تعمیراتی صنعت انہوں نے سنبھال لی، دوسری جگہوں سے لائی گئی روزمرہ استعمال کی چیزوں کی مارکیٹنگ انہی کے قبضہ میں آئی، اور مارکیٹ کے سارے کام انہوں نے سنبھالے، ریل اور سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے انہوں نے لے لیے۔ الغرض ان سارے نئے مواقع نے بلوچستان کی شہری معیشت کو شروع ہی سے ایک نمایاں، مگر گنجلک رول بخشا۔

بے زمین کردہ بلوچ محض ایک نوکر یا پھر دِھاڑی کا مزدور ہی بن سکتا تھا۔ سردار اپنی دنیا میں گم گیریزن سیکٹر میں نئی دریافت کردہ دولت کا اندازہ نہ کرسکا۔ چونکہ بلوچ سردار ابھی تک قبائلی سردار سے فیوڈل بننے کے عبوری مرحلے میں تھا، اس لیے وہ بورژوا طریقوں اور وسائل کو نہ تو جانتا تھا نہ انہیں استعمال کرسکتا تھا۔ چنانچہ یہ سادہ سردار محض اپنے عزیزوں کو لیویز میں فضول اہلکار بنواتا گیا جبکہ غیر بلوچ تاجر سارے ملٹری ٹھیکے وصول کرتے رہے۔ اس طرح بلوچستان کی پہلی بورژوازی غیر بلوچ عناصر پر مشتمل تھی۔ ایک ایسا بیج بویا جارہا تھا جس نے اگلے دوسو برس تک بلوچ معیشت اور سیاست کو ٹی بی کا مرض لگائے رکھنا تھا۔

ساتھ میں ہماری زراعت بھی تباہ کردی گئی۔ انگریز اپنے استعمال کے لیے عوام کی زمینوں پر قبضہ کرتا چلا گیا' اور اس کا اتحادی (سردار) اپنے اغراض کے لیے۔ یہ بے زمین کردہ بلوچ یا تو وہیں اپنے علاقہ میں ''لمپن'' بنا، یا پھر سندھ جاکر وہاں کے زرعی سیکٹر میں پیٹی مزدور بنا اور یا پھر شہروں میں نچلی سطح پر لمپن پرولتاریہ۔ یہ لمپن بلوچ اپنی آل اولاد کو کلرک یا سکول ماسٹر بنا سکا۔

سرداری نظام نے نہ تو اسے زراعت کو ترقی دینے کے اہل چھوڑا اور نہ ہی معیشت کے متحرک ترین شہری سیکٹر میں حصہ دار بننے کے لائق کیا۔ دین بھی تباہ اور دنیا بھی ویران۔ چنانچہ بلوچستان کی زراعت جامد ہوگئی۔ اور شہری اپر مڈل کلاس والے سارے مواقع، غیر بلوچ چھین کر لے گئے۔ سردار صرف اپنی مونچھیں مروڑتے رہنے، اور سیاہ کاریوں کے فیصلے کرتے رہنے کے لیے اپنے علاقے تک محدود رہا۔ اُس کا بیٹا شہر میں افسر نہیں بن سکتا تھا کہ نوکری فیوڈل لوگ کرتے نہیں ہیں۔ وہ صنعتکار بھی نہیں بن سکتا تھا کہ اس میں جس exposure، محنت، مقابلہ اور ذہانت کی ضرورت تھی وہ اس کے پاس نہ تھی۔ وہ تو محض کسانوں اور مویشی بانوں کی زائد پیداوار کی جونک تھا، اسی قبرستان کا مجاور ہی رہا۔ ہماری شہری معیشت پہ غیر بلوچ کی بالادستی صرف اور صرف فیوڈل نظام کا لازمی نتیجہ تھی۔ فیوڈل (سرداری) نظام نے بلوچ معیشت کو مکمل طور پر ساکت و جامد بنائے رکھا۔ بلوچستان کا غیر ترقی یافتہ فیوڈل ازم (سرداری نظام) دوسرے علاقوں کے زیادہ ترقی یافتہ فیوڈلزم اور Enterpreneural معیشت سے شکست کھا چکا تھا۔

سردار کی اپنے نظام کے ساتھ سختی سے جڑے رہنے، اور اپنے نظام کو لوہے کا لباس پہنا کر رکھنے کا ایک اور ہیبت ناک نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا وطن صنعتی نہ بن سکا۔ وہ انفراسٹرکچر ہی بننے نہ دیا گیا جس پر ایک صنعتی سماج کی بنیادیں رکھ دی جاتیں۔ چنانچہ ایک بہت ہی سست اور کاہل زندگانی ہمارا مقدر بن گئی۔

سرداروں کی اس غیر ترقی یافتگی نے ہماری شہری معیشت کو ناقابلِ مدافعت بنادیا۔ اسی نے ہی ہماری دیہاتی معیشت کو چاٹ لیا۔ اس لیے اس بات کو اس طرح دیکھنا چاہیے کہ سرداری فیوڈل نظام نے ہی بلوچوں کو دونوں سیکٹروں میں برباد کیا یعنی دیہاتی بلوچستان میں انہیں کنگال کردیا اور شہری بلوچستان غیر بلوچوں کو تھما دیا۔ کوئٹہ کی مارکیٹ پہ قابض غیر بلوچ طبقہ عیاشی اور بادشاہی اور افسری کرتا رہا اور دیہات کے علاقے اس گیریزن کی بلاواسطہ خدمت کرتے رہے۔ ہم نے اس صورت حال سے نمٹنے کا مضحکہ خیز طریقہ یہ نکالا کہ ہم نے سرداری فیوڈل نظام کو کچھ نہ

کہا اور فیوڈل ہی کی قیادت میں مارکیٹ کے مالک سے پرخلوص لڑائیاں لڑنے کے بعد فیوڈل کی قیادت ہی میں مارکیٹ سے صُلح کرتے رہے۔ اسی آنکھ مچولی میں مارکیٹ ہر کربلا کے بعد ہم پہ ''دوستی'' کا ایک نیا معاہدہ مسلط کرتی رہی۔ ہم ہر بار مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ پر ہی تھرکتے رہے۔

ذرا غور کیجئے کہ فیوڈل ازم مغلیہ دور میں بھی موجود تھا اور اسے اُس بیرونی منظّم قوت نے بھی آکسیجن مہیا کی تھی اور اُسے تحفظ بخشا تھا۔ انگریز نے سب سے بڑی ناروائی یہ کی کہ اس نے سرقبیلوی نظام کو قانونی تحفظ دے دیا۔ اس نے مختلف علاقے فیوڈل سرداروں میں بانٹ دیے۔ اس فیوڈل علاقے کے اندرونی معاملات میں انگریز کوئی مداخلت نہ کرتا تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی اور کو مداخلت کرنے دیتا تھا۔ اس طرح انگریز نے بلوچ عوام کو بارود کے زور سے فیوڈل کی اطاعت پہ مجبور کیے رکھا۔ انگریز نے فیوڈل کو پیداوار پر بھی ٹیکس لینے کا اختیار دے دیا، اس طرح وہ ''بٹائی'' بھی وصول کرتا تھا۔ مویشی پر ٹیکس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

بلوچستان میں شہری معیشت خصوصاً اُس وقت بہت ترقی کر گئی جس وقت سبی کے راستے، سکھر تا کوئٹہ ریلوے لائن مکمل ہوئی۔

10۔ فوج اور ملیشیا بنالی

انگریز نے قبیلوی لیویز اور ملیشیا دستے قائم کر کے اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی انہی کے ذمے کر دی۔ ژوب ملیشیا، چاغی ملیشیا، مکران ملیشیا..... وہ ہم میں سے، ہم پر استعمال کرنے کے لیے ملیشیا بنا تا گیا۔ اور خود طویل سرحدوں پر اپنی فوج جگہ جگہ متعین کرنے کی تکلیف سے بچتا رہا۔ یوں وہ محض اہم جگہوں پر اپنی چھاؤنیاں قائم کر کے حکمرانی کرنے لگا۔ کوئٹہ تو اس کا پاور بیس سٹی تھا ہی۔ وہاں 9 ہزار فوجی بھی موجود تھے جن کے پاس 24 توپیں تھیں۔ اس نے ژوب میں پیادہ فوج کی بریگیڈ، گھڑ سوار دستہ اور توپ خانے کی یونٹیں قائم کیں۔ سبی میں چھاؤنی، مچھ میں، نوشکی میں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ یہ فوجیں اندرونی امن کے لیے بھی متحرک کی جاسکتی تھیں اور ایران، افغانستان اور وسطی ایشیائی خانیوں کے خلاف بھی۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ خیر بخش مری (اول) کو 1896 میں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا، یکم جنوری 1903 کو اُسے نواب بنایا گیا۔ جون 1915 میں وہ سی آئی ای بھی بن گیا۔ مگر اِن ساری مہربانیوں نے آزادی کے اس متوالے کو اپنے راستے سے نہ روکا اور وہ اپنے مشیر خاص وزیر سومرانڑیں کے ساتھ ہر وقت آزادی کے لیے سوچتا اور تدبیریں کرتا رہتا۔

انگریز کے خلاف بلوچ خانہ بدوش قبیلوں اور کسانوں کی بغاوتیں 1901 تک بعد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں۔ انگریز اور حتیٰ کہ بعد میں ساری حکومتیں بلوچوں پر حملوں اور جنگوں کے مسلط کرنے کا جواز یہ پیش کرتی رہیں کہ یہ بہت جاہل، اَن پڑھ اور پسماندہ لوگ ہیں اور وہ خود گویا ترقی، امن، انصاف کے علمبردار ہیں۔ مضحکہ یہ کہ اِن کے تمام حملوں اور جنگوں تباہیوں کے باوجود، آج تک بلوچ کو نہ تو ترقی نصیب ہوئی، اور نہ ترقی کے نام پر اُسے گولی سے نجات میسر آئی۔ انگریزوں کے اخبار کا یہ فقرہ پڑھیں اور پھر راجہ احمد خان کی سرکار کے بیانات پڑھیں، آپ حیران رہ جائیں گے کہ صدیوں کے فرق کے باوجود تمام غاصب و قبضہ گر یکساں فقرے استعمال کرتے ہیں: ''یہاں لوگوں کی زندگی کے حالات بہتر ہوئے جہاں لوگ پہلے خانہ بدوش اور بدّو کی سی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے''۔ (ارے بابا جس وقت ہم خانہ بدوش تھے، انگریز بھائی صاحب، آپ خود سمندری قزاق تھے، لٹیرے تھے!!)۔ انگریز صحافیوں نے نہ تو یہ لکھا کہ اُن کی قوم ہم خانہ بدوشوں کی مویشی اور زمین پر ناروا ٹیکس لیتی ہے، نہ انہوں نے فیوڈل مظالم کا تذکرہ کیا اور نہ ہی اجارے والی زمینوں سے غلامانہ شرائط کی بات کی۔

انگریز نے بلوچستان میں مجموعی طور پر بڑی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ گو کہ اس نے، ادارے کے بطور سرقبیلوی نظام کو مضبوط کیا، مگر ساتھ ساتھ بائی پراڈکٹ کے بطور غیر محسوس انداز میں سماجی معاشی حالات میں بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔

انگریز نے چاغی، بولان اور کوئٹہ، خان کلات سے لیز پر لے لیے۔ اسی طرح ژوب اور لورالائی کا کچھ حصہ انگریز کے ہاتھ آیا۔ پھر، کوہلو اور بارکھان رضا کارانہ طور پر برطانوی

حفاظت میں آئے(17)۔

11 ٹیکس

1887 میں انگریزوں نے اپنے قبضے کے علاقے میں فصل پر جا کر تخمینہ لگا کر ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔ بعد میں وہ مغل حکمرانوں کی طرف سے لاگو ٹیکس نظام پر چلے جو کہ عموماً فصل کا چھٹا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے زیرِ تسلط بلوچستان میں انگریز خود ٹیکس جمع کرتے تھے مگر ایجنسی کے علاقوں میں انہوں نے قبائلی سرداروں کو یہ اختیار دے رکھا تھا۔ یہ سردار اپنے ذیلی فرقوں اور طائفوں کے بڑوں کو یہ ذمہ سونپ دیتے تھے(18)۔

ٹیکس کے نظام کی ترقی کے لیے 1908 کی ایک تحریر یوں بتاتی ہے: ''موجودہ طریقوں کو بنیاد بنا کر بہتر نظام متعارف کرایا گیا ہے۔ لینڈ ریونیو کے موجودہ طریقے یہ ہیں:

1۔ سالوں کے ایک دورانیہ کے لیے نقد تخمینہ (جمع بست)

2۔ عارضی نقد تخمینے (اجارہ)

3۔ پیداوار کی تقسیم (بٹائی)

4۔ کھڑی فصلوں کا تخمینہ (تشخیص، دانہ بندی)

5۔ فصلات کے حصے کی پیائش کے بعد حکومتی حصے کی نقد تشخیص (تشخیصِ نقدی)۔

نمبر شمار 4 اور 5 کی حالتوں میں حکومت کا حصہ آٹھویں سے تہائی تک تھا۔ ان تمام آبادیوں میں جن کا نظامِ آبپاشی انگریزوں نے بنایا تھا، فصل کی تہائی لی جاتی تھی۔ 1887 میں ایجنسی کے علاقوں کے لیے ٹیکس جمع کرنے کو ایک جیسا کیا گیا۔ ٹیکس کی شرح چھٹا حصہ مقرر کیا گیا(31)۔

انگریز نے ٹیکس، دوروں اور دیگر امور کی آسانی کے لیے ڈاک بنگلے، انسپکشن بنگلے، اور سرکٹ ہاؤس بنائے۔

12۔ مردم شماری

مشرق میں یہ بالکل ایک نئی بات تھی۔ آدمیوں کو گننا۔ اس سلسلے میں ایک مردم شماری 1931 میں ہوئی۔ انگریز نے مردم شماری، مویشی شماری وغیرہ رائج کیے۔

13۔ اوزان و پیائش

انگریز نے اس سلسلے میں اوزان و پیائش کے سائنسی نظام متعارف کرائے۔

14۔ کیلنڈر

گریگورین کیلنڈر جاری کر دیا۔

15۔ انگلش زبان

انگلش لینگویج کو اپنا دفتری زبان بنا دیا۔

16۔ ایڈمنسٹریشن

انگریز نے خان، سردار اور وڈیرہ کی روایتی انتظامی زنجیر کے متبادل اپنا ایڈمنسٹریٹو سیٹ اپ قائم کیا۔ اے جی جی سے لے کر تحصیلدار تک کا نیا ڈھانچہ روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ حتی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ سردار، جام، نواب، اور پھر خود خانِ کلات اِس انتظامیہ کے نچلے ترین کڑی کے محتاج اور ماتحت بن گئے۔ بالخصوص پولٹیکل ایجنٹ وسیع اختیارات کا مالک ہوا کرتا تھا۔

انگریز کے چلے جانے کے بعد بھی وہی انتظامی ڈھانچہ برقرار رہا۔ معمولی ترین تبدیلیاں تک نہ ہوئیں۔

17۔سب سے بڑی تبدیلی.....غلامی کا خاتمہ

ایک صفتی تبدیلی، ایک بہت بڑی تبدیلی غلامی کا خاتمہ تھی۔ بالخصوص مشرقی بلوچستان میں۔نواب محراب خان بگٹی اور نواب مہراللہ خان مری نے اپنے اپنے قبائل کے صلاح مشورے کے بعد ایک آفاقی اعلان جاری کیا جس کی رو سے غلاموں کی خرید وفروخت ممنوع قرار دی گئی(19)۔

واضح رہے کہ غلام داری، بلوچستان کے طول وعرض میں موجود تھی۔مثلاً 1911 میں برطانوی اعداد وشمار کے مطابق کلات میں سترہ ہزار آٹھ سو غلام تھے جن میں 9300 عورتیں تھیں۔ مرد غلام اپنے آقاؤں کی زمینیں کاشت کرتے تھے اور عورت غلام' گھریلو کام کرتی تھیں۔1926 میں جھالاوان اور مری بگٹی قبائلی علاقے میں غلام، پوری آبادی کا 4 فیصد تک تشکیل کرتے تھے، جبکہ مکران میں چھ فیصد اور خاران میں کل آبادی کا پندرہ فیصد غلام تھے(20)۔

مکران میں مقامی گچکی اشرافیہ خاندان شادیوں میں غلام اور کنیزیں بھی جہیز میں دیتے لیتے تھے۔

کلات میں مرد غلاموں سے زرعی کام لیا جاتا تھا۔غلاموں کو رہن رکھا جاسکتا تھا، اور اگر قرض ناقابلِ واپسی ہوجاتا تو رہن کنندہ شخص ان رہن شدہ غلاموں پر مستقل قبضہ کرسکتا تھا، یا انہیں فروخت کرسکتا تھا۔ اگر کوئی غلام جائیداد بنا پاتا بھی تو وہ اُسے اپنی اولاد کو منتقل نہیں کرسکتا تھا۔اُس کی موت پر یہ اُس کے مالک کو چلا جاتا(21)۔محض چند وہ غلام جو کسی امیر خاندان کے غلام ہوتے جائیداد حاصل کرسکتے تھے،عموماً اُس کی بڑی جائیداد کی دیکھ بھال کے نتیجے میں۔ چارلس میسن نے لکھا (1843:442) کہ خان کے موروثی غلاموں (خانہ زاد: یعنی مالک کے گھر میں پیدا ہوئے غلام) سے کچھ کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا اور خان کی زمینوں کے انتظام کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

سنڈیمن نے 1884 کو ایک کیس کے بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا:'' گھریلو غلامی دیگر مشرقی ممالک کی طرح بلوچستان میں بھی ایک قدیم ادارہ ہے۔اور زمین کا بڑا حصہ انہی غلام مزدوروں کے ذریعے کاشت ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ'' غلامی'' کے ساتھ بہت سے جڑے ہوئے تصورات، جو کہ مہذب دماغوں کے لیے نفرت انگریز ہیں، بلوچ قبائل کے طور طریقوں سے غائب ہیں۔آزاد ہونے سے قبل غلاموں کی حالت روس میں زرعی غلاموں (سرف) کے قریب ہے۔وہ اُن والدین کے بچے ہوتے ہیں جو خود اِسی زندگی میں جی رہے ہوتے ہیں۔ اُن سے (عموماً) مہربان برتاؤ کیا جاتا ہے اور اُن سے مالک کے اپنے خاندان کے افراد کی طرح کا سلوک ہوتا ہے۔ان کا افریقی غلاموں کی تجارت سے کوئی واسطہ نہیں، نہ ہی ان کا تعلق اِن حالیہ دنوں میں غلاموں کو سرحدی لڑائیوں کے دوران پکڑے گئے قیدیوں کو غلام بنانے سے ہے۔ مجھے غلامی کی اِس تبدیل شدہ شکل کے دفاع کی ضرورت نہیں۔ میں صرف کسی بھی غلط تاثر کو دور کرنا چاہتا ہوں جو اس لفظ کے استعمال سے پیدا ہوسکتی ہو۔اس طرح کے نظام کو، جسے صدیوں کی منظوری حاصل ہے،ایک دن میں،گڑبڑ کرنے والے نتائج کے بغیر،ختم نہیں کیا جاسکتا''۔(22)۔

سنڈیمن بڑا مکروہ اور ظالم اور شیطانی ذہانت کا حکمران تھا۔اُس نے اِس نظام کو محض جوں کا توں ہی نہیں رکھا بلکہ اسے مزید مضبوط بنایا۔اُس نے 1878 میں مری قبیلے کو ایک سند جاری کی جس میں انہیں غلام رکھنے کے حق کی یقین دہانی کردی(23)۔انگریز غلامی کے ادارے کو چھیڑنا تو کیا، اُسے پردے میں رکھتا تھا۔سنڈیمن کے بعد آنے والے اے۔جی۔جی' مسٹر برنس نے تو یہاں تک لکھا''.....ہم اس پوچھ گچھ کی خواہش نہیں رکھتے کہ آیا اُن کے پاس غلام ہیں کہ نہیں۔قانون ہمیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا''۔(24)۔

''ریاست کلات اور اس کے زیرِ اثر علاقوں میں غلام داری کا معاملہ ایک نازک معاملہ ہے۔حکومت اس سے قبل از وقت نمٹنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو رندوں کے ساتھ کوئی ایسا وعدہ نہیں کرنا چاہیے جس سے یہ مطلب لیا جاسکے کہ انہیں غلام رکھنے کا حق ہے۔لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ پی اے انہیں واضح نہ کرے کہ اگر وہ اپنے غلاموں سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تو اُن کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔اس لیے کہ ایسی زبان سے رند ممکنہ طور پر ہماری طرف سے غلامی کے ادارے کو جائز تسلیم کرنا سمجھیں گے''۔(25)۔

البتہ پولیٹیکل ایجنٹ اُن غلاموں کو واپس نہیں کرتے تھے جو سرداری علاقوں سے بھاگ کر سندھ یا برٹش بلوچستان میں پناہ لیتے تھے۔اس وجہ سے سرداروں اور انگریز افسروں کے بیچ ایک مستقل اختلاف رہتا تھا۔1898 میں سرداروں نے ایک عورت غلام کو واپس کرنے کی درخواست میں یہ دلیل دی کہ 1877 کے مستنگ معاہدے میں طے کیا گیا تھا کہ برطانیہ غلامی میں مداخلت نہیں کرے گا۔حالانکہ اُس معاہدے میں غلامی کی بات نہیں کی گئی تھی صرف روایات کی بات کی گئی تھی۔اس لیے یہ درخواست مسترد کردی گئی۔مگر، ویسے وہ غلامی میں مداخلت نہ کرتے تھے۔1914 میں اے جی جی نے تو اپنی حکومت کو غلاموں کی آزادی کے خلاف مشورہ دیا تھا اس لیے کہ:

''ایسا قدم ملک کی معاشی زندگی کی چولیں ہلا دے گا.....''(26)۔

غلام لڑکیاں تحفے یا فروخت کے ذریعے گردش میں رہتی تھیں اور اُن کے جنسی حقوق نئے مالکوں کی ملکیت ہوتے تھے۔اسی بات سے سمجھ میں آتا ہے کہ عورت غلام کی قیمتیں مسلسل بڑھتی کیوں جارہی تھیں۔(27)۔1920 کی دہائی میں ایک مکرانی نے ایک عورت کی ''آدھی ٹانگ'' پچاس روپے میں خریدی اور ایک سال بعد ایک پوری ٹانگ 50 روپے میں خریدی(28)۔1926 میں لیگ آف نیشنز عالمی طور پر غلامی کے خاتمے کی تجویز دے کر غلامی کو منظرِ عام پر لائی۔اِسی سال اے جی جی کے مضبوط دباؤ سے مجبور ہوکر خان نے کلات میں غلامی کے خاتمے کے فرمان پر دستخط کردیے۔زراعت میں لگے مرد غلام فصل کا حصہ دار بنے اور گھریلو غلام عورتیں گھریلو بامعاوضہ ملازمائیں بنیں۔کوئی خاص مزاحمت نہ ہوئی۔

18۔ادب میں تبدیلیاں

انگریز سامراج ایک نئی حقیقت بن کر بلوچستان میں نمودار ہوا۔بلوچ اس کے خلاف سینہ سپر ہوا، جسمانی طور پر بھی، مالی طور پر بھی، اور دانش کے حوالے سے بھی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی بحیثیتِ مجموعی بلوچوں کے جاگنے، جمع ہونے، منظّم ہونے اور جدوجہد کرنے کی صدی رہی ہے۔

بلوچستان پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد بلوچی شاعری اور نثر دونوں نے کافی ترقی کی۔نثر کے میدان میں لیچ، ڈیمز، میئر، ہیوز اور لالہ ہیتو رام نے بہت بنیادی کام کیا۔ بلوچوں میں شعر ونثر کے اندر مکتبِ درخانی (ملا حضور بخش جتوئی اور ملّا فاضل درخانی) اور کمالان گچکی کے ناقابلِ ذکر ہیں۔

جوں جوں انگریز اپنے قدم مضبوط کرتا چلا گیا، وہ بلوچستان میں اپنی ضرورت کی صنعت لگاتا چلا گیا۔ریل، ٹیلیگراف، سڑک، بجلی.....اب ہمارا بھیڑ پال اور کھیتی باڑی والا ادبی سرمایہ اس صنعتی معیشت کے عہد کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔لہٰذا اس میں لسانی اضافہ ناگزیر تھا۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ اب بہت سی دیگر قوموں سے ہمارا واسطہ پڑا۔اس لیے کہ انگریز اکیلا یہاں نہ آیا، وہ تو یوپی، سی پی والے، پنجابی اور گورکھے ساتھ لایا۔اور پھر اُس کے خلاف اکیلے ہم ہی نہیں لڑ رہے تھے بلکہ افغان، ایران اور دوسری پڑوسی قومیں بھی سامراج دشمنی کررہی تھیں۔لہٰذا شعوری اور غیر شعوری دونوں لحاظ سے اپنی نجی اور سماجی تقاضوں کے تحت الفاظ،

استعاروں، محاوروں، اور ضرب الامثال کا لین دین تیز رفتاری سے ہونے لگا۔

انگریزی تسلط کے زمانے میں ہماری شاعری ایک نیا رنگ اختیار کر گئی۔ یہ اپنا جنگی، فطری، رومانی اور اخلاقی رنگ برقرار رکھتے ہوئے سیاسی شکل اختیار کرتی گئی۔

انگریزی دور جو کہ پیہم جنگوں کا دور تھا۔ گل زمین پر مرمٹنے کا دور تھا۔ اور جس طرح یہ بہادروں کا دور تھا، اسی طرح یہ بزدلوں، بھگوڑوں اور Collaborators کا دور بھی تھا۔ بلوچوں پر انگریز حاکمیت کے اِس اسی سالہ دور میں شاعروں نے نہ صرف خود عوام کے ساتھ شانہ بشانہ رہ کر جنگ کی بلکہ ہر بہادر کی توصیف کی، اور بزدل پر پھٹکار بھیجی۔ وہ ان کی فتح وشکست میں برابر کے حصہ دار رہے۔ بلوچ شاعر جنگ کی معاشی بنیادی وجوہات کے بارے میں بالخصوص آگاہ رہے۔ پھر قبضہ کے بعد ٹیکس، محصول اور بٹائی جیسی ناروائیاں رہیں۔ اسی طرح بلوچ دانشور انگریز حاکمیت کے طور طریقوں سے بھی مکمل طور عوام کو باشعور کرتے رہے۔ حاکم کی ٹھگی، تشدد، بے قولی، انعام واکرام کی لالچ، اور ضمیر کی خرید وفروخت کے بارے میں آگاہی عام کرتے رہے۔ اسی طرح بالخصوص رحم علی کی شاعری میں ہمیں اپنے سماج کے اندرونی طبقاتی تضادات کی تفصیل ملتی ہے۔ امیر اور غریب دو طبقات ہیں۔ امیر طبقہ انگریز کے ہاتھوں بکا ہوا طبقہ ہے جب کہ غریب اپنے وطن کے لیے جان کی بازی لگانے پہ ہمہ وقت تیار ہے۔

ملک دینار، گدّ و اور رحم علی مری ابھر کر سامنے آئے۔ انہوں نے نہ صرف سامراج کی حقیقت بیان کی بلکہ سامراج دشمنی کی تبلیغ بھی کی۔ نیز بڑے پُر اثر انداز میں سامراج دشمن جنگ کی رپورٹنگ کی۔

انگریز کے دور میں ایک اور بڑے انسان کا ذکر آتا ہے، جسے ہم ملاّ مزار بنگلزئی کے نام سے جانتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت شاعری تھی اُس کی۔ مشرقی بلوچی کی ایسی رواں شاعری کہ سن کر انسان جھوم جائے۔ اس کا مشہور ترین شیئر ''لاٹ ئے بگھی'' ہے۔

ہوا یوں کہ دسمبر 1911ء میں شاہ برطانیہ کی تاج پوشی کے سلسلے میں دہلی میں دربار منعقد کیا گیا۔ اُس میں برصغیر کے تمام والیانِ ریاست کو اظہارِ وفاداری کے لیے شرفِ باریابی عطا ہوئی۔ بلوچستان سے ریاست کلات کے والی خان محمود خان نے اس میں شرکت کی۔

شاہی دربار کے اجلاس کے موقع پر میر محمود خان نے خلافِ معمول انتہائی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ایسی بہادری اور بلوچیت کہ سر فخر سے اونچا ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اُسے اس طرح مسخرہ مشہور کر دیا کہ اُس کے کبھی کبھار کے بہادر بلوچی کارنامے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔

متعدد بار کی ریہرسل اور تربیت کے باوجود اُس نے درباری آداب کو روند ڈالا۔ وہاں مقررہ آداب کی رُو سے دربار ہال میں جوتوں سمیت بیٹھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ چنانچہ برصغیر کے تمام والیانِ ریاست نے اس پر عمل کیا۔ لیکن میر محمود خان جوتوں سمیت دربار ہال میں اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ صوبے کے ایجنٹ گورنر جنرل اور ریاست کے ریذیڈنٹ کو طوعاً و کرہاً اس کے جوتے بذاتِ خود سنبھالنے پڑے۔ اسی طرح شاہ برطانیہ سے اظہارِ وفاداری کے موقع پر تمام ریاستی حکمران حسبِ آداب اپنی تلوار دونوں ہاتھوں پر رکھ کر جھکتے ہوئے کورنش بجالاتے اور اُلٹے قدموں واپس ہوتے۔ مگر محمود خان نے ڈائس کے سامنے پہنچ کر تلوار کو میان سے نکالا، ہوا میں لہرایا، پھر میان میں ڈالا اور پیٹھ پھیر کر واپس اپنی نشست کی طرف مراجعت کی۔ اندھی بہادری آپ کس کو کہتے ہیں!!۔

ظاہر ہے کہ، میر مُحمود خان کی اس گستاخی کو انگریز نے بہت سنجیدہ لیا اور اس کی ذمہ داری متعلقہ ریذیڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل آرچر اور ریاستِ کلات میں سرکاری وزیر اعظم قاضی جلال الدین پر عائد کی گئی۔ چنانچہ چند ماہ میں لیفٹیننٹ کرنل آرچر کا بلوچستان سے تبادلہ کیا گیا، اسی طرح قاضی جلال الدین کو ریاستِ کلات کی وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوش کر کے میر شمس شاہ کو یہ منصب سونپا گیا جس نے بعد میں انگریزوں کا حقِ نمک بطریقِ احسن ادا کرنا تھا اور صلے میں بڑے سے بڑے خطابات پانے تھے۔۔۔۔ اور ہماری تباہی کر دینی تھی۔

اسی دربار کے موقع پر صحافیوں سے متعلق وہ دلچسپ لطیفہ بھی وجود میں آیا، جو آج تک

زبان زدِ عام ہے۔کبھی کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ پاکستانی ٹی وی چینلز دیکھ کر لگتا ہے کہ خان ٹھیک کہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ چند صحافی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے تحت مختلف والیانِ ریاست سے انٹرویو کرتے ہوئے جب میر محمود خان کی قیامگاہ پر پہنچے اور ملاقات کی اجازت چاہی، تو خان صاحب نے اپنے وزیراعظم سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ ۔وزیراعظم نے اُسے بتایا کہ یہ بڑے بڑے اخبارات کے نمائندے ہیں۔آپ سے ملاقات کا حال اپنے اخبارات میں شائع کریں گے۔جس سے آپ کی شہرت ہوگی۔اس وضاحت پر خان نے بڑے اعتماد اور سکون سے فرمایا:''خوب،خوب! فہمیدم۔درمُلکِ ما اینہا را لوڑی میگویند''۔(اچھا،اچھا!! میں سمجھ گیا۔ہمارے ملک میں ان لوگوں کو لوڑی یعنی مراثی کہتے ہیں)۔

بہرحال ایجنٹ ٹو گورنر جنرل' خان سے دہلی میں تو اپنی توہین اور شاہی دربار کی آداب شکنی کا بدلہ نہ لے سکا اور نہ ہی اُسے اتنی مہلت مل سکی۔البتہ بلوچستان پہنچ کر اس کا بدلہ اس نے بلوچ قوم سے فوری طور پر لے لیا۔ہوا یوں کہ سبی کا سالانہ دربار گزر چکا تھا۔اور دربار میں حاضر ہونے والے تمام سردار اپنے اپنے علاقوں کو جا چکے تھے۔ذرائع مواصلات کے فقدان کے باعث دور دراز علاقوں میں بسنے والے سرداروں کا مختصر سے عرصہ میں واپس سبی پہنچنا ممکن نہیں تھا اس لیے صرف ضلع سبی اور سراوان کے اُن بلوچ سرداروں کو فوراً حاضر ہونے کا حکم صادر ہوا جو ابھی تک کچھی میں واقع اپنی جاگیروں پر موجود تھے۔چنانچہ یہ تمام سردار مقررہ تاریخ پر حاضر ہوئے جنہیں ایجنٹ ٹو گورنر جنرل، جسے عوامی اصطلاح میں''لاٹ صاحب'' کہا جاتا ہے، نے حکم دیا کہ میں اور میری میم صاحبہ ریزیڈنسی سے ریلوے سٹیشن تک بگھی پہ جائیں گے۔اور ہماری بگھی گھوڑے نہیں بلکہ تم سردار لوگ کھینچ کر وہاں تک لے جاؤ گے۔اس نے سرداروں کو بگھی میں جوت لیا جو باری باری بگھی کو کھینچتے ہوئے اُسے سبی ریزیڈنسی سے ریلوے اسٹیشن تک لے گئے۔(ہم بلوچ مورخ و محقق اِس واقعہ کو نہیں چُھپاتے، اس لیے کہ یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔مگر بلوچ قوم کے مخالف دراندار، بدنیت اور زور آور لوگ اِسے طعنے کے طور پر استعمال کرتے ہیں)۔ان سرداروں میں سے صرف مری قبیلے کے سردار نواب خیر بخش خان (اوّل) نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ذلت آمیز حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔

اس موقعہ پر بنگلزئی قبیلے کا حساس اور غیرت مند شاعر ملاّ مزار وہاں موجود تھا۔وہ اپنے قبائلی سرداروں کی بے حمیتی پر جل بُھن اٹھا۔اس نے اپنے احساسات کو بیک وقت چار زبانوں میں منظوم کیا۔یہ نظم مختصر سے عرصے میں اِس قدر مقبول ہوئی کہ اُسے ہر محفل میں گویوں کی زبانی سننے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔بلوچ عوام الناس کی سامراج دشمنی نے اپنے اِس شاعر کو آج تک فراموش ہونے نہ دیا۔

جب سردار صاحبان کو اس نظم کی مقبولیت کا علم ہوا تو وہ اس پر بہت سٹپٹائے اور انہوں نے نظم کے مصنف کے خلاف لاٹ صاحب سے جا کر شکایت کی۔جس پر بلوچستان کی حکومت نے اس شیئر کے شاعر کو زندگی بھر کے لیے صوبہ بدر کر دیا۔چنانچہ بلوچستان کا یہ غیرتمند سپوت جیکب آباد چلا گیا۔وہیں مرا، اور وہیں سپرد خاک ہوا۔سرداروں نے انگریز لاٹ کی بگھی میں جُتنے کو تو بطور اعزاز قبول کیا اور اپنے اس غلامانہ کرتوت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھا لیکن اس کے اظہار کو اپنی توہین پر محمول کر کے بے چارے شاعر کو اپنی رعونت کا نشانہ بنایا۔اس لیے کہ وہ نہ تو انگریزوں کا حامی تھا اور نہ ہی سرداروں کے غلامانہ کردار کا مدّاح۔بہرحال مُلاّ مزار اپنی نظم کی بدولت آج بھی زندہ ہے اور تاابد زندہ رہے گا۔

مکتبِ درخانی انگریزوں کے اسی دور میں وجود میں آیا۔یہ دراصل تخلیق وتحریر اور اشاعت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا جو دین کے جذبے سے سرشار مولویوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔اس میں حضور بخش جتوئی (کچھی)، نبو جان قلندرانڑیں (مستنگ)، ملاّ مزار شاہوانڑیں (کوئٹہ)، ملاّ زیرک، قاضی لال محمد نورزئی، ملک کلات نصیری، ملا امان اللہ، ملا ایاز مفتی عبداللہ، میرزا احسن خان، بھاول خان قمبرانڑیں، ملا صاحب جان قمبرانڑیں، ملا عبدالعزیز، ملا خان محمد، حاجی عبدالمجید چوتوئی، حاجی عبداللہ جان درخانی اور ملا عبدالحئ شامل تھے۔

ملاّ حضور بخش نے قرآن شریف کا نہایت اچھی بلوچی میں ترجمہ کیا۔ اس ادارے نے بلوچی براہوئی، فارسی، عربی، سندھی اور اردو میں دوسو سے زیادہ کتابیں چھاپیں۔

ریفرنسز

1۔ ہتورام۔ تاریخ بلوچستان۔ 2018۔ علم وادب پبلشرز۔ کراچی۔ صفحہ نمبر 347
2۔ جمالدینی، عبداللہ جان ''شاہی جرگہ اور سالانہ دربار'' 1970ء ہفت روزہ لیل ونہار۔ 26 اکتوبر تا یکم نومبر، صفحہ 23
3۔ انجم وکیل، ''سیاست کے فرعون'' لاہور، صفحہ۔۔۔۔
4۔ بگٹی، عزیز محمد ''بلوچستان، سیاسی کلچر اور قبائلی نظام''، فکشن ہاؤس لاہور، صفحہ 52
5۔ پیہرسن، ''سوشل آرگنائزیشن۔۔۔۔'' صفحہ 67
6۔ آغا گل، ''دوسری بابری مسجد'' طلوع افکار، 9۔ کراچی۔ صفحہ 59۔
7۔ شُلز، فریڈ۔ Nomadism & Colonialism۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ 2002 صفحہ 110
8۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 115
9۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 117
10۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 118
11۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 121
12۔ پیکولین، بلوچ، صفحہ 147
13۔ سی گزیٹیئر، صفحہ 228
14۔ ایڈمنسٹریٹور پورٹ۔ 1886۔ صفحہ 217۔
15۔ لیغاری۔ حصہ دوئم۔ صفحہ 162
16۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 102
17۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 105
18- بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005۔ کلات پبلشرز۔ صفحہ 47
19۔ نائنا سوائڈلر On the Difficulty of Telling a Slave from a wife۔ کارینا جہانی کی ایڈیٹری میں چھپنے والی کتاب The Baloch & their Neighbours-Reichart verlag- wiesbaden" 2003۔ صفحہ 345
20۔ نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 346
21- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 347
22- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 347
23۔ نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 347
24- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 348
25- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 350
26- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 354
27- نائنا سوائڈلر۔ ایضاً۔ صفحہ 355
31۔ شُلز، فریڈ۔ ایضاً۔ صفحہ 196

چیپٹر پنج

انقلابِ روس اور بلوچ

بلوچستان انگریز کے خلاف اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھا۔تحریکیں صرف داخلی تضادات پہ نظر نہیں رکھتیں۔ بلکہ تحریکیں اپنے آس پاس کو بھی ہشیاری سے مشاہدہ کرتی ہیں۔تحریکیں دوسری جگہوں بالخصوص اڑوس پڑوس میں اپنے جیسی تحریکوں، تنظیموں اور نظریات کی تلاش میں رہتی ہیں۔اور اگر کوئی ملے تو اُس سے خوب لین دین کرتی ہیں۔خود کو وہاں سے قوی تر بناتی ہیں اور وہاں کی موومنٹ کی کمزوریاں دور کرنے میں خوب مدد کرتی ہیں۔

ہمارے شمال میں موجود افغانستان بھی انگریز کے خلاف اپنی آزادی کے دفاع کے اقدامات کر رہا تھا۔اُس کے ساتھ ہی شمال میں ایک اور بڑے ملک روس کے اندر کسانوں اور مزدوروں کی ایک بہت بڑی انقلابی تحریک سو سال سے جاری تھی۔

1905 میں روس میں انقلاب لانے کی ایک بہت بڑی کوشش ہوئی۔.....مگر انسانی سماج کو بہت سے تجربات دے کر یہ بہت بڑی کوشش اور بڑا انقلاب ناکام ہوا۔لیکن یہ ناکام انقلاب بھی وہاں پہ موجود فاتح بادشاہی نظام کو بہت کمزور بنا گیا۔ بادشاہت کی چولیں ہل گئیں۔اُسے عوام کی طاقت اندازہ پہلی بار بھرپور طور پر ہوا۔چنانچہ بادشاہ نے عوام کو رعایتیں دینی شروع کر دیں۔نقلی اور طفل تسلی والی ایک پارلیمنٹ بنادی۔اور بھی بہت سی رعایتیں دیں۔مگر ، بھلا نیم دلانہ رعایتیں کبھی بپھرے عوام کو شانت کر سکی ہیں؟۔بادشاہ کی حکومت کا ''مرکزی میھ اور کلّا'' بہرحال ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

روسی عوام اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ بڑی نشیب وفراز، اور بہت بڑی کُشت خون کے بعد بالآخر بادشاہ بھاگ گیا اور 1917 کے آخر میں وہاں لینن کی قیادت میں سوشلسٹ انقلاب آ گیا۔روسی عوام کی تحریک امپیریلزم یعنی سامراجیت کے خلاف تھی۔اس کی کامیابی دنیا بھر میں محکوم قوموں کی آزادی کے مترادف تھی۔ دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں کی زبردست حمایت نئی حکومت کا بہت بڑا مقصد بن کر سامنے آ گئی تھی۔ اُس زمانے میں بلوچ برطانیہ کے خلاف اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔اُنہیں روسی انقلابی حکومت کی حمایت بہت پسند آئی۔اس لیے جغرافیائی دوری کے باوجود بلوچ اُس ملک اور اُس انقلاب سے بہت متاثر رہے۔خیالات، اور نظریات کی طرح خبریں بھی فاصلوں کو نہیں دیکھتیں۔ بالخصوص عوامی جدوجہد کی خبریں ایک حیران کن تیزی کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ بادشاہت اور ملکوں پر قبضہ گیری کے خلاف روسی محنت کش عوام کی اس بہت بڑی کوشش اور بالآخر فتح نے پوری دنیا پر زبردست اثرات ڈالے۔مگر مشرقی اقوام کو تو بالخصوص اُس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔عوامی رائے اور رضا کے آگے صدیوں سے پڑا بند ٹوٹ گیا تھا۔عوام الناس گھٹن اور پابندیوں کی فصیلیں توڑ کر استحصالیوں پہ ٹوٹ پڑے۔صرف روس میں ہی نہیں بلکہ اُس کی سرحدوں سے ہزاروں میل دور ہر جگہ اور ہر

ملک میں بادشاہوں، آقاؤں اور سامراجیوں کے خلاف بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔

1917 کے روسی انقلاب کی فتح مندی کے اسباق نے بلوچوں کو بہت متاثر کیا۔ نیز خود اپنی اندرونی ضرورت کے تحت بلوچستان میں تحریک آزادی کے اندر مڈل اور لوئر کلاسز کے شہری پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہوتے گئے۔

ہر چند کہ (فکری اور ٹیکٹیکل دونوں لحاظ سے) علیحدہ علیحدہ علاقوں اور قبائل کی اپنی اپنی قیادت میں سامراج دشمن جدوجہد چل رہی تھی مگر اُس کے اثرات تو مجموعی تھے، اور وہ من حیث القوم بلوچ قومی آزادی کی جدوجہد پہ پڑے۔

شاشان و تمبیل و سلیمان پہاڑوں سے الگ الگ کردہ، بحر و بر میں بٹے ہوئے ایک بہت بڑے بلوچستان میں ڈیڑھ دو صدی قبل کسی مشترک کمان کی واحد قومی فوج کا تصور کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا ہم مسلح جدوجہد کو اُسی جغرافیائی انداز میں پیش کریں گے جس میں کہ یہ لڑی گئی تھی۔

1۔ سرحد (نوشکی، زاہدان) اور جہلاوان کا محاذ

1907 میں ایرانی بلوچستان میں میر بہرام خان بارانزئی کی قیادت میں بلوچوں نے ایرانی حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ انہوں نے بمپور اور فارج میں ایرانی فوجی گیریزنوں کا صفایا کردیا، حکومتی افواج کو منتشر کردیا اور کچھ سال تک بلوچستان کو چلایا۔ مگر بعد میں ایرانی افواج نے بلوچوں کو شکست دی اور بمپور پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ بہرام خان اپنے حامیوں کے ایک حصے کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہوا۔

یہ صرف واحد مظہر نہ تھا بلکہ دراصل قاچار کی استبدادی حکومت کے خلاف یہاں دو بڑی بغاوتیں حسین خان ناروئی اور بہرام خان بارانزئی کی قیادت میں ابھری تھیں۔ مگر بلوچ عوامی تحریک کے رہبر خود فیوڈل تھے اور ان کی بغاوت کا ہدف بھی یہ تھا کہ حکومت انہیں اقتدار میں شریک کرے۔ جبکہ بلوچ کسانوں اور خانہ بدوشوں نے اُن کی حمایت اس لیے کی کہ یہ فیوڈل اُن کے لیے قاچاری حکومت کے ظالم اہلکاروں سے بہتر تھے۔ اس لیے کہ اُن کے اپنے فیوڈلوں کی لوٹ مار اِس قدر ظالمانہ نہ تھی جتنی کہ قاچاری حکومت کی تھی۔ قاچاری کارندے تو مالیہ نہ دینے کی صورت میں غریب کسانوں کی عورتیں تک لے جاتے۔۔۔۔ ''مالیہ نہ دینے کے عوض 300 لڑکیاں حاکم لے گیا اور انہیں ترکمنوں پر فروخت کردیا''۔(1)۔

یہ بات درست ہے کہ یہ بغاوتیں عمومی طور پر کسی قسم کے نتائج کا حامل نہ بنیں بلکہ یہ عام بلوچوں کے لیے ایک خواری سے دوسری خواری کا اضافہ کرتی تھیں۔(2) مگر اِس کے باوجود انسان اپنی آزادی آبادی کے لیے لڑتے ہیں، لڑتے رہے ہیں۔ کامیابی ناکامی کی پرواہ کون کرتا ہے؟۔۔ جُہدِ آزادی میں ''اگر مگر'' کہاں چلتا ہے؟۔

***

پہلی عالمی جنگ (1914) کے اوائل کے زمانے میں بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی طرح، جہلاوان سے بھی انگریز کے خلاف ایک زوردار تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک سردار نور الدین مینگل کی زیر قیادت تھی۔

1889 میں شکر خان کے ہاں پیدا ہونے والا نور الدین مینگل 24 سال کی عمر میں سردار بنا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تین چار سال علی گڑھ میں زیر تعلیم بھی رہا۔ وہ فارسی، سندھی، براہوئی، بلوچی اور اردو زبانیں بولتا تھا۔ سامراجی استبداد کے خلاف تحریک میں وہ کئی بار پُرخطر راستوں سے ہوتے ہوئے ایران سے اسلحہ لینے کے لیے جاتا رہا۔ اس کے ساتھیوں میں سردار شہباز خان گرگناڑی، میر شیر علی خان گرگناڑی اور رسول بخش ساسولی شامل تھے۔ اس کے لشکر نے ''سلمان تنک'' نامی درہ پر مورچے سنبھال لیے تاکہ وہاں سے انگریز فوج گزر نہ سکے۔ گوہرام، نور الدین کا ساتھی تھا۔

اس جنگ میں مینگلوں کا ایک اور ''نُور'' بھی شامل تھا۔ یہ نور محمد تھا۔ نور محمد ساتھیوں اور عوام الناس میں ''نورا'' کے نام سے مشہور تھا: نورا، مینگل۔ نورا، مینگلوں میں پہلوان زئی

قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے باپ کا نام میر حمزہ تھا۔ وہ کور بہادر اور وطن پر جان نچھاور کرنے والا مجاہد تھا۔ وہ 1908 سے لے کر 1917 تک پورے نو سال تک انگریز سے لڑتا رہا۔

اصل میں نورا مینگل انگریز کے قائم کردہ تھانہ وڈھ کا دفعدار تھا۔ اپنی اس سرکاری پوزیشن کے باعث اس نے انگریز فوج کی نقل وحرکت اور طریقہ جنگ کا خوب مطالعہ کر رکھا تھا۔ نورا انگریز کی سامراجیت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کوئی بڑا نظریہ دان تو نہ تھا لیکن بلوچ عوام الناس کے ساتھ انگریز حکمرانوں کے متشدد اور ناروا سلوک نے اُس میں سامراج دشمنی پیدا کر دی۔ جب بھی وہ ان کے مظالم کا جائزہ لیتا اُسے اُن کے خلاف بغاوت کی ترغیب ملتی۔ بالآخر نورا نے سرکاری عہدہ چھوڑ دیا اور انگریز مخالف آزادی پسند مردان حق کو جمع کیا اور خضدار تھانہ پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ دیسی سپاہی جم کر مقابلہ کرنے کی بجائے فرار ہو گئے۔ نورا نے انگریزی املاک کو لوٹ لیا اور سامان رسد بھی حاصل کیا۔ اس نے سرکاری ریکارڈ کو آگ لگا دی۔

پھر اس نے وڈھ کے تھانے پر حملہ کیا جس کا کہ وہ دفعدار رہ چکا تھا۔ وہاں بھی اس نے دیسی سپاہیوں کو اچانک جالیا۔ اور سامان رسد اور گھوڑے اور جنگی سامان بھی حاصل کر لیا۔

سردار زہری خان موسیانڑیں، سردار پہاڑ خان ساسولی، سردار جمشید خان ڈاہیہ، سردار بائی خان سمالانڑیں، خلیفہ عید محمد نیچاری، عظیم مرووئی، میر جمال خان فتح محمد بندرانڑیں، مزار خان باجوئی، میر علم خان مینگل، میر دین محمد مینگل، میر داد کریم رئیسانڑیں، میر محمد اور محمد زئی مینگل بھی نورا کے ساتھ شامل ہوئے۔ آزادی پسندوں نے درہ مولہ کی ناکہ بندی کر دی تا کہ سندھ کی جانب سے انگریزی لشکر حملہ نہ کر پائے۔ فیصلہ یہ تھا کہ صرف حملے پسپا نہ کیے جائیں بلکہ انگریزی عملداری پر بھی ضرب لگائی جائے۔ انگریزوں نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے رسالدار میر غلام نبی کی زیر کمان فوج بھجوائی جو چھاپہ مار انداز میں اچانک کررور کے مقام پر ظاہر ہوئی اور اس نے براہِ راست نورا مینگل پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا مگر وہ نورا کو گرفتار نہ کر سکے۔

اس دوران انگریزوں نے ڈپلومیسی کے ذریعے سراوانی اور جہلاوانی قبائل میں منافرت پھیلانے کے تمام ذرائع استعمال کر ڈالے۔ انہوں نے نواب خان محمد کو اُسی کے بھائی کے ہاتھوں قتل کروا دیا۔ یوں وہاں کی آزادی پسند سپاہ بنا کسی رہنما کے رہ گئی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کلات کرنل ڈیو کو یہ خبر ملی تو وہ فرط مسرت سے بولا ''اب بلوچستان ہمارا ہے''۔ کرنل ڈیو نے چاہا کہ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھرپور کارروائی کی جائے۔ آزادی پسند بھی ادھر ادھر بکھر چکے تھے اس لیے کہ ان کا رہنما اور سپریم کمانڈر نہ رہا تھا۔ کرنل ڈیو 22 مارچ 1916 کو جہلاوان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کے لیے پیش قدمی کرتا چلا گیا۔ انگریز فوج، وفادار سرداروں کی معاونت سے آگے بڑھتی رہی۔ انگریزی لشکر نے لوٹ مار اور آتش زنی شروع کر دی۔ قبضہ کرنے کے بعد قلعہ کو بارود سے اڑا دیا۔ یوں وہ خوف ودہشت پھیلا کر اپنی دھاک قائم رکھتے گئے۔

نورا مینگل کے پاس صرف 21 بہادر رہ گئے تھے۔ اس نے ناقابلِ یقین دلیری سے کرنل ڈیو کا مقابلہ کرنے کے لیے زی دی کا رخ اختیار کیا۔ ایک رائفل نورا کے پاس تھی۔ شاعری میں جس کا نام لیلیٰ اور چھاتی بھی آیا ہے، دوسری رائفل خان محمد کے پاس تھی۔ بارش کے باعث بارود کی چمڑے والی تھیلیاں (مکو) بھیگ چکی تھیں۔ انہوں نے اندھیرے اور تیز بارش میں پہاڑی راستے بدلتے ہوئے وڈھ کی راہ اختیار کی۔ وہ علی الصباح پب کی چوٹیوں پر پہنچ گئے۔ اُس وقت کیپٹن مینڈرس نے سامراج دشمن گوہرام، لالو اور حسن کے چند گھروں پہ مشتمل گاؤں پر دھاوا بول دیا تھا۔ آنکھ کھلی تو گاؤں والوں پہ یہ انکشاف ہوا کہ وہ فوج کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ مگر انہوں نے انگریز کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔ یکے بعد دیگرے وہ جام شہادت نوش کرتے چلے گئے۔ ان سورماؤں نے اپنے خون سے آزادی کی تاریخ رقم کر دی۔

اُدھر نورا مینگل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چٹانوں پہ دوڑتا، پھاندتا برق رفتاری سے بپ کی چوٹیوں سے اتر رہا تھا۔ جراتِ رندانہ سے وہ مٹھی بھر وطن پرست انگریزی لشکر پر حملہ آور ہونے کے لیے موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ نمیرانی کو آوازیں دے رہے تھے۔ لوٹ مار کے بعد ایک انگریز پلٹن گمشادزئیوں کے گاؤں کو لوٹنے اور تاراج کرنے کے لیے بڑھی چلی آ رہی تھی

۔رسالہ اس قدر قریب آ چکا تھا کہ اب نورا اور اس کے ساتھیوں کا بچنا محال تھا۔اب تلوار مارنے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ایک بہادر نے بڑھ کر تلوار چلائی۔ کپتان مینڈرسن نے اس پر ریوالور سے گولی جھونک دی۔نورا نے تاک کر کیپٹن مینڈرسن کے دل پہ گولی ٹکائی۔ کپتان پار گیڈ رینگتا ہوا ہینڈرسن کی مدد کو بڑھا تو نورا نے اس کے ماتھے پر گولی ماردی۔ کپتانوں کو گرتا دیکھ کر لیفٹیننٹ لپکا۔انگریز لیفٹیننٹ کے آہنی خود پر گولی پڑی۔انگریز افسروں کو مرتا دیکھ کر پلٹن کے چھکے چھوٹ گئے۔نورا کے بہادر لشکری انگریز افسروں کو مار کے سر بفلک پہاڑوں میں جذب ہوگئے۔دو انگریز کپتان، جمعدار رسالہ اور کئی سپاہی مارے گئے تھے۔

تباہی کی یہ بازگشت تاج برطانیہ تک جا پہنچی۔آج کے امریکہ کی طرح اُس وقت کے انگریز کے لیے اگر دس ہزار دیسی سپاہی بھی مرجاتے تو مسئلہ نہ ہوتا۔مگر دو انگریز کپتانوں کی موت کے سبب انگریز تو نورا کے خون کے پیاسے ہوگئے۔اب نورا کے لیے کسی ایک مقام پہ رہنا مشکل ہوگیا۔انگریز جاسوس اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔نورا چھاپہ مار جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔وہ انگریزی چوکیوں پر حملہ کرتا۔مارتا کاٹتا اور نکل جاتا۔رسد کی راہ گولیوں سے مسدود کردیتا۔سُچا نشانہ باز تھا۔کم کم گولیاں چلاتا اور ہر گولی نتیجہ خیز ہوتی۔

نورا کا سسر بھی جان کا نذرانہ پیش کرگیا۔نورا کا بھتیجا مامی بھی گرفتار ہوا۔بالآخر یہ بہادر گھیرے میں آ گئے۔کرنل ڈیو نے تمام تر وسائل جھونک دیے تھے۔کرنل ڈیو نے پہاڑ سے اتر آنے کو کہا۔اور یہ، کہ ''انہیں باعزت طریقے سے شاہی جرگے کے سامنے پیش کیا جائے گا۔اُن کے اپنے سردار قبائلی روایات کے مطابق اُن کا فیصلہ کریں گے''۔سردار شہباز گرگناڑی، سلیمان گرگناڑی اور نورا مینگل بہادری سے لڑ کر خون کے آخری قطرے تک مقابلہ کرنے کے حق میں تھے۔مگر سردار نورالدین نے اندازہ لگایا کہ یہ صریحاً خودکشی ہوگی۔اس کے فیصلے سے سارے کے سارے مارے جائیں گے۔لہٰذا اس نے کچل ڈالنے والی شکست کے بجائے باعزت سمجھوتہ قبول کرلیا۔

تمام لوگ پہاڑ سے اُتر آئے۔مگر نورا بدستور چوٹی پر بیٹھا رہا۔انگریزوں نے اس کے پاس میڑھ بھجوائی کہ وہ بھی اُتر آئے، مگر نورا نے انکار کردیا۔پہاڑ سے اُتر کر جانے والوں کی تعداد ایک سو تین تھی۔جبکہ نورا اپنی بندوق کے ساتھ چوٹی پر ہی رہ گیا۔پلٹن نے بھی جرات نہ کی کہ وہ چوٹی پر جا کر نورا کو گرفتار کرنے کی کوششیں کرے۔

نورا اب اپنی بندوق کے ہمراہ انگریزی چوکیوں کو نقصان پہنچا کر اِدھر سے اُدھر نکل جاتا۔عوام میں وہ ہیرو کے طور پر جانا جاتا۔بقول انگریز افسر ٹاڈ ''نورا بلوچستان کا رابن ہڈ'' تھا۔جہلاوان کے پہاڑ اُس کا مسکن تھے۔برطانوی حکومت بار بار اس کی گرفتاری کی منصوبہ بندی کرتی مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

کثرت استعمال سے نورا کی بندوق میں نقص پیدا ہوگیا۔اپنے دیرینہ تعلقات کے پیش نظر وہ سردار حبیب اللہ نوشیروانی سے بندوق کی مرمت کے سلسلے میں مدد مانگنے (دسمبر 1917 کو) خاران جا نکلا۔نورا کا مدعا تھا کہ وہ اس کی بندوق کی مرمت کروادے، یا کوئی اور بندوق دلوادے۔

مگر، دوپہر میں جبکہ نورا سو رہا تھا خارانی سپاہیوں نے اسے ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا۔اس خدمتِ جلیلہ پر انعام واکرام کے علاوہ سردار (حبیب اللہ) کو ''نواب'' بنادیا گیا۔نورا کو سخت پہرے میں کوئٹہ لایا گیا۔ڈیڑھ برس کیس چلتا رہا۔9 اگست 1919 کو اُسے عمر قید کی سزا سنادی گئی۔20 نومبر 1921 کو اِس محبِ آزادی کی روح قفس سے پرواز کرگئی۔

***

آج کے ایرانی بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کا تذکرہ ہمارے ہاں بہت کم کیا جاتا ہے۔وہاں کے بلوچ بھی برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔اس عوامی تحریک کی قیادت چار سرفروش کررہے تھے: خلیل خان گمشادزئی، جیند خان یار محمد زئی، شاہ سوار یار محمد زئی اور سردار جمعہ خان اسمٰعیل زئی۔

فروری 1916 میں دہلی میں مقیم چیف آف سٹاف جنرل کرک پیٹرک نے بریگیڈئر ڈائر کو حکم دیا کہ وہ یک دم بلوچستان کی شمال مغربی سرحد (ایرانی بلوچستان) پہنچ جائے۔ اُسے آگے کیا کرنا ہوگا، اُس سب کے متعلق تفصیلی ہدایات اُسے کوئٹہ میں ملنی تھیں۔

بریگیڈئر ڈائر ہمارے برصغیر کی تاریخ کا وہ خون آشام شخص ہے جس نے ظلم وستم، رشوت، سازش اور بربریت کا آمیزہ بنا کر آگ برسائی تھی۔ مگر اِس پورے خطے میں اُس کی تباہ کاریوں کے طویل عرصے کے بجائے اُسے صرف امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں کھیلی خون کی ہولی کے سبب جانا جاتا ہے۔

اِس مکار شخص نے خود پہنچنے سے قبل اپنی کار موٹر گاڑی ریل کے ذریعے نوشکی بھجوادی۔ اور وہ خود 25 فروری 1916 کو نوشکی پہنچا اور وہاں اپنی کار موٹر حاصل کی۔ (3)۔ اور دون دن بعد موٹر کار پر رباط کی طرف روانہ ہوا۔

ظالم کے لیے لگتا ہے فطرت نے سب کچھ برابر کر رکھا ہوتا ہے۔ ڈائر کو راستے میں ایک شخص ملا۔ عیدو نامی یہ شخص انتہائی مکار، وطن دشمن اور انگریز کا پکا نمک خوار تھا۔ (بعد میں انگریزوں نے اُسے خان صاحب کا خطاب دے دیا!)۔ اُس نے ڈائر کو ایسی ایسی بلوچ دشمن تدابیر بتائیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ڈائر انگریز فوج کے ساتھ نوشکی سے روباط روانہ ہوا۔ جو سامان وہ نوشکی میں چھوڑ چکا تھا اور جو کہ اب پیچھے پیچھے اونٹوں پہ لایا جا رہا تھا' اس پہ بلوچ آزادی پسندوں نے حملہ کر دیا اور بہت سارا مال واسباب قبضہ کر لیا۔ وہ جنرل ڈائر کا ذاتی سامان بھی لے گئے اور اس کی گھوڑی ''گا اھد'' کو ہلاک کر دیا۔ اُس کے سائیس کے سارے کپڑے اتار لیے' اور وہ مادرزاد برہنہ اپنے مالک کے پاس چلا گیا۔ (4)۔ (میں حیران ہوں کہ بلوچ قوم کی سامراج دشمنی کے کتنے گوشے ابھی تک تلاش ہی نہ کیے گئے۔ کتنا کام پڑا ہے مستقبل کے محقق کے لیے !!)۔

عیدو اور ڈائر نے ایک کامیاب پروپیگنڈہ کیا جس سے جنرل ڈائر علاقے بھر میں کرامت سے بھرا ہوا ولی مشہور ہو گیا۔ عیدو نے مشہور کر دیا تھا کہ جنرل ڈائر بزرگ ہے، ولی ہے، اور کرامات سے بھرا ہے اور معجزے دکھا سکتا ہے۔ اور حادثہ دیکھیے کہ جنرل ڈائر کی دعا سے ایک بار بارش بھی برسی تھی۔ ڈائر نے بھی سنجیدگی سے لوگوں کو بتایا کہ اُس راسپوٹین کے پاس تیر بند (تیغ بند) ہے (5)۔

جب جنگ میں گولیوں کی برسات ہو رہی تھی اور سردار خلیل خان اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہا تھا تو اس گردوگرج کے دوران ایک گولی خلیل خان کے سلطانی سر میں لگ جاتی ہے اور یہ پُر افتخار اور، آزاد سر، بلوچی دیوان ومحفلوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ رکی قبیلے کا ایک شخص جو خواش کے پچھلے دربار میں موجود تھا، ڈائر سے کہنے لگا ''صاحب! آپ تو ولی اللہ ہیں۔ آپ نے خواش کے دربار میں کہا کہ اگر خلیل خان آپ کے خلاف لڑے گا تو آپ اُس کا سر اڑا دیں گے۔ وہ دیکھیں، آپ نے ویسا ہی کر دکھایا''۔ ڈائر خود لکھتا ہے کہ ''ایک بار پھر میں نے پالیسی کے طور پر چپ چاپ یہ بات مان لی کہ واقعی میں ایک ولی اللہ ہوں۔ حالانکہ اس تمام معرکے کے دوران میں نے ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی''۔ (6)۔

عیدو کے کہنے پر ڈائر نے دوسرا دغا یہ کیا کہ اپنی موٹر کار کو جنگی حکمت عملی کے ایک فیصلہ کن مہرے کے بطور استعمال کیا۔ ڈائر لکھتا ہے۔ ''مجھے یہ عجیب سا خیال آیا کہ خواش پر حملہ کے لیے کار موٹر کو استعمال کیا جائے۔ عیدو نے فورا کہا ''یہی تو ایک چیز ہے صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے اُسے دیکھ کر میں خود کس قدر حیران ہوا تھا۔ اِس سے آپ اندازہ لگائیں کہ جیند کے جاہل آدمیوں کو یہ کس قدر حواس باختہ اور مرعوب کرے گی۔ اور وہ اسے ایک نئی قسم کا بھوت سمجھیں گے۔ اور ہمارے لیے یہ موٹر کار ایک درجن توپوں سے بھی زیادہ مفید ہوگا''۔ (7)۔

تیز رفتاری سے چلتی ہوئی کار موٹر۔۔۔۔ گرد اڑاتی، ہارن بجاتی، سردی گرمی اور بارش سے محفوظ، یہ کار موٹر نہ تھی بلکہ یہ تو ایک جادوئی کمرہ تھا۔ ڈائر لکھتا ہے کہ ''موٹر کار بلاشبہ ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ دلچسپی اور حیرانی کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ اول تو قبائلی اُس کے پاس جانے سے

ڈرتے تھے۔مگر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ڈرائیور کے حکم پر بالکل خاموش کھڑی رہتی ہے اور کسی کو نہیں کاٹتی تب اُن کا ذوقِ تجسس حالتِ خوف پر غالب آیا اور وہ ایک ایک کر کے آگے آتے رہے اور ڈر کر اُسے ہاتھ لگانے لگے۔اس موقع پر ڈرائیور نے اچانک ہارن بجایا۔ڈر سے چیخ مار کر وہ سب چمپت ہو گئے''(8)۔

عیدو نے عزت نامی سامراج دشمن بلوچ سے کہا:''تم یہ نہیں جانتے کہ جنرل صاحب اپنے ساتھ ایک حیرت انگیز شیطانی آلہ بھی لے آیا۔۔۔۔وہ دیکھو!اس کا اگلا حصہ دیکھو جس میں سینکڑوں چھوٹے موٹے سوراخ ہیں۔جنرل صاحب کو صرف ایک بٹن دبانا پڑے گا اور ان سوراخوں میں سے اولوں کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگے گی۔اور تم اور تمہارے سب آدمی مارے جائیں گے۔۔۔۔تمہاری لیے بس ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے،اُس کے پاس جاؤ،اُس کے پاؤں پڑو اور معافی مانگو''۔''موٹر کار''عیدو نے کہا''ایک جہنمی مشین ہے جو ہر پہاڑ پر جس تیزی سے چاہو چڑھ سکتی ہے،چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتی ہے۔نہ تم اور نہ کوئی دوسرا جو اس سے لڑنا چاہے،بچنے کی ذرہ بھر بھی امید رکھ سکتا ہے''۔

۔۔۔۔اور ہمارا یہ بلوچ۔۔۔۔عزت جیسا بہادر بلوچ،اسی جانور نما عیدو کو جنرل ڈائر کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیتا ہے کہ اگر وہ بلوچوں کو اپنی موٹر کار سے تباہ و برباد نہ کر دے تو وہ چند منٹ میں آ کر ہتھیار ڈال دیں گے''۔(9)۔

اِس کار موٹر کا رعب اور اس کی دہشت اس قدر زیادہ تھی کہ جب سردار جیند کو ہتھیار ڈالنے پڑے تو اس نے پہلی خواہش اس موٹر کار کو دیکھنے کی کی تھی۔(ٹیکنالوجی نے بلوچوں کو بہت پیٹا!!)۔

اس لڑائی میں کمانڈر گل بی بی شامل تھی۔وہ بے باک و بہت ہی خوبصورت خاتون نہایت بے جگری سے انگریز کے خلاف لڑی۔مذاکرات کی بھی ماہر تھی اور میدانِ جنگ میں بھی۔بہادر اور فہمیدہ کمانڈر۔

بہر حال مغربی (ایرانی) بلوچوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔تمام سرحد کے علاقے میں مکمل طور پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔آٹھ ماہ تک خوفناک جنگ کے بعد جنرل ڈائر، علاقے کو پولیٹیکل افسروں کے حوالے کر کے واپس ہندوستان چلا گیا۔

حوالہ جات

1-عطائی .....دبلوچو.....صفحہ 91.....بحوالہ تاریخ نوین ایران۔تودہ پارٹی ۔ صفحہ 11

2-عطائی.....دبلوچو.....صفحہ 91

3-بلوچ،سردار خان''بلنگ و بلوچ''،بلوچی اکیڈمی کوئٹہ،صفحہ 101۔

4-جنرل ڈائر/میر گل خان نصیر،''بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار''،1979 نساء ٹریڈرز کوئٹہ،صفحہ 47۔

5-ایضاً،صفحہ 69

6-ایضاً،صفحہ۔239

7-ایضاً،صفحہ۔246

8-ایضاً،صفحہ۔247

9-ایضاً،صفحہ۔142

2۔مشرقی بلوچستان کا محاذ

(اینگلز مری وارز، تھرڈ راؤنڈ)

ایک عجیب قسم کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔تقریباً ربع صدی تک بلوچستان خاموش رہا۔اور پھر ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے بلوچ کو بین الاقوامی میدان میں لا کھڑا کر دیا۔مشرق میں مظلوم پارٹی بنی، وسطی بلوچستان میں ینگ بلوچ نامی سیاسی پارٹی بنی اور پھر ہوتے ہوتے بات باکو کانفرنس تک جا پہنچی۔اور یہ سب کچھ اسباب وعلل کے جدلیاتی پراسیس کی مطابقت میں ہوا۔

دنیا بھر کی عوامی سیاسی پارٹیوں کی طرح مظلوم پارٹی، ینگ بلوچ، اور باکو کانفرنس بھی اچانک پیدا نہ ہوئیں۔اور نہ ہی یہ ایک آدھ ذہنوں کی فرمائش پہ وجود میں آئیں۔بلکہ یہ سب کچھ انگریز کے خلاف ہماری طویل جنگِ آزادی کا حاصل تھا۔

اس حالت کو جنم دینے والے عوامل خارجی بھی تھے اور داخلی بھی۔انہی خارجی اور داخلی محرکات سے جنم یافتہ مظلوم پارٹی، ینگ بلوچ اور باکو کانفرنس نے ایک بڑا کام کرنا تھا۔انہوں نے نظریاتی اور سائنٹفک نیشنلزم کے نمودار ہونے اور اس کے ارتقا میں تیزی پیدا کرنی تھی۔ان کی بدولت بلوچ قومی جذبہ کو ایک نئی قوتِ متحرکہ حاصل کرنا تھا، اور پورے خطے کے معاملات میں ایک بڑی اہمیت والی سیاسی قوت بننا تھا۔

اس وقت خارجی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ اُس (بیسویں) صدی کے اوائل میں برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھا۔دنیا میں اس کی صنعت اور ترقی کا راج تھا۔ایشیا کے سارے فیوڈل ممالک پہ اس کا قبضہ تھا۔جنوبی ایشیا کے سارے راجے، مہاراجے، خان، امیر اور سلطان انگریز کے نمبردار، جمادار اور رسالدار بنا دیے گئے، ان کا کام اب محض انگریز کا لگان اکٹھا کرنا تھا۔(وہ بھی اُس وقت جب انگریز اُس سے راضی ہوتا)۔متحدہ ہندوستان کے لوگ انگریز فوج میں کرائے کے سپاہی بن بن کر اپنے ہی ہم وطنوں کو کچل رہے تھے۔فرانس، جرمنی، ترکی اور روس نے بھی بہت سے ملکوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔مگر ان کی یہ منڈیاں اور یہ سامراجیت برطانیہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔لہذا دوسرے نمبر کی طاقت جرمنی اس کے آگے کچھ نہ تھی۔

اس منظر نامہ میں دو بڑے عالمی واقعات ایسے ہوئے کہ بلوچ کی ایک باقاعدہ سیاسی پارٹی ضروری ہوگئی۔ان دو واقعات میں ایک تو 1914 میں چھڑ جانے والی پہلی عالمی جنگ تھی اور دوسرا 1917 کا روسی سوشلسٹ انقلاب تھا۔

3۔پہلی عالمی جنگ پہ انگریز سے دوبارہ جھگڑا

بلوچ اپنی آزادی کے لیے انگریز سامراج سے جنگوں میں مصروف تھا۔مگر یہ لڑائیاں نہ تو کسی متحدہ کمان کے تحت تھیں اور نہ ہی قومی پیمانے کی۔کوئی سا ایک قبیلہ سب سے الگ تھلگ اٹھ جاتا، انگریز جیسی ٹکنالوجی سے لیس قوت سے بھڑ جاتا اور شکست کھاتا۔ساتھ والا قبیلہ خاموش۔پھر کہیں دوسرے کونے سے کسی قبیلے کے ایک فرقے میں ابھار پیدا ہو جاتا اور انگریز وہاں کی سرکشی کو کچل ڈالتا۔یوں مادرِ وطن پہ قربان ہونے والے شہیدوں کی تعداد بڑھتی جاتی۔یا پھر جیند وگل بی بی، نورا مینگل اور دلیل و دودا جیسے ہیروؤں کی سامراج دشمنی کے نغمے تخلیق ہوتے رہتے۔اور انگریز کا قبضہ مزید مضبوط ہوتا جاتا۔

یہیں وہ بڑا واقعہ ہوا جس نے پوری دنیا کی طرح بلوچ کو بھی اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ 1914 میں عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اِس جنگ میں جرمنی اور ترکی ایک طرف تھے اور برطانیہ فرانس روس اور اٹلی دوسری طرف۔ یہ بڑی طاقتیں دنیا کی منڈیوں کی بندر بانٹ پر آپس میں لڑ پڑیں ۔یوں پوری دنیا اس طویل اور تباہ کن جنگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ پہلی عالمی جنگ کے بارے میں بلوچ کا نقطۂ نظر یوں تھا:

پلنگ و جرمنی جنگا
دوئیں حاکم مڑغئے ثاں
رڑشہ سیاہ دفیں توپاں
لکھاں گار کنغئے ثاں

ترجمہ:

برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ تھی
دونوں افواج برسرپیکار تھیں
سیاہ دھانوں والی توپوں کی گھن گرج تھی
لاکھوں انسان قتل ہو رہے تھے۔

اس جنگ کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ بات یہ تھی کہ جرمنی تو اپنی افواج کی مدد سے لڑ رہا تھا۔ مگر اُس کے مقابلے میں برطانیہ کی طرف سے اس کی اپنی فوج نہیں بلکہ زیادہ تر ہندوستان سے کرائے کے فوجی لڑ رہے تھے۔ جنگ طول پکڑ گئی تو برطانیہ نے یہاں سے اپنی بھرتیاں مزید بڑھا دیں۔ چونکہ انگریز کا حکم تھا، لہٰذا یہاں ہر حصے سے کے بااثر افراد، جوق در جوق لوگ اس سامراجی فوج میں بھرتی کے لئے پیش کرنے لگ جاتے۔ سکھ، اور گورکھا ہوں یا دیگر پڑوسی اقوام، سب لائن میں کھڑے تھے۔

اس مقصد کے لئے ہندوستان کے ہر علاقے سے سپاہی بھرتی کرنے کے بعد انگریز حکمرانوں نے بلوچستان سے بھی فوجی بھرتی کا پروگرام بنایا۔ بلوچستان میں گورنر جنرل کے نمائندہ سر جے ریمزے نے سبی دربار میں بلوچستان سے سرداروں سے فوجی بھرتی دینے کا مطالبہ کر ڈالا:

سری لوٹیں تمنداراں
سیوی آ روغئے ثاں
تمندار سیولا مُچاں
جرگایاں کنغئے ثاں
پلنگی لوٹغیں مڑداں
بغائی آ دیغئے ثاں
مئیں دستئے نمک واراں
کہ مس داثاں پہ درباراں
پُغا گوں شال و بُلغاراں
اغر آنہانہ گیر آریں
مروشی مارہ پکاریں

ترجمہ:

سردار طلب کئے گئے
سبی کے مقام پر
سردار سبی میں جمع ہیں
جرگے کر رہے ہیں
انگریز، سپاہی مانگ رہا ہے
سردار، بزدلی دکھا رہے ہیں

اے میرے نمک خوارو
میں تمہیں دربار (انعام) دیتا رہا ہوں
چوغے شال اور ریشمی لباس
وہ ساری چیزیں یاد رکھو
آج ہمارے کام آجاؤ

پھر اسی سلسلہ میں کوئٹہ میں ایک جرگہ طلب کیا گیا۔ اس میں سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے ریمزے نے کہا کہ ''جب کہ ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں اور پنجاب کے تمام بلوچ قبائلی سرداروں نے فوجی بھرتی دے کر حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بلوچستان کے سردار بھی ان کی پیروی نہ کریں''۔

مگر، یہ محض سوال و درخواست نہیں تھی۔ زور آور تو کمزور کے سامنے سوالی بن کر بھی، دھمکی دے ڈالتا ہے۔ یہاں بھی اس کی تقریر کے اندر لپٹی ہوئی یہ دھمکی شامل تھی: ''ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ''۔

چنانچہ یوں ہوا کہ بہت سارے بلوچ بھی پگھل پگھل کر انگریز کے سامنے بچھ رہے تھے۔ بہت سارے سرداروں نے بھرتی دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے ذمے لگائے گئے افراد کی لسٹیں تیار کیں اور انگریز کے حوالے کیں۔ انگریز اس کارگزاری پہ بہت خوش تھا۔ اس کی ڈیمانڈ سے زیادہ لوگ بھرتی میں دیے گئے۔

لکھشو صد مڑ داشہ بہراما
پنجہ مڑ داشہ بڑزی بزدارا
ہژدہ مڑ داشہ دریشکہ سڑدارا

ترجمہ:
سو آدمی بہرام خان مزاری نے لکھوائے
پچاس افراد بالائی بزدار نے دیئے
اٹھارہ آدمی دریشک سردار نے دیئے

ایک عجب مخمصہ تھا۔ بلاوجہ بلاسبب اپنے عزیزوں دوستوں کے دور دیسوں میں دفن ہونے کا تصور لرزانے والا تھا۔ پھر، یہ بھی عقل سے بالا بات تھی کہ خود اپنا وطن تو انگریز کے قبضے میں ہو، اور آپ اُس کی خاطر جا کر جرمنی سے لڑیں۔

چنانچہ، بہت غور و فکر کی ضرورت تھی۔ ٹھوس فکری بنیادیں تو موجود تھیں مگر ٹھوس عوامی بنیادیں بھی ضروری تھیں۔ لوگوں کو قائل کرنا، اُنہیں بحث مباحثے میں سے گزارنا اور پھر شعوری فیصلے کو عوامی تائید کے بعد لاگو کرنا تھا۔ چنانچہ، بہت غور و فکر کی ضرورت تھی۔

مصری خان ایں گوں ہشت و دہ زوارا
ما مری اوں گوں خیر نڑ سڑدارا
مئے سری مچی بیشہ کاہانا

ترجمہ:
مصری خان ہے آٹھ دس سواروں کے ساتھ
ہم مری ہیں خیر نڑ (خیر بخش کے پیار کا نام) سردار کے ساتھ
ہماری اولین میٹنگ کاہان میں ہوئی

دانشوروں کی دلیلیں تھیں۔ شاعروں کے اشعار تھے اور ایک دوسرے سے بحث مباحثہ تھا:

ولایت بیشہ ٹھگائی
تڑیں او سنگ و بٹائی
جھوذ بڑتہ پہ روباہی
وطن گپتہ پہ داناہی
ہنر بازنتی ٹھگائی
جھوذی کار و دروہائی

گھبین ءَ ذاتہ لوٹائی
انعاماں داث و پھرائی
ہماں کہ نوکرنت جاہی
نہ گوں سیاہکارہ شرمائی
دینت مڑداں پہ چندائی
وطن داثیش پہ مستائی
کثیش پہ پیسواں بھائی

ترجمہ:

انگریز ٹھگ نکلا
تنڑیں، سنگ اور بٹائی نامی ٹیکس
کافر نے لومڑی کی چالاکی سے سب کچھ ہتھیا لیا
(وہ) چالاکی سے ہمارے وطن پر قابض ہوا
اسے ٹھگی کی بہت سی چالیں آتی ہیں
اس کے ظالمانہ اور دغا باز کام ہیں
اچھے اچھوں کو پاس بلاتا ہے
انعام دیتا ہے عزت بخشتا ہے
وہ، جو کہ ہمیشہ نوکر ہیں
کسی سیاہ کام سے نہ شرمائیں
دیتے ہیں چندے میں افراد
ایسے لوگوں نے وطن بطور تحفہ دیدیا
پیسوں پر بیچ دیا

میٹنگوں، بحث مباحثوں اور دلیل و منطق کرنے کے بعد مری عوام الناس نے فیصلہ کیا کہ ہم بھرتی نہیں دیں گے۔ نتیجہ خواہ کچھ نکلے ہم انگریز سے تو لڑیں گے مگر انگریز کے لیے نہیں۔ اگر لڑنا ہی ہے تو وطن کے لیے وطن کے اندر ہی قربان ہوا جائے۔ دوسروں کے لیے سات سمندر دور بے گور و کفن مرنے میں کیا رکھا ہے۔

مگر مری عوام الناس کی طرف سے ایک کمال فیصلہ کیا گیا۔ وہ یہ کہ اگر قومی پیمانے پر بلوچ کو اکٹھا نہ کیا جا سکے تو کم از کم قبیلہ کے سارے لوگوں کو تو شامل کیا جائے۔ دانشور نے ''کامن سینس'' کی یوں عکاسی کی:

مری تئی ھیل ایں جمارا
کنئے کم عقلیں کارا
مڑئے دیما گوں سرکارا
کئے ءَ زیری ہے بارا
بغر ثہ راجہ سڑدارا

ترجمہ:

مری تیری پرانی عادت ہے
کہ کم عقلی کرتے رہتے ہو
انگریز سرکار سے لڑتے ہو
تو یہ بوجھ کون برداشت کرے گا
ماسوائے قبیلے کے سردار کے

اُس کے نتیجے میں وفد بھیجا گیا سردار کی طرف۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ:

چڑ ثہ مومنیں سڑدار
الٰہی سوڑثی ستار۔۔

ترجمہ:

مومن سردار گھوڑی پہ سوار ہوا

خدائے ستار کو پکارتا ہوا

عوام کا اِنہ وانکار حتمی تھا۔۔۔اور اُس زمانے میں انکار واقرار تو قبیلے کے سب سے ذمہ دار شخص یعنی سردار کو کرنا تھا۔اور سردار خیر بخش اول نے عوام کا یہ انکار سرکار کو پہنچادیا۔ چنانچہ انکار ہوگیا۔

انگریز نے ہمت نہ ہاری ۔اس نے کسی بھی قیمت پہ مری عوام کو بھرتی پہ راضی کرنا چاہا۔مری ایسا کرے گا تو دوسرے قبائل بھی ایسا کریں گے۔سبی کا پولیٹیکل ایجنٹ خود کاہان گیا۔تین دن تک ڈیرے ڈالے،مگر منت سماجت اور لالچ ودھمکی کسی کام نہ آئے۔

خیر بخش (اول) نے اس پس منظر میں انکار کیا۔محترم عزیز بگٹی نے ایک دستاویز کے حوالے سے لکھا:

''مسٹر ایچ۔ڈاسس نے (جو سر ریمزے کے بعد ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان تعینات ہوا تھا) نواب خیر بخش خان مری سے ملاقات کے بعد بلوچ سرداروں کی جانب سے انگریزی فوج میں بھرتی دینے کے سوال پر مسٹر ڈینس برے ڈپٹی سیکرٹری محکمہ خارجہ اور سیاسی امور حکومت ہند کو ایک خفیہ مراسلے میں سبی سے 18 جنوری 1918 کو تحریر کرتے ہوئے رپورٹ کیا کہ فوجی بھرتی ٹھیک ٹھاک طریقے سے جاری تھی۔15 دسمبر 1917 کو وہ کچھی گیا تو وہاں بھرتی ہونے والوں کی لائن لگ گئی۔کلات کے سردار بڑھ چڑھ کر جوانوں کو بھرتی کے لیے پیش کررہے تھے۔مگسی اور رند قبائل کے درمیان بھرتی ہونے کے سلسلے میں ایک مقابلہ تھا۔اسی طرح بنگلزئی اور شاہوانڑیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔کچھ ایسی ہی کیفیت کرد اور لہڑی قبائل کی تھی۔

''مینگل سردار تو بہ نفس نفیس سلطنت برطانیہ کی خاطر اپنے آپ کو حاضر کرنے کو تیار ہوگیا۔لیکن اُسے بتایا گیا کہ اس کا جذبہ وفاداری اپنی جگہ لیکن حکومت کو اس کا قبائلی دستہ درکار ہے۔ جبکہ اسی دوران سبی کے لوگ بھی بھرتی کے لئے پیش ہورہے تھے۔جن میں مرغزانڑیں قبیلہ کے سردار کا بیٹا بھی شامل تھا۔میڈیکل ہوجانے کے بعد اُسے رجسٹر کیا گیا۔کپتان ہنڈ جو کلات کے علاقوں سے بھرتی کا انچارج ہے اس بات پر بے حد خوش ہے کہ بھرتی کے لئے آنے والے جوانوں کی یلغار حیران کن ہے۔وہ ان کے اندراج اور میڈیکل کے لئے اعانت کا طلب گار ہے۔ہم نے اگرچہ احکامات جاری کیے تھے کہ بھرتی شدہ افراد کو 126 اور 127 کمپنی میں شامل کیا جائے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ کلات سے بھرتی ہونے والوں پر مشتمل ایک پورا رجمنٹ بنانا ہوگا۔بھرتی کے ضمن میں اس والہانہ جوش وخروش پر اسے حیرانی اور خوشی ہے''۔

ایسے میں خیر بخش نے انکار کردیا۔ایسا نہیں ہے کہ خیر بخش عام سردار تھا۔اسے تو انگریز نے ہر لحاظ سے خریدنے اور پالتو بنانے کی کوشش کی تھی۔انگریزوں نے اپنی لومڑی گیری کے ذریعے اُسے قابو میں کرنے کی انتہائی کوششیں کیں۔حتی کہ 1896 میں اسے خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا،یکم جنوری 1903 کو اُسے نواب بنایا گیا اور جون 1915 میں اُسے سی آئی ای (کمپینین آف اِنڈین ایمپائر) بھی بنا دیا گیا۔مگر اُن پر شکوہ خطابات اور نوازشات نے آزادی کے اس متوالے کو اپنے راستے سے نہیں ہٹایا اور وہ اپنے مشیرِ خاص وزیر سومرانڑیں کے ساتھ ہر وقت آزادی کے لیے تدبیریں سوچتا۔اس لیے ہم بار بار دھرانے پہ مجبور ہیں:

ماث تی بچے نیاری
نامے بی خیر بشک نواو
گوانزغہ لولی حلالاں
آں کہ ماثا داثغاں
ما ترا مڑداں نہ ذوناں
باجے ژہ جنگا سوا
جنگہ سامانا کشی آ
دیر مہ خن بیا یہ برّا
مڑد ترا ہرچی گزریں

کلاّں کاراں گمبذا

ترجمہ:

کوئی اور ماں ایسا بیٹا نہ جن پائے گی

جو نواب خیر بشک جیسا ہو

(تمہیں) پنگھوڑے کی لوریاں حلال ہیں

جو کہ ماں نے دی تھیں

''ہم تمہیں نفری نہ دیں گے

جنگ کیے بغیر

جنگ کا سامان کر کے

فوراً آجاؤ

تمہیں جتنے آدمی چاہییں

میں سب کو گمبذ لاؤں گا''

یہ تو رحم علی کی رپورٹ تھی۔ مگر یہی کافی نہ تھی۔ دانشور، ملا او مر، نے قوم کی یوں ترجمانی کی تھی:

مری ئے تات و پچارا
نہ ذوَں فوجاں ما سرکارا
ھذا یکّن و برحقیں
مری ماں لیکواں لکھیں

ترجمہ:

مری قبیلے میں ہر جگہ یہ بات تھی

(کہ) ہم سرکار کو فوجیں نہ دیں گے

خدا واحد اور برحق ہے

مری لاکھوں کی تعداد میں ہے

ایک اور شاعر نے اس معاملے کو یوں بیان کیا:

سوآل کُتغا ویسرایا گوئرَ تمن ءَ مسترا
دَے مناں مڑداں مروشی جنگیں مئیں گوں جرمنا
ہاکشہ کلے نواواں منت ایش پہ یہ ڈفا
آتکہ خیر بخش مری ئے داشتئی شاہانی سرا
لوٹغا پائے نہ ڈاہی کئے ترا مڑدانہ دا
مئیں ترا مڑداں جواویں گرٹ بروہندا پڈا

ترجمہ:

وائسرائے نے قبائل کے سربراہوں سے درخواست کی

جرمن کے ساتھ میری جنگ ہے مجھے جنگ کے لئے آدمی دے دو

سارے سرداروں نے یک زبان ہو کر ہاں کر دی

مگر خیر بخش مری اپنے موقف پر اڑا رہا

مانگنے سے کوئی کسی کو چار آنے نہیں دیتا میں تمہیں آدمی کیسے دوں گا

میں بھرتی دینے سے انکار کرتا ہوں، واپس چلے جاؤ

انگریز نے اپنی سامراجی جنگ کے لیے سپاہی بھرتی کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ اور اس بار مری کے پڑوسی قبیلہ لونڑیں کے سردار نواب خان لونڑیں کو قاصد بنا کر مری کے پاس بھیج دیا۔

آتکہ لونڑیں نواوخاں
گون اثی حالے دلی

اغ مری جنگا نہ ذی ئے
ترا نوکری ہندا رسی
چاردہ سال معافیں تئ ڈیھا
اَشتہ ٹھیکایا نہ گیڑ

ترجمہ:
نواب خان لونی آ گیا
اُس کے پاس دل کو لگنے والی خبر تھی
مری قبیلہ اگر تم (ہم سے) جنگ نہ لڑو
تو تمہیں گھر بیٹھے ملازمت ملے گی
ہر قسم کے ٹیکس سے
تمہارا علاقہ چودہ سال تک معاف

چنانچہ اس بار ٹھوس پیشکشیں تھیں۔ انگریز نے قاصد نواب خان لونڑیں کے ذریعے زمینوں کے مالیے سے 14 سال تک معافی دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ مری قبیلہ کو ملازمتیں دینے کی پیشکش بھی کر دی۔ مگر بجائے پیشکش ماننے کے ھوران نامی ایک سومرانڑیں مری نے نواب خان پر تلوار سے وار کیا۔ نواب خان شدید زخمی ہو گیا اور بعد میں مر گیا۔

تب بلوچ کی طرف سے سفارتی پہل کاری ہوئی۔ ریاستِ کلات کے سرداروں سے لے کر کاکڑ، بگٹی اور کھیتران سرداروں کو خیر بخش کا یہ پیغام پہنچایا گیا۔

''حکومت سے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ یورپی میدان جنگ میں گمنام اور بے گور و کفن موت مرنے سے بہتر ہے کہ اپنے وطن پہ مرا جائے''۔

چنانچہ، ایک بڑے اور فیصلہ کن حصے کا انکار سن کر بلوچستان بھر میں انکار پھیل گیا۔ مزاری قبیلہ اب سو افراد دینے کے اپنے وعدے سے دستبردار ہو گیا، بزدار نے بھی اب 50 آدمی دینے سے انکار کر دیا، دریشک کے اٹھارہ آدمی بھی نہ ملے۔ بھرتی دینے کے لیے بہت پر جوش دو جھلاوانی سرداروں کو وہاں کے عوام نے قتل کر دیا۔ کچھی میں بھرتی ہونے والوں کی لگی لائن ٹوٹ گئی۔ مگسی اور رند قبائل کا جوش بھی ٹھنڈا پڑا۔ اسی طرح بنگلزئی، شاہوانڑیں، کرد اور لہڑی میں بھی بھرتی کی کامیاب کاروائی رک گئی۔ مینگل سے لے کر مرغزانڑیں تک سب نے اپنے وعدے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پہلے مری بھرتی دے تب ہمارے وعدہ کیے ہوئے افراد دیے جائیں گے۔

انگریز کا بہت بڑا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ یہ صرف ان کی حکم عدولی کا معاملہ نہ تھا بلکہ یہ بھرتی انگریز کی سخت ضرورت بھی تھی۔ عالمی جنگ میں اُسے لڑاکا لوگوں کی اشد ضرورت تھی۔ مگر اُس کی ساری کوشش چوپٹ گئی۔

صرف یہی نہیں۔ بلکہ اتنی بڑی حکم عدولی کو اگر برداشت کیا جاتا تو پھر تو انگریز کی کمزوری عیاں ہو جاتی اور پوری بلوچ قوم میں بغاوت پھوٹنی تھی۔ اور پھر اُس بغاوت کو ہندوستان بھر میں پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

لہٰذا انگریز نے مری کو سزا دینے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ آدمی زبردستی بھرتی کر کے لے جائے گا۔

اِدھر، عوام نے بھی بیٹھ کر انگریز حملے کا انتظار نہیں کیا۔ انہوں نے چونکہ اُس زمانے کے سپر پاور کو چیلنج کیا تھا تو بڑی تباہی کا سامنا بھی کرنا تھا۔ فوج میں بھرتی کے لیے آدمی دینے سے مری کا انکار واقعتاً ایک بغاوت کے مترادف تھا۔ یہ بغاوت تو ہو گئی۔ چنانچہ عوام نے خود ہی offensive جنگ شروع کر دی اور حکومت کے زیر کنٹرول آس پاس کے دیہات تباہ و برباد کر دیے۔ حکومت کے کچھ کرنے سے پہلے ہی سیوی کا سارا علاقہ آزادی پسندوں کے زور کے نیچے تھا۔ تلی اور ہانبی کے دیہات تباہ کر دیے گئے۔

مری نے حسبِ وعدہ انگریز کے گمبز نامی قلعہ ہی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ عوام اپنی روایتی ہنگامی جنگی پیغام رسانی کے ذریعے دور دراز سے اکٹھے ہونے لگے۔ جنگ جنگ کے گونجتے الفاظ نے ہر پہاڑ اور ہر وادی سے وطن پرستوں کو اکٹھا کیا۔ ذرا دیکھیے کن کن علاقوں سے لوگ امڈ امڈ کر محاذِ

جنگ پہ جانے لگے:

چڑی کنگر ژہ کاہانا
بکوناں آ تکہ بگّانا !!
پلنگہ پولوں آزمانا
ھُذایا آڑتہ میذانا
اُڑثہ کوہ سلیمانی!
سِچّھ و سونڈھ وکشکانی!!
مُقیمی کوہ دَربھانی!
بُنا ماوند و گواثانی!
دَھم اِثہ کاشذاں نیلی
زئے یو ڈونگان و گمبُولی !!
بہاذر آ تکغاں ھِیلی !!

ترجمہ:

کُنگر کاہان سے گھوڑی پر بیٹھتا ہے
بہادری کی باتیں کرتا ہوا
ارے ہم تو انگریز کو آسمانوں میں ڈھونڈ رہے ہیں
یہ تو یہیں زمین پر آ گیا ہے
کوہِ سلیمان کی ساری خلقت اُمڈ آئی
سِچّھ، سونڈھ اور کُشکانی
مقیم وقدیم کوہِ در بھانی
اُس سے آگے ماونداور گواثانی
قاصددوڑ پڑے نیلی کو
زئے، ڈونگان اور گمبولی کو
باوروالے بہادر آئے!

مظلوم پارٹی، ''ینگ بلوچ'' پارٹی، اور باکو کانفرنس سے قبل ہی ہمارا دانشور سماجی سائنس کے مغز کو پہچان چکا تھا۔ وہ استحصالی نظام کی اصل رگ تک پہنچ چکا تھا۔ دیکھیے، ہمارا ناخواندہ قبائلی اُس وقت سرمایہ داری کو سمجھ چکا تھا: ''پیسوہ داث وپیسوہ کٹی'' (پیسہ دے کر پیسہ کمانا)۔

''پیسہ دے کر پیسہ کمانا'' تو کپٹلزم کی شہ رگ ہے۔ ایک سو برس بعد، آج کے ہمارے کرایہ پہ مقرر پی ایچ ڈی وزیرِ خزانہ تک یہ فارمولا نہیں جانتے۔

یہاں بلوچ تاریخ ایک دلچسپ اور نئے پڑاؤ میں داخل ہوتی ہے۔ ہماری شاعری میں ایک نیا رنگ پیدا ہوا۔ انگریزی دور جو کہ جنگوں کا دور تھا۔ وطن اور گل زمین پر مرمٹنے کا دور تھا، بہادروں کا دور تھا، بزدلوں، بھگوڑوں اور اُس کا ساتھ دینے والوں کو برا کہنے کا دور تھا۔ اور بلوچوں پر انگریز جارحیت کے اس دور میں شاعروں نے نہ صرف خود عوام کے ساتھ شانہ بشانہ رہ کر جنگ کی بلکہ ہر بہادر کی توصیف کی، بزدل پر پھٹکار بھیجی، بڑھ بڑھ کر عوام کو ساتھ لیا۔ اور ان کی فتح وشکست میں برابر کا حصہ دار رہا۔

اس دور کا شاعر وسیع النظر بھی ہے اور حساس بھی۔ اس نے سماج میں طبقات کی موجودگی اور بالائی طبقات کے ظلم وستم کو بری طرح محسوس کیا۔

نیم کٹائی سرا ایں
نیم ٹلّی نیم شفاں
نیم دفی زہبے نہ غندی
نیم داری نوکراں

نیم گوں شاذی مراذاں
نیم نالی نیم شفاں

ترجمہ:

کچھ لوگ پلنگوں پر استراحت کرتے ہیں
باقی آدھی راتوں کو در بہ در ٹھوکریں کھاتے ہیں
کچھ کے پاس ایک نوالہ روٹی نہیں
دوسروں کے نوکر چاکر ہیں
کچھ تقریب وجشن میں مست
دوسروں کی فریادیں، آہ وبکا۔

انگریز کو جب گمبذ پہ مری حملے کے ارادے کی خبر پہنچی تو اُس نے فوری طور پر قریبی دکی سے فوجی کمک لی اور مری کے سرحدی علاقے گمبذ میں ڈٹ گیا۔ اس نے قلعہ کی دیواروں کے اوپر توپ اور گولیاں برسانے والی مشینیں نصب کر دیں۔

تین ہزار مری جمع ہوکر 19 اور 20 فروری 1918 کی درمیانی شب ڈیڑھ بجے گمبذ قلعہ پر ٹوٹ پڑے۔ گمبذ کی جنگ میں خیر بخش اول، وزیر سومرانڑیں اور راہنزن شامل تھے۔ اِن راہنماؤں کو مری عوام نے جنگ کے اندر جانے نہیں دیا۔

وزیرئے تیغ حراسانی
ترا نیغ دعائیں پیرانی
قرآن و کچ ءَ سیذانی

الغرض آزادی پسندوں، شہیدوں، زخمیوں تک کی پوری لسٹ ہماری شاعری میں محفوظ ہے۔

کہتے ہیں کہ جب اس جنگ کے لیے لوگ جا رہے تھے تو ایک غریب چرواہا بھی اپنی چپل کے بند چڑھانے لگا۔ بیوی نے طنز کیا کہ تم اور جنگ؟ مگر حب الوطنی کے لیے چرواہا ہونا ممنوع

تو نہیں؟۔ سامراج دشمنی کے لیے غریب ہونا منع تو نہیں؟۔ خاوند سنجیدہ تھا تو شکی مزاج خاتون نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ''اچھا، تو پھر گوروں کے سب سے بڑے افسر (کو قتل کر کے اُس) کی ٹوپی نشانی کے طور پر میرے لیے لانا''۔

ہمارا یہ معصوم وطن پال چرواہا' جنگ میں شامل ہوا۔ اس کے دل میں سمایا ہوا تھا کہ فتح شکست سب جائے جہنم میں، مجھے تو بیوی کے مارے ہوئے طعنے کا بندوبست کرنا ہے۔ روایت ہے کہ وہ جنگی ڈسپلن اور قوانین توڑ کر کسی طرح فصیل پھلانگ گیا۔ اُس نے جا کر گورے (انگریز افسر) کو قتل کر ڈالا اور اس کی ٹوپی اٹھا کر پلٹا۔ مگر واپسی پر فصیل پھلاندتے وقت اُسے گولی لگی۔ اُس نے ٹوپی باہر اپنے قبائل کی طرف پھینک دی اور اُسے اپنی بیوی تک پہنچانے کی وصیت کی۔ ساتھ میں ایک مصرعے پر مشتمل پیغام بھی تھا: گمبذ کی اس جنگ کے بعد بہادروں کو طعنے نہ دیا کرو!۔

گڑتغیں مڑداں رووخاں
شوار پولیں شاھذی
کُشتغیں گورا منی ایں
نواں کن اُنتی مڑ وثی
مئیں سلاماں دینت لالا
تہ نواں بئے وزتی
براث و برازاتک و دلی یار
کُشتغتاں ھر کسی
طعنہ آں مڑداں مہ جنیں
گمبذہ جنگا پذا

ترجمہ

واپس زندہ جانے والو

میں تمہیں گواہ بناتا ہوں
قتل کردہ گورا میرا ہے
کوئی اور اسے اپنا نہ جتائے
میری محبوبہ کو میرا اسلام کہو
تم فکرمند نہ ہونا
(کہ) بھائی بھتیجے اور عزیز دوست
ہر کسی کے مارے گئے ہیں
(ہاں) گنبد کی اس جنگ کے بعد
بہادروں کو طعنے نہ دینا

اسی جنگ میں ایک شیرانڑیں نے اعلان کیا کہ میں ''دن مقرر ہیں'' کو نہیں مانتا۔ میں ابھی ابھی شہید ہونے لگا ہوں۔ ہوا یوں کہ اس کا اکلوتا بیٹا پہلے ہی شہید ہو چکا تھا۔ انگریز سے اس قدر نفرت اور غصہ کہ اس نے کہا ''لوگ کہتے ہیں انسان مقررہ دن مرجاتا ہے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں میرا وقت کیسے پورا نہیں ہوتا؟''۔ یہ کہہ کر وہ ایک اونچی جگہ پہ کھڑا ہوا، زور زور سے چادر ہوا میں لہرانے اور انگریز کو پکار پکار کر گالیاں دینے لگا۔ (بے بس کی جنگ!)۔ گولی اُسے لگ گئی۔ اور وہ وہیں گر کر شہید ہوا۔ (میں اِس مضبوط و مقبول روایت کی پیٹھ شعری ثبوت سے تھپکنے میں ابھی تک ناکام ہوں۔ لیکن آنے والا محقق یہ شعری ثبوت ضرور ڈھونڈ لائے گا!)۔

قلعہ کے افسر کرنل گوآسیّن نے لکھا کہ: میں نے ''انھیں غول واژدھام میں آتے ہوئے دیکھا۔۔ وہ ایک ناگوار چند منٹ تھے کہ ہم نے ان وحشیوں کو قلعے کے اندر اور چھتوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے دیکھا۔۔ رسیوں والی اپنی 100 سیڑھیوں کے ساتھ یہ ''اژدھام'' قلعے میں داخل ہوتا رہا۔

قیامت آچکی تھی۔ انگریز کی توپ اور بندوقوں نے شعلے اگلنے شروع کر دیے۔ دونوں اطراف میں فوجی قوت مساوی نہ تھی۔ کوئی میل ہی نہ تھا، کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ ایک طرف انگریز کی قلعہ بند سٹینڈنگ آرمی تھی جو اپنے ڈسپلن اور برتر جنگی ٹکنالوجی کی نعمت سے سرفراز تھی۔ (شاعر کے بقول: پریٹ (پریڈ)، اور شول (سیٹی) والی گورکھا، سکھ، ہزارہ پر مشتمل سٹینڈنگ آرمی تھی)۔ اور دوسری طرف مری عوام محض حب الوطنی رکھنے والوں کا ایک مجمع تھے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی ڈسپلن اور مشترکہ کمان تتر بتر ہو چکا تھا۔ ہر شخص ذاتی بہادری کے اندر اجتماعی مقصد اور ضروری داؤ پیچ دفن کر چکا تھا۔ مری اپنی خستہ حال تلواروں اور بے معنی ڈھالوں کے ساتھ صبح صادق تک جدید ٹکنالوجی اور ایک سٹینڈنگ آرمی کے سامنے ڈٹے رہے۔

سغاراں چاپ و چُلکارا
ھُلک و ہونہ شیکارا
مشین و رئیفلاں چَاٹیں
چھڑا گانڈی ئے نارھاٹیں
گِلّٹیں تیرہ چھانٹیں
چَھرایاں پھیرو ہینڑواٹیں

ترجمہ:
تلواروں کا رقص و آہنگ ہے
خون کی دھاریں، چھلکاوے
مشینوں رائیفلوں کی تالیاں ہیں
صرف بندوقوں کے چنگھاڑ ہیں
یک فائری بندوق کی سائیں سائیں ہیں
چھروں کی گونجیں ہیں

ملّا اومر کا طرز بھی دیکھیے:

مڑوخاں وہمیں گوں جنگا

شمشتہ کوڑو ءَ دھندا
روغی گمبذ ءَ کندھا
پلنگ ءَ توپہ زمبھارا
دھمشہ شف دہ چیار پہرا
مشینے ریفلی گواراں
گلٹی تیر پہ انگاراں
مزار پہ ڈوبرا داراں

ترجمہ:

لڑاکا تو جنگ کا ہی سوچتے ہیں
انہوں نے دنیا کے دیگر امور فراموش کر دیے
رسی کی سیڑھیاں بنانے لگے
اس لیے کہ گنبذ کی فصیل پار کرنی تھی
پلنگ کے توپوں کا شور تھا
رات آخر تک ڈھلتی گئی
رائیفل اور مشینیں گولیوں کی بارش برساتی رہیں
انگارے بنی آہنی گولیاں تھیں
شیر، انہیں اپنے سینوں پہ جھیلتے رہے

ہمارے قبائل کو اپنے اسلاف کے بارے میں مفصل جاننے کا شدت سے اشتیاق رہتا ہے۔ اس لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ گمبذ کی اس جنگ میں 9 سالار انڑیں شہید ہوئے: لنڈا، ولیا، شاہل، سلاماں۔ (سالار انڑیوں کے باقی پانچ نام دلیل اور جادا مجھے نہ بتا سکے۔ یہاں سومرا انڑیں کے چار بہادر شہید ہو گئے: حکیم خان، شہباز.....(دو اور پاک نام میری نا اہلی کی نذر)۔

ٹکنالوجی نامی دیوتا نے جنگ کو شروع ہی سے یک طرفہ بنا رکھا تھا۔ بدی کے سارے در مری پہ کھول دیے گئے تھے۔ صبح سویرے تک لڑائی جاری رہی۔ تین افسر مارے گئے اور پانچ افسر زخمی ہوئے۔ موتی جیسے 117 'گراں ڈیل مری قلعے کی دیواروں کے ساتھ اور احاطے میں اپنی جان نچھاور کر کے گمبذ کے قلعہ کو یادگار بنا گئے، پچاس زخمی ہوئے۔ غیرت' شان، افتخار اور حمیت سلامت رہی' مری لشکر شکست کھا گیا۔

اے۔ جی۔ جی نے دوسرے قبائل میں مزاحمت کے ''انفیکشن'' کے پھیلنے سے خوفزدہ ہو کر اپنے افسروں کو لکھا کہ وہ یقینی بنالیں کہ گمبذ میں ہلاک ہونے والے مریوں کی ''زیارتیں'' یا شہیدوں کے مقبرے تعمیر نہ ہونے پائیں۔(1)۔۔۔۔

گمبذ کی اس جنگ کو خیر بخش مری (دوم) نے ایک پیراگراف میں یوں بیان کیا تھا:

''ایک قلعہ (گمبذ) تھا مریوں نے تیاری کی تھی کہ قلعہ پر قابض انگریز پر حملہ کریں۔ چھوٹا سا قلعہ تھا، تھوڑی سی اس میں نفری تھی۔ یہ لوگ قلعہ سے کہیں آٹھ دس میل دور جمع ہوئے۔ اب رات ہے۔ یہ ہے ہماری فوجی تدبیر، حکمت عملی یا ہماری دانائی۔ سنا ہے کہ انگریز کے کارندے ہندوستانی سپاہی تھے۔ اس میں زیادہ تر یہ کہا گیا کہ گیڈرز زیادہ بول رہے ہیں کیا وجہ ہے؟۔ کچھ دیر تو وہ نہیں سمجھے کہ یہ شور کس چیز کا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ باہر دس میل سے دوڑ رہے ہیں۔ شور قریب آیا تو کہا یہ تو انسانی لشکر ہے۔ آخر بات کیا ہے۔ بہر حال انہیں اندازہ ہوا کہ کوئی قبائلی لشکر جنگ کرنے کے لیے آرہا ہے۔ ابھی یہاں مقصد کیا ہونی چاہیے تھی کہ رات کے اندھیرے کو جو آپ استعمال کر رہے ہیں تو اُس سے کیا فائدہ لے رہے ہیں۔ کم سے کم یہ فائدہ تو ہوتا کہ دشمن کو پتہ ہی نہ چلتا کہ ناگمان آ کے ٹوٹ پڑتے۔ قلعے کی جانب دس بارہ میل دور سے دوڑتے آرہے ہیں کیونکہ فکر قبائلی ہے۔ وہاں دکھانا یہ تھا کہ میں دوسرے سے زیادہ دلیر ہوں۔ یہاں اپنے بٹن کھول کے کوشش یہ ہے کہ میں دوسرے سے آگے جاؤں، شور مچا رہے ہیں ایک طرف خود کو تھکا رہے ہیں۔ جب وہ قلعے کے قریب آئے تو رات بھر مکھی کی طرح مارے جاتے رہے۔ صبح کی روشنی میں دیکھا کہ اب واپس جائیں کیونکہ وہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں، بھائی تمہیں اگر دیکھ نہیں رہے تھے تمہیں سن تو رہے تھے، محسوس کر رہے تھے۔ تو کیا لڑائی لڑی آپ نے؟''۔(2)

شکست خوردہ مری سپاہ اب تین الگ الگ راستوں سے پسپا ہوئی۔ ایک حصہ پڑہ چلا گیا، دوسرے نے کوہلو وادی کو عبور کیا۔ اور ماوند کی طرف چلا گیا، اور تیسرا گروہ گُنل اور سَوَڑ کی طرف چلا گیا۔

حوالہ جات

1۔ AGG Dobbs to PA Sibi at Gumbaz .Marri Outbreak. File 5:23 Feburary-27. Feburary 1918 AGG /ER/BA/CS/Quetta. p. 150

2۔ مری، خیر بخش۔ فکر، نظریہ، سوانح۔ صفحہ 393

4۔ سُتکغیں شہر

برطانیہ ایسا مہیب وخوفناک سُپر پاور تھا جس کی وسیع سلطنت پہ سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ اتنا وسیع کہ اگر اُس کے ایک حصے پر رات ہوجاتی تو دُور اُس کے کسی نہ کسی حصے پر دن ہوتا تھا۔ ایسا سُپر پاور جس کے پاس زمانے بھر کی مہلک ترین جنگی ٹکنالوجی موجود تھی۔ اور جو ایک برتر معاشی سماجی نظام کا مالک تھا۔ اُس سوپر پاور کو صرف ایک قبیلے نے اس بات پہ چیلنج کیا تھا کہ وہ پہلی عالمی جنگ کے لیے اپنے آدمیوں کو بھرتی میں نہیں دے گا۔ یہ انکار، پورے سامراجی نظام کو ایک چیلنج تھا۔ اب اس قبیلے کی تباہی تو آنی تھی۔

جنگی حکمت عملی میں اب قبیلے کے پاس دو طریقے تھے۔ یا تو وہ خود پہل کر کے حملہ کردے، یا پھر انگریز کے حملے کے لیے دفاعی جنگ لڑے۔ قبیلے کی بہت کم قوت اور علاقے کی جغرافیائی صورت کے پیش نظر بہتر طریقہ، حملہ کرنا تھا۔ پہل کرنی تھی۔ اور ،مری نے گنبذ پر حملہ کر کے یہ پہل کاری کی تھی۔ مری عوام نے جنگ شروع کی تھی اور اپنے قبیلے کے باہر آس پاس کے دیہات تباہ و برباد کردیے۔

بالخصوص قلعہ گنبذ کی شکست کے بعد مری نے ایک بار پھر اپنے حملے تیز کردیے۔ اس

کے ایک لشکر نے سبی کے علاقے میں کوچیالی ریلوے سٹیشن پر حملہ کر دیا۔ وہاں کے سارے عملے کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے گروہ نے ہرنائی کی ریلوے لائن اکھاڑ پھینکی۔ ہر جگہ انگریز ملازموں کا قتل شروع ہوا۔ سرکاری عمارتیں جلائی جانے لگیں، خزانہ، کانوائی اور راشن کے گوداموں کی لوٹ شروع ہوگئی۔ بولان کے راستے کاروانوں کی آمدورفت اور فوج کا گزر مشکل بنا دیا گیا۔ سیوی کا سارا علاقہ اُن کے زور کے نیچے چلا گیا تھا۔ تلی اور ہانبی کے دیہات تباہ کر دیئے گئے (1)۔ کوئٹ تھانہ، اور ہرنائی تا لورالائی فوجی پکٹوں پر بھی ''ناگماں'' بن کر حملے کیے گئے۔ علاوہ ازیں لپک جھپٹ میں بولان اور سندھ پشین ریلوے پر بھی کئی ''سرپرائز'' حملے کر کے اسے لوٹا اور ریلوے لائن کو خراب کیا۔ المختصر سارے علاقے میں ایک ایسی آگ بھڑکائی گئی جسکا بجھانا، سوائے ایک بڑی انگریز فوج بھیجنے کے، ناممکن تھا۔

بلوچوں نے یہیں پہ بس نہیں کیا۔ دُور، مشرق کے کوہِ سلیمان علاقہ میں بھی مری، کھیتران اور گورشانڑیں کی کثیر القبائلی فوج نے انگریزی تنصیبات کے کان مروڑنا شروع کر دیے۔ اُن کے لیے پہلی دعوت تو خود فورٹ منرو کی اہم پوسٹ پہ تیار تھی۔ چنانچہ وہ قہر بن کر 28 فروری کو 1918 کو فورٹ منرو پہ ٹوٹ پڑے۔ اُس کا ڈاکخانہ اور تھانہ تباہ کر دیا۔ وہاں موجود سرکاری عمارتوں کو اگنی دیوتا کے حوالے کیا۔ اور خزانہ آپس میں بانٹ لیا۔

یکم مارچ 1918 کو بلوچ عوامی لشکر نے کھرڑ نامی مقام کا تقدس بحال کرنے اس پہ حملہ کیا۔ اور اسے آزاد کر کے اُس پہ غیر ملکی استعمار کے قبضے کے تلخ احساس کے اپنے رِستے زخم کو مندمل کر دیا۔ انہوں نے ڈاکخانہ، ڈاک بنگلہ اور باڈر ملٹری پولیس کی چوکی پر قبضہ کر لیا اور انہیں آگ لگا دی۔ انہوں نے وہاں موجود انگریزی ہتھیار قبضہ کر کے اپنے کندھوں پہ سجا لیے۔

پھر بیواٹہ کو جلوہ دکھانے کی باری آئی۔ چنانچہ انہوں نے بیواٹہ پوسٹ کو آسمان تک جاتے دھوئیں میں بدل دیا۔

اسی طرح جلد ہی انہوں نے رکھنی پر بھی قبضہ کرا لیا۔

اسی دوران آزادی پسندوں نے بغاوت میں شمال کی طرف کے موسیٰ خیل قبیلے کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کنگری ریسٹ ہاؤس کو آزاد کرا لیا۔

چھ مارچ 1918 کو لیویز جمادار مصری خان کھیتران اور وزیر ہان مری کی قیادت میں 1500 کھیتران اور 500 مریوں نے تحصیل بارکھان پر مہربانی کی۔ اور اُسے نامہرباں گندے ہاتھوں سے آزاد کر دیا۔ اُس کا تھانہ کھنڈر کر دیا، اپنے قیدی رہا کر دیے، اور سرکاری خزانہ اپنی خورجینوں میں منتقل کیا۔

انگریز ہر ہر جگہ سے زخمی ہو رہا تھا۔ تابڑ توڑ حملوں میں اُسے ہوش سنبھالنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ پچھلی بلیڈنگ تھمتی نہ تھی کہ کہیں اور سے ایک کاری وار کی خبر آجاتی۔ بغاوت نہ تھی، یہ تو جنگل کی آگ تھی جو مشرقی بلوچستان کے ہر علاقے اور ہر قبیلے کو چاٹ کر دشمن سے صاف کر رہی تھی۔ پورا علاقہ انگریز کے پنجوں سے نکل چکا تھا۔ خطرہ تھا کہ بغاوت کی یہ حسین اور باشرف پری بلوچستان کے دیگر علاقوں میں سایہ فگن ہو جائے گی۔

اس گھمبیر صورتحال میں اے جی جی کی نیند اڑ گئی۔ اُسے واقعتاً ایک جنگِ آزادی کا سامنا تھا۔ کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ تب اُس نے دہلی میں فارن آفس سے نہ صرف مزید فوج کا مطالبہ کیا، بلکہ بمبار جہازوں کی کمک بھی مانگی۔ (2)۔ ہنگامی خط و کتابت جاری رہی اور تار و ٹیلیگراموں کے تبادلے ہوئے۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا ڈیمانڈ مان لیا گیا اور مزید فوجی کمک اور جنگی جہازوں کی منظوری مل گئی۔ بمباری والے یہ جہاز سفید رنگ کے BE2c نام کے تھے۔ دو جہاز سبی میں متعین کیے گئے، 2 دکی میں، اور پانچ ڈیرہ غازی خان میں۔ اِن جہازوں نے علاقے میں بمباری بھی کرنی تھی اور خوف بھی پھیلانا تھا۔

انگریز نے مری قبیلے کو دو طرفہ سجی کرنا تھا۔ یعنی اُس نے دو اطراف سے فوج مری علاقے میں بھیج دی۔ ایک نسبتاً بڑی فوج مشرق میں ڈیرہ غازی خان کی طرف سے روانہ ہوئی۔ اور دوسری شمال میں دکی کی طرف سے۔ دکی والی فوج کے ساتھ موٹر سائیکل اور خچر تھے۔ ڈیرہ غازی خان سے آنے والی فوج میں ڈوگرہ تھے، سکھ تھے، اور پنجابی مسلمان تھے۔ نیز اس فوج میں پشتون بھی تھے۔ انگریز کی دستاویزات کے مطابق ''پٹھان کمپنی'' میں آدھے یوسف زئی تھے اور آدھے خٹک۔

بہر حال جنرل ہارڈی کی ڈسپلنڈ اور ٹریننگ یافتہ سٹینڈنگ آرمی ، بے ربط و غیر تربیت یافتہ مری بہادروں سے لڑنے بلوچستان میں داخل ہوئی ۔ مارشل لا کا اعلان ہوا۔ جی ہاں مارشل لاؤں کی ہسٹری لکھنے والوں کو خبر ہو کہ ہم پہ پہلا مارشل لا انگریز فوج نے لگایا تھا، 1918 میں ۔

اُدھر انگریز نئی فوج منگا چکا تھا مگر اِدھر رکھنی کا اُس کا اپنا لیویز جمادار مصری خان کھیتران اپنی افسری چھوڑ گیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مریوں سے مل گیا۔

بہر حال، ڈیرہ غازی خان سے اُمڈ آنے والی انگریز فوج 15 مارچ کو بارکھان پہنچی ۔انگریزوں کے لیے یہ پکنک پارٹی نہ تھی، اُن کا سامنا ماں وطن کو آزاد کرانے والوں سے تھا۔ بلوچ کے لیے بھی یہ کوئی عام لڑائی نہ تھی۔ایک سپر پاور کی قبضہ گیری کی رال ٹپکاتی فوجی قوت، سامنے تھی۔

ایک خونریز جنگ لگی۔کھیتران کے 14 افراد نمیران (شہید) ہوگئے:

1۔زہرو ولد لاش،2۔ پٹانڑ ولد ھئیرو،3رحمتان ولد دامانی،4۔خلیل ولد رحمان،5۔ زاری ولد سومان6۔گنجابی ولد حیدر،7۔ ناتو ولد یاسین،8۔عمر ولد بابو،9سمندر ولد شامیر ساکن عیشانی ،10۔خیرو ولد شامیر ساکن عیشانی،11۔اللہ یار ولد شامیر ساکن عیشانی،12۔رحمٰن ولد شامیر ساکن بابانی،13۔چہر گل ولد عمر ساکن رڑکن اور 14۔نور محمد ولد عمر ساکن حسنی۔

بارکھان کا ضدی میدان !تم یہ کبھی نہ کہہ سکو گے کہ تمہارا کوئی ولی وارث نہ تھا۔ چودہ الھڑ اور مست ورقصاں نوجوان تمہارے پیر چومنے گر گئے ۔ بقیہ پاک قبائلی اپنے وطن کے دیگر گوشوں کو انگریز کے ملیچھ قدموں سے بچانے کے لیے پیچھے ہٹے۔۔۔۔ہمیں شکست ہوگئی تھی۔

فرنگی کی اگلی منزل مری قبیلہ کا مرکزی شہر ماوند تھا۔اُسے ہر قیمت پر مری کے شہری مرکز، ماوند کو قبضے میں لانا تھا۔انگریز نے لکھا کہ ''ماوند کاہان کے بعد سب سے اہم شہر تھا، اور موجودہ معاملے میں تو کاہان سے بھی زیادہ اہم۔اس لیے کہ یہ بجارانڑیوں کا شہر تھا، اور بجارانڑیں ہی جنگ (جنگِ آزادی) کے موجودہ ابھار کے ذمہ دار تھے''۔

اُدھر گمبذ جنگ سے ٹوٹی کمر اور شکست کی ہزیمت کھایا مری بھی، گرتے سنبھلتے اپنے اس آخری قلعے کو بچانے پھر جمع ہوگیا۔ ہمارے پاس حب الوطنی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ بلوچ کوئی باقاعدہ فوج نہ تھے۔اس کا اسلحہ انتہائی فرسودہ اور دقیانوسی تھا۔جنگ لگ جانے کے بعد وہ کسی اجتماعی کمان کو ماننے کا عادی نہ تھا۔ بلکہ تب ہر شخص ساری ذمہ داری انفرادی طور پر اٹھاتا۔اپنی اپنی بہادری کو ضرب المثل بنانے کی تگ و دو کرتا۔ قبیلے کے پاس ویسے بھی ایک جدید سٹینڈنگ آرمی کے طرز کی کمان کی سیٹی اور بگل نہیں ہوتے تھے۔ جنرل ہارڈی کی فوج آگے بڑھتی گئی۔اور کھیتران قبیلہ زیر کرنے کے بعد مری علاقے میں داخل ہوگئی۔اس وحشی میمتھ نے راستے میں آئے ہر دیہات، گھر، اور جھگی کو غارت کیا۔فصل تاراج کر دیے اور مویشی اکٹھا کر کے کباب اور سجی بنا لیے ۔

بلوچ نے غنیم انگریز کا راستہ وہیں کہیں کسی مناسب جگہ پہ روکنا تھا۔اور وہ جگہ ماوند سے پہلے کوئی جگہ ہونی تھی۔

28 مارچ کو انگریز نے بوڑ کے مقام پر کیمپ لگایا۔انگریز فوج ایک ہفتہ تک وہیں قیام پذیر رہی۔ یہاں وہ راشن جمع کرتی رہی۔پچھلی تھکاوٹ دور کرتی رہی اور اپنی صفوں میں چھوٹی موٹی شکست وریخت درست کرتی رہی۔اس نے مری قبیلے کے ویٹیکن پہ قبضے کی تیاریوں کی صف بندی بھی کرنی تھی اور نقشوں چارٹوں پہ اگلے بڑے معرکے کی منصوبہ بندی بھی کرنی تھی۔جی ہاں، شیطان خوب خوب منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سچی بات ہے کہ بلوچ کو اگر کسی بات سے مار پڑی تو وہ ہمیشہ دشمن کی منصوبہ بندی تھی!۔

انگریز فوج 2 اپریل تک وہ وہیں بوڑ میں رہی۔مگر، اس دوران جنگی جہازوں سے اُس کی بمباری جاری رہی۔انگریز فوج ہوائی حملے نہ کرتی تو اُس کی بڑی تباہی ہونی یقینی تھی۔جنگی جہاز بیواٹہ ،رکھنی، وٹاکڑی، ناہڑ، کاہان، ماوند اور دکی کے علاقوں پہ بمباری کرتے رہے (3)۔

پلنگی آتکغہ بوڑا
جہازاں بال دیغیں ناں

ترجمہ:

فرنگی بوڑ کے مقام پر پہنچا
جنگی جہاز اڑاتے ہوئے

یہ ٹھیک ہے کہ پائلٹوں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ جن لوگوں کو وہ دیکھ رہے ہیں وہ دشمن ہیں یا اتحادی؟۔۔۔مگر اُسے یہ جاننے کی کوئی خاص پرواہ بھی نہ تھی۔اُسے تمیز کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔اخلاقیات اور سامراجیت اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

یہ جہاز بمباری کے علاوہ نیچی پروازیں کرتے تھے تاکہ لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔انگریز اور اس کے ایجنٹوں نے جہازوں سے زہریلی گیس پھینکنے کا خوف پھیلایا تھا۔اور اُس سے بھی بڑھ کر نامرد بنانے والی گیس پھینکنے کا خوف۔

لوگ بمباری سے بچنے کے لیے جہازوں کی آواز سنتے ہی فوراً ٹکڑیوں میں بٹ جاتے اور مختلف سمتوں میں بکھر جاتے۔ یوں نقصان کم ہو جاتا۔

انگریز نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔جتنی تباہی وہ کر سکتا تھا کر لی۔کوئٹہ آرکائیوز میں کاغذوں کے پلندے ملیں گے جس میں ہر افسر مبالغے کی حد تک اپنی تباہ کاریاں بیان کر رہا تھا۔بمباری کے نتائج کو برٹش لوگ یوں تقسیم کرتے تھے: اچھا اثر، گریٹ اثر، عمدہ اثر۔

اِدھر آزادی پسند بھی اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔وہ ریلوے سرنگوں میں پتھر ڈالتے، فوج اور ٹیلیگراف پر حملے کرتے اور دیگر گڑبڑ جاری رکھے ہوئے تھے۔

انگریز نے انفرادی طور پر ہتھیار ڈالنے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اعلانات ہوتے رہے کہ ہتھیار ڈالنے والے اپنے سردار کے پاس جا کر ہتھیار ڈال دیں۔جس کے بعد سردار پھر اجتماعی طور پر انگریز کے سامنے ہتھیار پھینک دے۔یوں سردار کی اتھارٹی دوبارہ قائم کرنا مقصود تھی۔فارن آفس کے احکامات یوں تھے۔''بنیادی اصول یہ ہے: ہر قبیلہ سے ایک مجموعہ کی صورت نمٹا جائے، اور ہر قبیلے سے اس کے تسلیم شدہ ترجمان اور نمائندے یعنی چیف کے ذریعے سمجھوتہ کیا جائے، وہ خود خواہ وفادار رہا ہو یا نہیں۔۔۔اُس وقت تک فوجیں تباہی جاری رکھیں''(4)۔

دو اپریل کو فرنگی تازہ دم شدہ فوج بوڑ سے روانہ ہوئی۔اسے کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔جیسے پورے وطن سے آدم زاد یک دم ختم ہو چکے ہوں۔انہیں ایک بھی بشر نہیں ملا۔دن بھر کا سفر طے کرتے ہوئے وہ جیونڑیں تک بلا مقابلہ پیش قدمی کرتی رہی۔3 تاریخ کو انگریز کی یہ فوج ماوند کے قریب منجھر اندی کے کنارے قیام کر گئی(5)۔

4 اپریل 1918 کی صبح کے وقت ہڑب کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، خون آشام بے محابا لڑائی شروع ہوئی اور شام تک جاری رہی(6)۔

چونو ذاں دوستی زڑتہ
ھڑبّا نو ذشلغئے ثاں

جیسے کہ بادل دوستی دکھاتے ہوں
ہڑب کے مقام پر (بارود کی) موسلا دھار برس رہی تھی

مری نے اس جنگ میں 90 لاشیں وطن کو، عزتِ نفس کو، خود اختیاری کو، اور اشرف انسانی سرشت کو عطیہ کر دیں (ہماری دھرتی کے یہ سارے میڈل ماوند کے قبرستان میں دفن ہیں)۔ 90 انسانوں نے زندگانی جیسی بے نظیر نعمت کی قربانی دے کر سامراج دشمنی کی فخریہ نفسیات اپنی نسلوں کو منتقل کر دی۔۔۔اور شکست کھائی۔

ماوند شہر کا قلعہ توپ نے اڑا دیا۔بلوچستان کے مشرقی محاذ میں ماوند بلوچوں کا آخری قلعہ تھا جو قبضہ ہو گیا۔اور اس مشکل ترین ہدف کو حاصل کرنے کے لیے انگریز کو جنگی جہاز منگوانے پڑے تھے اور بہت بڑی فوج بھیجنی پڑی تھی۔اسی لیے ماوند کا قبضہ انگریزوں کی ملٹری ہسٹری میں ایک ٹرافی، ایک میڈل تھا۔

قابض فوج 4 اپریل سے 10 اپریل تک ماوند میں رہی۔ماوند کے رہائشی تو جنگ کے شروع میں شہر خالی کر گئے تھے۔فطری بات ہے کہ غنیم کو اپنا غصہ نکالنا تھا۔انسان تو موجود ہی نہ تھے لہذا سارا غصہ در و دیوار پہ نکالا گیا۔انگریز نے ماوند کو مکمل طور پر بقول اُس کے ''destroy'' کیا۔ پورے علاقے کو گندم سپلائی کرنے والے زرخیز ماوند میں گندم کی تیار فصل تباہ کر دی۔

غصہ کی انتہا پست انسان میں موجود کمینگی کو ننگا کر ڈالتی ہے۔یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔انگریز نے مشرقی بلوچستان کے اس اہم تہذیبی، معاشی سیاسی اور شہری مرکز ماوند کو جلا ڈالا۔بلوچستان میں

پرتگیزیوں کے بعد تین سو سال تک شہری مراکز کو کہیں بھی نہیں جلایا گیا تھا۔ خود انگریز نے بھی برصغیر میں اپنے دو سو سالہ دور میں عموماً، اور بلوچستان میں خصوصاً، شہر جلائی والا کام زیادہ نہیں کیا۔ چنگیز نے لائبریریاں جلا ڈالیں، انگریز نے شہر جلا دیا۔۔۔ ماوند جلا دیا۔

ہمارے آبا کے ارمانوں، عزائم اور محنتوں کو ایک ناترس، پست اور پسماندہ قبضہ گیر کی درندگی کا سامنا ہوا۔ حسین انسانی جذبات اب ملبہ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ واضح رہے کہ مری قبیلے میں اُس وقت دو ہی بڑے شہر تھے: کاہان اور ماوند۔

آج کا ماوند جلے ہوئے (سُتلغیں) شہر سے شمال کی جانب تعمیر کیا گیا ماوند ہے۔ خاکستر اور راکھستر بنا دیے گئے جلے ہوئے ماوند کے کھنڈرات آج بھی ''کہنیں شہر'' (قدیم شہر) کہلاتے ہیں۔ جہاں آج کل ایف سی کا قلعہ واقع ہے۔ آج کل کا نیا شہر وزیر سومرانڑیں نے تعمیر کرایا۔

انگریز کی طرف سے پورے بلوچستان میں جلائے گئے اس واحد شہر کی کچھ تفصیلات یوں ہیں:

وزیر کے والد شادی ہان کا بنوایا ہوا یہ شہر ایک مربع نما قلعہ تھا جس کے فصیل پر چاروں کونوں پر بڑے بڑے ''ڈُھل'' تھے۔ شہر کا بڑا دروازہ جنوب کی طرف تھا۔

فصیل کے اندر مشرقی طرف سومرازئی آباد تھے جبکہ شمال مشرق میں وڈیرہ زئی آباد تھے وڈیرہ زئی کے مغربی طرف بلوچاں زئی تھے جن کے بعد بڈازئی اور ان کے بعد سلطان زئی اور انتہائی مغرب میں سیدعلی زئی رہتے تھے۔ جلالہاں زئی پہلے قلعے کے اندر نہیں رہتے تھے۔ بلکہ سیاہ آف میں ''عمرخانہ ماڑی'' میں رہتے تھے۔

کانج کا نالہ انگریز سے پہلے کا ہے۔

اس جنگ میں سالارانڑیں کی طرف سے بہادر ترین شخص کا نام مٹھا تھا۔ یہاں وزیر 9 دیگر سومرانڑیوں کے ساتھ شامل تھے۔ اسی جنگ میں حاجی ھّدے اور کمال سومرانڑیں زخمی ہو گئے ۔مصری خان کھیترانڑ اور مڑزیھان ونہالان وطن دوستوں کی صفِ اول میں تھے۔

ریفرنسز

1۔ بلوچ، سردار خان۔ صفحہ 539

2۔ Major Bruce to Major Trench. Advance of marri Punitive Force to Mawand and kahan.30 May 1918 AGG/ER/BA/CS/Quetta p.1

3۔ Major Bruce to Major Trench. Advance of marri Punitive Force to Mawand and kahan.30 May 1918 AGG/ER/BA/CS/Quetta p.7

4- Khetran Outbreak File: 477 F:17 Sep 1918 AGG/ER/BA/CS/Quetta P.14

5- آرکائیوز آف بلوچستان'' سال 1918، فائل XXIII۔ Raids، نمبر 5 جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 3۔

6- آرکائیوز آف بلوچستان'' سال 1918، فائل XXIII۔ Raids، نمبر 5 جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 3۔

5۔ فاتح (انگریز) کی مسلط کردہ سزائیں

اسی اثناء میں سردار خیر بخش (اول) کو ہتھیار ڈالنے ماوند طلب کیا گیا۔ ماوند تو جل چکا تھا۔ اور اس کے مکین پہلے ہی اسے خالی کر چکے تھے اور اپنے اہل وعیال شمال میں چمری علاقے کے بڑے پہاڑوں میں منتقل کر چکے تھے۔ خیر بخش نے اپنے سب سے معتبر مشیر وزیر سومرانڑیں کو ساتھ لیا۔ اور ماوند کے جنوب میں سور (SORE) کے مقام پر 8 اپریل 1918 کو جنرل ہارڈی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے (1)۔

اس ہتھیار ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ یہ ہتھیار سارے قبیلے کی طرف سے ڈال رہا تھا۔ اس لیے کہ انگریز کے فیصلے کے مطابق قبیلہ کے ذیلی فرقوں کے وڈیرے انفرادی طور پر ہتھیار سردار کے سامنے ڈال چکے تھے، یا اُس کے اعتماد میں آ چکے تھے۔ یوں سامراج نے کمال عقلمندی کے ساتھ مری قبیلے کو زیر بھی کر لیا اور سردار کی حیثیت کو بھی بہت مستحکم کر دیا۔

انگریز ہمارے اکابرین کو 10 اپریل کو ''ترمنتر'' ساتیں والی'' کے راستے کاہان ساتھ لے گیا۔ یہ لوگ چپی کچ کے راستے 19 اپریل کو کاہان پہنچے۔

وہاں اُس نے دوسرے مری وڈیروں کو بھی طلب کر رکھا تھا اور تین مطالبے کیے:

1۔ مانو کہ میں تمہارا بادشاہ

2۔ میں کسی کو پھانسی دوں تو مجھے اختیار

3۔ تاوان مانگوں گا۔ میں اپنے نقصان مانگوں گا، تمہارا نقصان نہ دوں گا۔

جون 1918 میں ایک سپیشل جرگہ ہوا جس نے فیصلہ کیا کہ:

1۔ سرداراور اس کے معتبروں کو دیئے گئے سارے خطابات واپس لیے جائیں گے۔

2۔ اب مری قبیلے سے چراگاہ کا ٹیکس بھی لیا جائے گا۔

3۔ جنگ میں قبضہ کیے گئے اُس کے سارے ہتھیار ضبط ہوں گے۔

انگریز نے مری اور کھیتران کو اس جنگ کی پاداش میں سزا کا جو حکم نامہ جاری کیا تھا اُس کی کاپی ہم ڈھونڈ سکے ہیں۔

''نواب صاحب اور مری کے سرکردہ افراد!

''مری نے ایک عظیم جرم کیا ہے۔ حکومت نے آپ پر بڑی مہربانیاں کی ہیں اور آپ لوگوں نے وفادار رہنے کی یقین دہانی کرائی تھی جس کی کہ موجودہ دباؤ کے دنوں میں مزید ضرورت تھی۔ مگر آپ لوگوں نے یہ سب کچھ یکسر فراموش کرتے ہوئے حکومت کے خلاف کھلی اور سرگرم دشمنی کا رویہ اختیار کیا۔ آپ لوگوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ لوگوں کی شکایات (اصلی یا خیالی) کیا ہیں؟۔ آپ لوگوں نے گمبذ پر دشمنی کا مظاہرہ کیا اور جب پولیٹیکل ایجنٹ آپ لوگوں کی شکایات معلوم کرنے آیا تو آپ لوگوں نے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ کے قاصد کو زخمی کیا اور اس کی ہتک کی۔ اور بعد میں رات کو پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کے محافظ پر غدارانہ شب خون مارا۔ اگر اس کے آدمی بہادری نہ دکھاتے تو ان کی پوری پارٹی تباہ ہو جاتی۔۔۔۔ آپ لوگوں نے کوہلو تحصیل اور ہوسٹری کے تھانے لوٹے، ٹیلیگراف لائنیں تباہ کیں۔ ٹرینوں پر حملے کیے، نہتے دیہاتیوں کو لوٹا اور آخر میں کھیتران قبیلے سے مل گئے جنہیں آپ لوگوں کی بیماری لگ گئی اور انہوں نے بارکھان

تحصیل لوٹ لی اور اُسے تباہ کر دیا۔ اور فورٹ منرو کا تھانہ اور ڈاکخانہ توڑ دیا اور پنجاب کے علاقے میں بیواٹہ پوسٹ جلا ڈالا۔ ان تمام وارداتوں کے بعد حکومت کے پاس سوائے اِس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ آپ لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کر دے۔ آپ لوگوں کو اب سبق مل گیا اور گورنمنٹ کی قوت کا اندازہ ہو گیا۔۔۔۔ اب جبکہ سب کچھ ہو گیا تو حکومت آپ کو اپنی اولاد سمجھتی ہے، دشمن نہیں۔ مگر سرحد میں امن کی خاطر اور مری قبیلے کے ڈسپلن کی خاطر حکومت ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور اس طرح کے جرائم پر سزا دیے بغیر نہیں چھوڑ سکتی۔

حکومت کی طرف سے آپ لوگوں پر مندرجہ ذیل شرائط لاگو کی جاتی ہیں:

اول:۔ مری وہ سارا مال فوری طور پر واپس کر دے جو اس نے بارکھان اور کوہلو تحصیلوں کے خزانوں سے لوٹا۔

دوئم:۔ اپنے چیف کے توسط سے حکومت کی یا حکومت سے لی ہوئی ساری بندوقیں، اسلحہ اور گولہ بارود واپس کریں گے۔ اس بغاوت میں جو کچھ ہاتھ لگا وہ واپس کر دیں گے۔

سوئم:۔ اپنے علاقے کے اندر یا باہر سرکاری ملکیت، ریلوے فرنیچر، ٹیلیگراف لائن کو جو نقصان پہنچایا اس کی تلافی کریں گے۔

چہارم:۔ کھیتران نے پنجاب اور بلوچستان میں سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کا جو ہرجانہ ادا کیا، مری اس میں اپنا حصہ ادا کرے گا۔

پنجم:۔ وہ لڑائی میں حصہ نہ لینے والوں کو قتل کرنے، قیدی بنانے، زخمی کرنے یا لوٹنے کا معاوضہ ادا کریں گے۔

مزید براں آپ کے رویے کے پیش نظر مندرجہ ذیل شرائط ہیں:۔

اول:۔ بغاوت میں شامل ہونے والے سارے مریوں کو دیئے گئے اعزازات اور خطابات واپس لیے جاتے ہیں۔ مری چیف سے واپس لیے جانے والے اعزازیہ ہیں۔

سی آئی ای (کمپینین آف انڈین ایمپائر) ''نواب'' اور ''خان بہادر''۔

مڑ زیھان سے ''خان صاحب'' اور شہذاذ باولہاں زئی سے ''خان صاحب'' کا خطاب واپس لیا جاتا ہے۔

دوئم:۔ یکم مارچ 1918 سے تمام ''معافی'' (مالیہ وغیرہ سے استثنا) منسوخ کی جاتی ہیں۔ ان میں مری چیف کی پرائی اور گلوگوزو کی نجی زمینوں کی ''معافی'' بھی شامل ہیں۔ بہرحال حکومت چیف کو جوار کے پندرہ خروار سالانہ کا گرانٹ جاری رکھے گی۔ اسی طرح چیف اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے کوہلو میں زرکون سے مری کی خریدی زمین پر ہر موسم بہار کی فصل پر اناج کا سرداری الاؤنس لیتا رہے گا۔

سوئم:۔ کوئٹ منڈاہی کی زمینوں کی فصل پر حکومت اپنا حصہ بارہویں سے چھٹے حصے تک بڑھاتی ہے، (مستقل طور پر)۔

چہارم:۔ کوہلو تحصیل کی مری کی زمینوں کی فصل پر سرکاری حصہ دس سال تک بارہویں سے بڑھا کر چھٹا کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ ''مرنج معاہدے'' کی شق نمبر 3، دس برس کے لیے معطل کی جاتی ہے۔ مری کی ملکیت میں جانوروں کے چَرانے کا ٹیکس دس سال تک پورے ریٹ پر لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''مرنج معاہدے'' کی شق نمبر 4 دس برس تک معطل کی جاتی ہے۔

پنجم:۔ مری پچھتر برنج لوٹ (Breach-loading) بندوقیں حکومت کے حوالے کر دے گا۔

ششم:۔ کوہلو اور کاہان میں حکومت کی طرف سے تعمیر کردہ سارے کچے ہوائی اڈوں (Aerodromes) کی حد بندی اور مرمت مری کے خرچ پر ہوگی اور جس زمین پر یہ Aerodrome بنے ہوئے ہیں وہ بلا معاوضہ حکومت کی ہوگی۔

ہفتم:۔ بابر کچھ سے براستہ کوئٹ منڈاہی، میرداد، چاکر تنک، بڑیر کچھ، ماوند، منجھر اتا کوہلو خچروں سے چلانے والی ریڑھیوں کی سڑک مری کے خرچے پر بنائی جائے گی۔

انگریز نے مری پر 3,67,000 روپے تاوان ڈال دیا (1,36,000 روپے جنگ کا نقصان اور 2,31,000 دیگر نقصانات اور لوٹ مار کے عوض)۔

لڑائی میں مری سے چھینا گیا سارا اسلحہ ضبط کیا گیا۔ کوہلو اور کوئٹ منڈاہی پر ٹیکس بھی بڑھا دیا گیا۔ کوئٹ منڈاہی دوبارہ کہیں جا کر دوئم 1922 میں قبیلہ کو مل گیا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ حکومت رحمدل ہے اور جب اس کے بچے صحیح معنوں میں پشیمانی ظاہر کریں تو اپنا غصہ پی جانے میں بہت تیز رفتار ہے۔ حکومت کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ آپ کے علاقے سے بدبختی کے بادل چھٹ جائیں۔ لہذا اب یہ آپ لوگوں پر ہے کہ اپنے آئندہ کے برتاؤ سے ثابت کریں کہ آیا حکومت اپنی سابقہ مہربانی کے ساتھ آپ لوگوں سے پیش آئے'' (2)۔

انگریز نے بالکل اسی طرح کا ایک مراسلہ کھیتران کو بھی بھیجا۔ سزائیں وغیرہ تقریباً وہی تھیں جو مری کیے لیے تھیں۔ مگران کے ''جرائم'' (ہماری نظر میں ''کارنامے'') کی تفصیل ذرا مختلف ہے۔

بلوچ جدوجہدِ آزادی کو نظر انداز کرنے والوں کو ہم ہر جنگ ایک ایک کر کے بتاتے جا رہے ہیں تاکہ ہماری قومی تحریک کا مکمل نقشہ ابھر کر سامنے آسکے۔ ہم کھیتران قبیلہ کے خلاف انگریز کے فیصلے کے ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں۔

''سردار بختیار خان کھیتران اور کھیتران کے معتبرین!

''مجھے حکومت کے خلاف آپ لوگوں کی مذموم کارروائیوں کی طویل کہانی کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھیتران قبیلے کے بڑے حصے نے شروع ہی سے مری بغاوت میں اس کے ساتھ کھلی ہمدردی دکھائی۔ تحصیل بارکھان کی دفاع کے لیے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے جمع کیے ہوئے کھیتران 22 فروری ہی کو ایک ساتھ فرار ہوگئے جبکہ محض دو ہی دن قبل مری نے گنبذ پر حملہ کر دیا تھا۔ یکم مارچ کو رکھنی کے جمعدار مصری خان نے کھلی بغاوت کی اور مریوں سے جا ملا۔ وہ بہت سے کھیتران ساتھ لے گیا اور فورٹ منرو کے قریب پوسٹ آفس اور تھانہ جلا دیئے۔ اس نے تین مارچ کو تین بنیے مار دیے۔ پانچ مارچ کو مری کے پہنچنے سے قبل ہی، پولیس کے چلے جانے کے بعد، بہت سے کھیتران ملٹرل کر تھانہ میں گھس گئے اور جو کچھ ملا تباہ کر دیا، یا چوری کیا۔ اسی روز مری اور کھیتران نے مل کر مصری خان اور وزیر ہان مری کی قیادت میں حکومت کا خزانہ لوٹ لیا اور تحصیل کو جلا دیا۔ 7 مارچ کو کچھ کھیتران نے بغاوت میں موسیٰ خیل قبیلے کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کنگری ریسٹ ہاؤس کو لوٹ لیا۔ گیارہ مارچ کو مری اور کھیتران نے مل کر پنجاب کے علاقے میں بیواٹہ پوسٹ کو جلا ڈالا اور برطانوی ایڈوانس کو روکنے کے لیے فورٹ منرو کے قریب جمع ہوگئے اور پندرہ مارچ کو انہوں نے فورٹ منرو کے مقام پر برطانوی فوجوں پر حملہ کر دیا مگر شکست کھا کر بکھر گئے۔

''۔۔۔۔۔سردار کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ مشکل اور جذباتی وقت پر اپنے قبیلے کو کنٹرول کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اپنے قبیلے یا حکومت کے لیے کسی کام کا نہیں ہوتا۔۔۔'' (3)

(قارئین آپ سمجھے سردار کی اصل ڈیوٹی؟۔ انگریز سے لے کر آج کی سرکار تک؟)

ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ کھیتران کی زمین بہت زیادہ زرخیز زمین ہے۔ ان کے نمایاں آدمیوں کو لینڈ ریونیو میں ''معافی'' تھی۔ کھیتران عوام الناس پر لینڈ ریونیو نقدی کی صورت میں نہ تھا بلکہ مجموعی پیداوار کا چھٹا حصہ اناج کی صورت تھا۔ انگریزوں نے جو سزائیں دیں وہ تقریباً مری قبیلے پر عائد کردہ سزاؤں جیسی تھیں۔ اس لیے انہیں دُھرانے سے قاری کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔

***

عزیز بگٹی کے بقول اُس کے ماموں نے اُسے ایک عجب مکالمہ سنایا جو اے جی جی اور خیر بخش مری اول کے بیچ ہوا تھا۔ سبی کے شاہی جرگہ میں ہوا تھا جہاں عزیز جان کا

ماموں بھی شریک تھا۔ اُس کے بقول: ''سبی کے شاہی دربار میں ایجنٹ گورنر جنرل نے نواب خیر بخش مری کے لئے عام معافی اور خطابات کی بحالی کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' نواب صاحب ہم کو یقین ہے کہ آئندہ آپ سرکارِ برطانیہ کے خلاف لڑائی نہیں کریں گے''۔

اس پر نواب خیر بخش مری نے لاٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے برجستہ جواب دیا کہ'' لاٹ صاحب مجھے بھی امید ہے کہ آئندہ انگریز سرکار مری قبیلہ سے فوجی بھرتی نہیں مانگے گی''۔(4)

ریفرنسز

1-آرکائیوز آف بلوچستان'' سال1918، فائلXXIII۔ Raids، نمبر5 جلد نمبر1، صفحہ نمبر3۔

2-آرکائیوز آف بلوچستان'' سال1918، فائلXXIII۔ Raids، نمبر5 جلد نمبر1، صفحہ نمبر3۔

3-ایضاً صفحہ 72۔

4۔بگٹی ۔عزیز۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ مارچ2013۔صفحہ 52۔

6۔ بلوچ سامراج دشمنی کی وجوہات(1)

انگریز کے خلاف بلوچ کی طویل جنگ آزادی نے بلوچ سامراج دشمنی کو نسلوں تک پکا کردیا۔ اور یہ ان کے جینز میں شامل ہوگئی۔

بلوچ سامراج دشمنی کو انگیخت وانگیز کرنے میں اہم عناصر یہ تھے:

1۔ انسان کہیں کا بھی ہو، اپنی سرزمین پہ قبضہ کو ناپسند کرے گا۔ بلوچ اپنے کونے میں ہزاروں برس سے ایک اچھی بھلی زندگی گزارر ہا تھا۔ اس پر کم از کم کسی بیرونی طاقت کی حاکمیت نہ تھی۔ ایسے آزاد منش لوگوں کو غلامی کہاں برداشت ہوتی ؟۔

2۔ انگریز تو ایسے خارجی لوگ تھے جن کا کلچر، مذہب، رنگ ولباس سب کچھ اجنبی تھا۔

3۔ یہاں سرداریت کے نام سے فیوڈل پیداواری رشتے قائم تھے۔ فیوڈل ازم میں عوام کا استحصال ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہوتی مگر یہاں فرق یہ آیا کہ استحصال کی مقامی فیوڈل صورت نے سمندر پار سے آئے ہوئے قبضہ گر کی چاکری قبول کی۔ یعنی فیوڈل نے کپٹلسٹ سے عوام کے خلاف اتحاد بنالیا۔

چنانچہ فیوڈلزم کے ستائے ہوئے لوگ آٹومیٹک طور پر اب سامراج دشمن بھی ہوگئے۔ اور اگر آپ سامراج دشمن تھے تو پھر خود بخود فیوڈل وسردار دشمن ہونا تھا۔

4۔ انگریز اعداد وشمار، کھاتہ، تحریر، سند اور دستاویز پہ چلتا تھا جبکہ ہم زبان، گواہ اور فطرت

کی مطابقت میں چلتے تھے۔ہم خود کو، اپنی چھونپڑی کو، اپنے مال مویشی کو، اپنے قطعہِ زمین کو نمبر اور کھتونی نمبر دینے پہ آمادہ نہ تھے۔

5۔ ایک اور تضاد بھی تھا۔ وہ یہ کہ بلوچستان میں تو فرسودہ اور روایتی ادارے تھے ۔سردار، سردار کے لیویز ،اور رسم ورواج۔مگر اس کے برعکس انگلینڈ جدید کالونیل ریاستی ادارے لایا تھا۔

6۔ ہماری سامراج دشمنی کی چھٹی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی طرف سے بھاری ٹیکس لگائے گئے تھے۔یہ ٹیکس خان، جام اور سردار کے بھاری ٹیکسوں کے علاوہ تھے۔

7۔ ٹیکسوں کے علاوہ عام لوگوں سے جبری مشقت بھی لی جاتی تھی۔

8۔ ان سب تضادات پہ بھاری یہ بات ہوئی کہ پہلی عالمی جنگ چھڑی تو دور دراز محاذوں پر لڑنے کے لیے بلوچ سپاہیوں کی جبری بھرتی شروع کردی گئی۔

9۔ نویں بات یہ تھی کہ بلوچ کے پاس روایتی جنگجوئی کی شاندار نفسیات موجود تھی۔اور ماضی میں غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف فوری مسلح مزاحمتوں کی شاندار داستانیں موجود تھیں۔

10۔ انگریز سامراج کے خلاف بلوچ جدوجہد آزادی اُن عالمی حالات سے بھی سخت متاثر ہوئی جو 1905 کے روسی انقلاب سے وجود میں آئے۔ان میں ایران، ترکی، انڈیا اور افغانستان میں انقلابی تبدیلیاں شامل تھیں۔اور پھر 1917 کا عظیم اکتوبر سوشلسٹ انقلاب تو اتنے بڑے اثرات لایا کہ اُس پہ ایک الگ چیپٹر لکھنے کی ضرورت ہے۔

اِن بڑے اور بنیادی تضادات کا ایک ہی نتیجہ نکلنا تھا: جنگِ آزادی۔اور تاریخ گواہ ہے کہ ہم نہایت شستہ اور شائستہ جنگِ آزادی لڑے۔

کبھی کبھی حیرانگی ہوتی ہے کہ اس قدر دلیر اور پاکیزہ جنگِ آزادی لڑنے کے باوجود ہم جنگ کیوں ہار گئے۔مگر پھر سوچتا ہوں کہ پورے ہندوستان کو فتح کرنے والے اُس زمانے کے سپر پاور کی سٹینڈنگ آرمی کے خلاف ہمارا ہارنا بنتا تھا۔بھئی ایک وقت میں محض دو ڈھائی قبائل کی ایک خودرو اور ہنگامی طور پر جمع شدہ ہجوم کی طرف سے فرسودہ ہتھیاروں اور پسماندہ وار ٹیکٹیکس سے یہ لڑائی جیتی جا بھی نہیں سکتی تھی۔ہم تو باہمی قبائلی جنگوں میں ماہر ہوا کرتے تھے۔ایسی جنگوں کے، جن میں دونوں متصادم قبیلوں کے اصول وغیرہ معلوم بھی تھے اور کم وبیش یکساں بھی۔وہاں جنگ کے میدان میں سردار، شاعر، اور کرامت کے زور سے دشمن کی تلواروں کو ناکارہ بنانے والے تیغ بند اور اپنے بھگوڑوں کو قتل کرنے کے لیے مخصوص شخص کے فرائض معلوم ہوتے تھے۔مگر یہاں انگریز کے ساتھ اب مقابلے میں تلوار نہیں بندوق، توپ اور ہوائی جہاز تھے۔اب مدمقابل کوئی بلوچ قبیلہ نہ تھا بلکہ ملٹری اکیڈمیوں کے تربیت یافتہ ملٹری سائنس کے گریجوئیٹ، باقاعدہ سٹینڈنگ آرمی تھی۔جنگ کے طریقے مختلف تھے۔قبائلی جنگوں میں سردار کمانڈر ہوتا تھا اور میدانِ جنگ میں اُسی کا حکم چلتا تھا۔مگر یہاں ہجوم میں ہر فرد اپنا کمانڈر خود تھا۔اسے صرف انفرادی قبائلی بہادری دکھانی تھی۔

پھر، ایک تو بلوچ کی زیست بھی ایسی تھی، نہ وقت ملا اور نہ انگریز نے موقع دیا کہ کوئی گوریلا باقاعدہ دستے بنتے اور ایک منصوبہ بند دیرپا لڑائی ہوسکتی۔کوئی سیاسی پارٹی بھی موجود نہ تھی جو عوام کی مقبول سامراج دشمنی کو ایک ہی پرچم میں متحد ومتحرک کرسکتی۔

انگریز نے اپنے کالونیل کپٹلزم کو بہت کامیابی کے ساتھ مقامی فیوڈل رشتوں کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔وہ بھی ایسی صورت میں کہ بقیہ بلوچ عوام الناس نہ منظّم ومتحد تھے، نہ سماجی معاشی اور سیاسی طور پر ارتقایافتہ۔یوں ایک بہت خوردو، یک قبیلوی مزاحمت، ہماری زندگی سے آشنا ہمارا اپنا مقامی فیوڈلزم اور ملٹری سائنس کے ماہر کالونیل کپٹلزم کی متحدہ قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔

یہی نہیں بلکہ انگریز نے بعد میں بھی یہی حکمت عملی جاری رکھی کہ بلوچ کے قومی ساخت میں ڈھل جانے کے قدرتی ارتقا میں جمود برقرار رکھی جائے۔اُس نے قبائلیت اور سرداریت ہی کو مضبوط کیا اور کپٹلزم کو قبائل میں آنے نہ دیا۔اگر منہ زور کپٹلزم بے قابو ہو بھی

جاتا تو بھی انگریز اُسے شمال اور شمال مشرقی بلوچستان میں جگہ دیتا تھا۔ بقیہ بلوچستان کو سختی سے اس نے فیوڈل اور برادری نظام والے رشتوں ہی میں رہنے دیا۔

ریفرنسز

1۔ حبیب جالب۔ بلوچ سٹیٹ ہُڈ اینڈ نیشنلزم۔ 2006۔ پرکانی ہاؤس سریاب روڈ کوئٹہ۔ صفحہ 170۔

7۔ باکو کانفرنس

مصری خان کھیتران سردار کا بھائی تھا اور رکھڑیں پوسٹ پر لیوی تھانیدار تھا۔ انگریز کے بقول وہ ''بہت کیریکٹر اور اثر والا شخص تھا''۔ یہ بھی انگریز ہی کی اطلاع ہے کہ وہ بہت سال پہلے بھی کابل میں پناہ گزیں رہا تھا اور 1905 میں وہاں سے واپس آ گیا تھا۔

اب اس نے 27 فروری 1918 کو لیویز کا بڑا عہدہ چھوڑ دیا اور یکم مارچ کو انگریز کے خلاف وطن کی آزادی کی جنگ میں مصروف مری بہادروں سے جاملا۔ وہ فورٹ منرو اور ماوند کی لڑائیوں میں شامل رہا۔ اس کے بھائی سوبدار خان نے بھی ان جنگوں میں حصہ لیا۔ آخری ماوند جنگ میں جب بلوچوں کو شکست ہوگئی تو مصری خان بگٹی علاقہ چلا گیا۔ اور پھر اپنے بھائی کے ہمراہ کندہار چلا گیا۔ اور وہاں سے سردار عبدالقدوس خان کے ساتھ۔ کابل چلا گیا(1)۔

اُس وقت کابل میں سوویت سفیر کا نام ''سُورِتس'' تھا۔ اُس نے ایک رپورٹ میں اپنے احکامِ اعلیٰ کو بتایا کہ ''ہندوستان بھر سے باغیوں کے گروہ افغانستان پہنچ رہے ہیں۔ یہ سب لوگ انگریز سے اپنے وطن کی مکمل آزادی چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اکتوبر انقلاب کو اپنی آزادی کی تحریک کے لیے اچھا نظریہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ خود سوویت یونین کو تفصیل سے سمجھنا بھی چاہتے ہیں اور سوویت یونین دیکھنا بھی چاہتے ہیں تاکہ ظلم و جبر کے خلاف اس ملک کی فتح مند جدوجہد کے تجربات سے سیکھیں اور اپنی آزادی کے حصول میں اُس کی امداد سے فائدہ اٹھا سکیں(2)۔

یوں مصری خان اپنے بھائی اور رفیق سوبدار خان کے ساتھ سوویت یونین چلا گیا۔ ہمیں یہ اندازہ نہیں کہ مصری خان 1917 کے سوشلسٹ انقلاب سے نظریاتی طور پر متاثر تھا، یا وہ محض سامراج دشمنی کی جنگ میں ایک زبردست حمایتی کے بطور اُس ملک کو اچھا سمجھتا تھا۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرے کئی باغیوں کی طرح محض افغانستان فرار ہوا ہو۔ اور وہاں سے اسے سوشلسٹ انقلاب کی کشش نے کھینچا ہو اور وہ وہاں سے وہ سوویت یونین گیا ہو، اور وہاں کمیونسٹ بنا ہو۔

لینن نے کہا تھا کہ غلام ہندوستان کے لوگ ''ایک ستارے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سوویت ریپبلک کے ستارے کی جانب۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ سوویت ریپبلک نے

امپیریلسٹوں کے خلاف لڑنے کے لیے زبردست قربانیاں دی ہیں، اور یہ کہ اِس نے سخت ترین آزمائشوں میں ثابت قدمی دکھائی'' (3)۔

واضح رہے کہ تاریخ میں پہلی عالمی جنگ کے ہم پلہ، یا اُس سے کئی گناہ زیادہ اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ روس میں سوشلسٹ انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب نے نہ صرف اُس ملک کو ''انسان'' بنا دیا بلکہ وہ ملک اب بین الاقوامی سیاست میں سامراج مخالف قوتوں کا سربراہ بن کر ابھرا۔ بلوچ آزادی کی تحریک کو ایک نیا اور فیصلہ کن اتحادی مل گیا۔

سوویت یونین میں ان کی سرگرمیوں کے متعلق بہت عرصے تک ہمیں کچھ معلومات نہ تھیں ۔ بس صرف عنایت اللہ بلوچ (1987) کی ایک سطر موجود تھی کہ مصری خان نے 1920 میں ''اقوام مشرق کی باکو کانفرنس'' میں شرکت کی تھی۔ بقول ایچ جی ویلز، باکو کانفرنس میں سفید فام، سیاہ فام، رنگدار، اور پیلے لوگوں، ایشیائی لباس اور حیرتناک ہتھیاروں کا ایک بہت دلچسپ اجتماع تھا۔۔۔ایک عظیم اجتماع جس میں انہوں نے کیپٹلزم اور برطانوی امپیریلزم کے خلاف نہ ختم ہونے والی نفرت کی قسم کھائی۔

یکم ستمبر 1920 ''پیپلز آف دی ایسٹ'' میں آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں جمع ہوئے 3000 ڈیلیگیٹ تھے۔ اس میں بلوچ بھی تھے۔

کانفرنس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی بورژوا خاصیت کو تسلیم کرتے ہوئے نیشنل لبریشن تحریکوں کی حمایت کی جائے۔ باکو کانفرنس بلوچ کے لیے تو ایک نیا باب تھی۔ اس کانفرنس نے بلوچ کی 20 ویں صدی کی سامراج دشمنی، بالخصوص ہماری شہری تحریک کو منظّم کیا اور اسے دنیا کی دیگر قومی آزادی کی تحریکوں سے جوڑا۔

ابھی حالیہ برسوں میں مصری خان کے بارے میں ہمیں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ اُس زمانے کے انگریز افسروں کے آپسی خط و کتابت کی پوری فائل کوئٹہ آرکائیوز سے ہمیں دستیاب ہو گئی ہے۔ گو کہ وہ خطوط سوویت یونین میں اُس کے قیام کی زیادہ تفصیل نہیں دیتے مگر پھر بھی اچھی خاصی معلومات مہیا ہوتے ہیں۔

اِن آرکائیوز میں درج ہے کہ مصری خان اور اس کا بھائی افغانستان سے سوویت یونین چلے گئے۔ وہاں کچھ سال گزارنے کے بعد وہ واپس موجودہ خیبر پشتونخواہ کے سرحدی قبائلی علاقہ تیرہ میں رہے۔ جہاں سے انگریز کے ساتھ اُن کے طویل مذاکرات ہوئے۔ یہ سارے مذاکرات اور اُن کی پیش رفت پشاور اور کوئٹہ کے انگریز افسروں نے ایک دوسرے کو ٹیلیگرام اور خطوط میں لکھے۔

کوئٹہ سے انگریز افسر مسٹر ڈیو نے 15 جنوری 1922 کو پشاور میں انگریز ملٹری انٹیلی جنس چیف کو لکھا:

''مائی ڈیئر سنڈی

میں خان بہادر سربلند خان کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تا کہ وہ مصری خان اور اس کے بھائی سوبدار خان کھیتران کو واپس لا سکے جو ڈینیز کہتا ہے کہ آپ کے رابطے میں ہیں۔ میرے دل میں اُن کے خلاف بالکل کچھ نہیں ہے۔ مصری خان میرا ایک خاص دوست ہوا کرتا تھا۔ اور وہ ایک بہادر سپاہی ہے، مگر جلد باز شخص ہے۔ مگر میں اُس کا ذمہ لیتا ہوں اور قبیلہ بھی۔ اُس کے خلاف بالکل کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ان دونوں احمقوں کو دوبارہ واپس لینے کا امکان دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ وہاں ایڈمنسٹروں کے لیے طاقت کا منبع بنیں گے۔ یہ سب کچھ اب ختم ہو چکا اور تصفیہ ہو چکا۔ کوئی بھی اس کے خلاف کوئی عداوت نہیں رکھتا۔

ہمیشہ آپ کا

اے۔بی۔ڈیو''

انگریزوں کے بیچ اسی مراسلہ نگاری میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ عبدالرب نامی ایک انڈین کے ساتھ تاشکند چلے گئے (4)۔ یہ عبدالرب، دراصل، انڈین ریولیوشنریز کی کمیونسٹ مخالف پارٹی کا سربراہ تھا۔(5)۔

انہی برطانوی ذرائع کے مطابق مصری خان کمیونسٹ تھا، اور نظریات میں اپنے بھائی سے زیادہ گہرا کمیونسٹ تھا۔ مگر انگریز بدمعاش نے اس فقرے کو یوں بیان کیا تھا: ''اس نے بلاشبہ بہت بالشویک پیسہ کھایا ہے''۔(6)۔

تاشکند جانے والی بیس رکنی پارٹی میں بلوچستان کے صرف یہی دو بھائی تھے۔ باقی لوگ پشاور، راولپنڈی، لاہور اور کوہاٹ کے تھے۔ عبدالرب کے ساتھ تاشکند جانے والی پارٹی مندرجہ ذیل ہے۔

1 ۔سوبدارخان، 2۔سید امین ، 3۔کوہاٹ کا مقدم شاہ، 4۔بلوچستان کا مصری خان، 5۔کوہاٹ کا محمد ابراہیم 6۔پشاور کا فضل قادر، 7۔اشور، 8۔پشاور کا عمر بخش، 9۔پشاور کا میاں محمد، 10۔پشاور کا مردان شاہ، 11۔پشاور کا محمد خان، 12۔پشاور کا فتح حسین، 13۔پشاور کا محمد حسین، 14۔ لاہور کینٹ کا نظام الدین، 15 ۔راولپنڈی کا افسار، 16۔ پشاور کا غلام جیلانی پنجابی، 17۔زرداد خٹک، 18۔علی شاہ راولپنڈی، 19۔عبدالرب، 20۔اچاریہ(7)۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی جانب سے سوویت آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں ''مشرق کی اقوام کانگریس''، ستمبر 1920 میں منعقد ہوئی۔ اس کانگریس کی سٹینوگرافک رپورٹ کے مطابق کانگریس میں ایشیا اور یورپ کے 1900 ڈیلیگیٹس نے شرکت کی۔ باکو کانفرنس میں پانچ رکنی بلوچ وفد کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل (کمنٹرن) کی اس کانگریس نے کالونیل ''مشرق'' میں انقلابی نیشنلسٹ تحریکوں کی مدد کا وعدہ کیا۔ کانگریس نے ''اقوام مشرق کا ایک مینی فیسٹو'' منظور کیا۔

یہ کانگریس یکم ستمبر 1920 کو انٹرنیشنل کے ترانے سے شروع ہوئی۔ اور سات ستمبر تک چلی اور اس کے سات سیشن ہوئے۔ اس کانگریس میں امریکہ کمیونسٹوں کی نمائندگی جان ریڈ نے کی۔

''انڈین انقلابیوں میں سے ایک 42 سالہ سوبدار خان وہاں روسی انقلاب کا مطالعہ اور اس سے حاصل سبق سے اپنے ہاں انقلاب کے طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ باکو میں''(8)۔

ان فراریوں میں بلوچ قبائل سے دو بھائی تھے۔ پرسٹس کی اس کتاب نے لکھا کہ 18-1917 میں ''مصری خان نے دس ہزار پر مشتمل قبائلی باغی فوج کی قیادت کی تھی۔۔۔ انگریز، قبائل کی اس بہادرانہ مزاحمت کو دبانے میں کامیاب ہوا(9)۔

وہاں انہیں شارٹ کورس کرائے جاتے۔ لیکچروں کے عنوانات ''زمین اور انسان کی ابتدا''، کلاس سٹرگل کی روح، جغرافیائی اطلاعات وغیرہ(10)۔

پروگرام سوشلزم کا قیام تھا۔ مثال بلوچستان کی دی گئی جہاں ''زمین شخصی ملکیت میں نہیں ہے، بلکہ یہ پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہے جسے ہر سات یا دس سال بعد دوبارہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہاں کوئی ٹیکس نہیں، کوئی باج نہیں ہیں۔۔۔ اس نظام اور کمیونزم میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے''۔ کرنا صرف یہ ہے کہ ''فصل کو بھی ٹرائبل کونسل کے حوالے کیا جائے۔ اور اسے مساوی طور پر قبیلے کے افراد میں تقسیم کیا جائے''۔(11)

لینن کے تھیسز کے ایک اہم نکتے میں کمیونسٹوں سے کہا گیا تھا کہ وہ مشرقی ملکوں میں بورژوا ڈیموکریٹک لبریشن موومنٹ کی حمایت کریں۔ اس کا خیال تھا کہ ایشیا کی کالونیوں اور منحصر ممالک میں فیوڈل یا پدرسری والے رشتے حاوی ہیں(12)۔

کانگریس نے دیگر مشرقی زبانوں کے علاوہ بلوچی زبان میں بھی کمیونسٹ لٹریچر کے

ترجمے اور اشاعت کی منظوری دی۔

اس خطے میں کمیونسٹ تحریک کی بنیاد رکھنے کی غرض سے ہندوستانی وفد کے سربراہ آچاریہ نے مصری خان کھیتران سے تفصیلی گفتگو کی۔

انگریز نے لکھا کہ ''مصری خان بالشویزم میں سوبدار خان سے بھی زیادہ گہرا شامل رہا ہے، اور ایک سال گزرا (یعنی 1921 کی شروعات میں) کہ وہ چھ کی پارٹی میں سے ایک تھا، جس نے تاشقند چھوڑا تا کہ سرحد پر برطانیہ مخالف پروپیگنڈا منظم کرے۔ ان کا مشن افغان مخالف بھی تھا۔ انہیں کابل میں جیل ڈال دیا گیا تھا اور ابھی حال میں رہا کیا گیا'' (13)۔

سوبدار اپنے بیان میں انگریز افسر کو بتاتا ہے:

''مجھے اور دوسروں کو سرحد کو لے جانے کے لیے بالشویک پروپیگنڈہ لٹریچر اور پیسہ دیا گیا۔ چونکہ ہم واپس انڈیا جانا چاہتے تھے لہذا ہم نے یہ سندیسا وصول کیا۔ ہم پہلے براستہ آندی جان اور پامیر بھیجے گئے، مگر واپس ہونا پڑا اس لیے کہ اسی طرح کا ایک پچھلا مشن برف میں گم ہو چکا تھا۔ ہمیں پھر پلِ خاتون کے راستے بھیجا گیا اور ہم تھانہ ذوالفقار کے قریب ایک چھ نفری چھوٹے پوسٹ پہ داخل ہوئے۔ ہمیں کراباغ کے حاکم عثمان خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہمیں ہرات بھیجا گیا اور وہاں نگرانی میں تین ماہ تک رکھا گیا اور پھر کابل بھیجا گیا۔ امیر الاساس سے جس قدر ہوسکا اس نے عبدالرب کے اکسانے پر ہمیں تکلیف پہنچائی۔ ہمیں کابل میں 7 یا آٹھ ماہ نگرانی میں رکھا گیا۔ پھر امیر نے ہمیں رہا کر دیا۔ مگر شجاع الدولہ نے ہمیں اس وعدے پر جانے دیا کہ ہم تیرہ میں برطانیہ مخالف پروپیگنڈہ کریں گے۔ ہم یکم دسمبر 1921 کو کابل سے روانہ ہوئے'' (14)۔

مصری خان نے ویسے تو واپس علاقہ لانے کے لیے انگریز کی پیشکش قبول تھی۔ وہ صرف اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ وہ اپنے گھر میں تو نظر بند ہونے کو تیار تھا مگر کسی ایسی جگہ بند نہیں ہونا چاہتا تھا جہاں ''ماحول اور آس پاس عجیب اور ناموافق ہوں''۔

پشاور کے افسر نے کوئٹہ کے افسر کو تار دیا کہ ''سوبدار خان پشاور میں ہے'' اور یہ بھی کہ محفوظ سلوک پر وہ اسے 25 جنوری (1922) کو بلوچستان سے انگریز کے بھیجے ہوئے آدمی کے حوالے کرے گا'' (15)۔

چنانچہ سوبدار خان، بلوچستان کے انگریز کو مارچ سے پہلے وصول ہو چکا تھا۔ جبکہ مصری خان ابھی تک تیرہ میں تھا اور اُس سے مذاکرات جاری تھے۔

لگتا ہے کہ تیرہ میں وہ لوگ پناہ گزیں نہ تھے بلکہ پورے گروپ کے ساتھ کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ یہ قیاس پشاوری انگریز افسر جان میفی کے 17 مارچ کو کوئٹہ اے۔ جی۔ جی کو بھیجے گئے ٹیلیگرام میں موجود ایک فقرے سے لگایا جاسکتا ہے: ''یہ ذکر کردوں کہ میں نے مصری خان اور سوبدار خان کے ساتھیوں میں سے ایک کو ضمانت دینے پر اپنے گھر واپسی کی اجازت دی ہے جو پشاور ضلع کے ایک گاؤں کا ہے''۔

***

اس کے بعد یہ تو حتمی بات ہے کہ مصری خان واپس بلوچستان آیا۔ مگر یہاں واپس آکر وہ ایک بہت ہی غیر معروف زندگی گزار کر فوت ہوگیا۔۔

ریفرنسز

1۔ Telegram From Bureu peshawar is AGG Bureu Quetta, (19 January 1922)

2۔ پرسٹس، ایم اے۔ ریوولیوشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔ 1937 پراگریس پبلشرز۔ ماسکو۔ صفحہ 73

3۔ Lenin. coll works. vol 30.1977.P.155

4۔ ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 از طرف: بیورو پشاور بہ طرف: اے۔ جی۔ جی بیورو کوئٹہ

5۔حوالہ ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 ازطرف: بیوروپشاور بہ طرف: اے جی جی بیوروکوئٹہ
6۔کوئٹہ سے انگریز افسر مسٹر ڈیونے 15 جنوری 1922 کو پشاور میں انگریز ملٹری انٹیلی جنس چیف کو لکھا
7۔ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 ازطرف: بیوروپشاور بہ طرف: اے جی جی بیوروکوئٹہ
8۔پرسٹس۔ایم اے۔ریوولیوشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔1973۔پراگریس پبلشرز ماسکو۔صفحہ 88
9۔پرسٹس۔ایم اے۔ریوولیوشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔1973۔پراگریس پبلشرز ماسکو۔صفحہ 57
10۔پرسٹس۔ایم اے۔ریوولیوشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔1973۔پراگریس پبلشرز ماسکو۔صفحہ 91
11۔پرسٹس۔ایم اے۔ریوولیشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔1973۔پراگریس پبلشرز ماسکو۔صفحہ 60
12۔پرسٹس۔ایم اے۔ریوولیشنریز آف انڈیا اِن سوویت رشیا۔1973۔پراگریس پبلشرز ماسکو۔صفحہ 127
13۔ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 ازطرف: بیوروپشاور بہ طرف: اے جی جی بیوروکوئٹہ
14۔ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 ازطرف: بیوروپشاور بہ طرف: اے جی جی بیوروکوئٹہ
15۔ٹیلیگرام 19 جنوری 1922 ازطرف: بیوروپشاور بہ طرف: اے جی جی بیوروکوئٹہ

ضمیمہ

The Red Thread of Honour

Sir Francis Hastings Doyle

Eleven men of England
A breastwork charged in vain;
Eleven men of England
Lie stripped, and gashed, and slain.
Slain, but of foes that guarded
Their rock-built fortress well,
Some twenty had been mastered,
When the last soldier fell.

Whilst Napier piloted his wondrous way
Across the sand-waves of the desert sea,
Then flashed at once, on each fierce clan, dismay,
Lord of their wild Truckee.

These missed the glen to which their steps were bent,
Mistook a mandate, from afar half-heard,
And, in that glorious error, calmly went
To death without a word.

The robber-chief mused deeply,
Above those daring dead;
" Bring here," at length he shouted,
" Bring, quick, the battle thread.
Let Eblis blast for ever
Their souls, if Allah will:
But we must keep unbroken
The old rules of the Hill.

" Before the Ghiznee tiger
Leapt forth to burn and slay;
Before the holy Prophet ؐ
Taught our grim tribes to pray;
Before Secunder's lances
Pierced through each Indian glen;
The mountain laws of honour
Were framed for fearless men.

" Still, when a chief dies bravely,
We bind with green one wrist

Have we not more to do?
" These were not stirred by anger,
Nor yet by lust made bold;
Renown they thought above them,
Nor did they look for gold.
To them their leader's signal
Was as the voice of God:
Unmoved and uncomplaining,
The path it showed they trod.
As, without sound or struggle,

The stars unhurrying march,
Where Allah's finger guides them,
Through yonder purple arch,
These Franks, sublimely silent,
Without a quickened breath,
Went, in the strength of duty,
Straight to their goal of death.

" If I were now to ask you
To name our bravest man,
Ye all at once would answer,
They called him Mehrab Khan.
He sleeps among his fathers,
Green for the brave, for heroes
O NE crimson thread we twist.
Say ye, oh gallant hillmen,
For these, whose life has fled,
Which is the fitting colour,
The green one or the red?"

" Our brethren, laid in honoured graves, may wear
Their green reward," each noble savage said:
" To these, whom hawks and hungry wolves shall tear,
Who dares deny the red?"

Thus conquering hate, and steadfast to the right,
Fresh from the heart that haughty verdict came;
Beneath a waning moon, each spectral height
Rolled back its loud acclaim.

Once more the chief gazed keenly
Down on those daring dead;
From his good sword their heart's blood
Crept to that crimson thread.
Once more he cried, " The judgment,
Good friends, is wise and true,
But though the red be given,

To the fiends' flaming den?"

Then all those gallant robbers
Shouted a stern " Amen!"
They raised the slaughtered sergeant,
They raised his mangled ten.

And when we found their bodies
Left bleaching in the wind,
Around BOTH wrists in glory
That crimson thread was twined.

Then Napier's knightly heart, touched to the core,
Rung, like an echo, to that knightly deed,
He bade its memory live for evermore,
That those who run may read.
A breastwork charged in vain;
Eleven men of England
Lie stripped, and gashed, and slain.
Slain, but of foes that guarded
Their rock-built fortress well,
Some twenty had been mastered,
When the last soldier fell.

Dear to our native land,
With the bright mark he bled for
Firm round his faithful hand.
The songs they sing of Roostum
Fill all the past with light;
If truth be in their music,
He was a noble knight.
But were those heroes living,
And strong for battle still,
Would Mehrab Khan or Roostum
Have climbed, like these, the Hill?"

And they replied, " Though Mehrab Khan was brave,
As chief, he chose himself what risks to run;
Prince Roostum lied, his forfeit life to save,
Which these have never done."

" Enough!" he shouted fiercely;
" Doomed though they be to hell,
Bind fast the crimson trophy
Round BOTH wrists — bind it well.
Who knows but that great Allah
May grudge such matchless men,
With none so decked in heaven,

Pierced through each Indian glen;
The mountain laws of honour
Were framed for fearless men.

" Still, when a chief dies bravely,
We bind with green one wrist
Green for the brave, for heroes
O NE crimson thread we twist.
Say ye, oh gallant hillmen,
For these, whose life has fled,
Which is the fitting colour,
The green one or the red?"

" Our brethren, laid in honoured graves, may wear
Their green reward," each noble savage said:
" To these, whom hawks and hungry wolves shall tear,
Who dares deny the red?"

Thus conquering hate, and steadfast to the right,
Fresh from the heart that haughty verdict came;
Beneath a waning moon, each spectral height
Rolled back its loud acclaim.

Once more the chief gazed keenly
Whilst Napier piloted his wondrous way
Across the sand-waves of the desert sea,
Then flashed at once, on each fierce clan, dismay,
Lord of their wild Truckee.

These missed the glen to which their steps were bent,
Mistook a mandate, from afar half-heard,
And, in that glorious error, calmly went
To death without a word.

The robber-chief mused deeply,
Above those daring dead;
" Bring here," at length he shouted,
" Bring, quick, the battle thread.
Let Eblis blast for ever
Their souls, if Allah will:
But we must keep unbroken
The old rules of the Hill.

" Before the Ghiznee tiger
Leapt forth to burn and slay;
Before the holy Prophet
Taught our grim tribes to pray;
Before Secunder's lances

Straight to their goal of death.

" If I were now to ask you
To name our bravest man,
Ye all at once would answer,
They called him Mehrab Khan.
He sleeps among his fathers,
Dear to our native land,
With the bright mark he bled for
Firm round his faithful hand.

The songs they sing of Roostum
Fill all the past with light;
If truth be in their music,
He was a noble knight.
But were those heroes living,
And strong for battle still,
Would Mehrab Khan or Roostum
Have climbed, like these, the Hill?"

And they replied, " Though Mehrab Khan was brave,
As chief, he chose himself what risks to run;
Prince Roostum lied, his forfeit life to save,
Which these have never done."

Down on those daring dead;
From his good sword their heart's blood
Crept to that crimson thread.
Once more he cried, " The judgment,
Good friends, is wise and true,
But though the red be given,
Have we not more to do?

" These were not stirred by anger,
Nor yet by lust made bold;
Renown they thought above them,
Nor did they look for gold.
To them their leader's signal
Was as the voice of God:
Unmoved and uncomplaining,
The path it showed they trod.

As, without sound or struggle,
The stars unhurrying march,
Where Allah's finger guides them,
Through yonder purple arch,
These Franks, sublimely silent,
Without a quickened breath,
Went, in the strength of duty,

" Enough!" he shouted fiercely;
" Doomed though they be to hell,
Bind fast the crimson trophy
Round BOTH wrists — bind it well.
Who knows but that great Allah
May grudge such matchless men,
With none so decked in heaven,
To the fiends' flaming den?"

Then all those gallant robbers
Shouted a stern " Amen!"
They raised the slaughtered sergeant,
They raised his mangled ten.

And when we found their bodies
Left bleaching in the wind,
Around BOTH wrists in glory
That crimson thread was twined.

Then Napier's knightly heart, touched to the core,
Rung, like an echo, to that knightly deed,
He bade its memory live for evermore,
That those who run may read.